غالب اور بدایوں

ڈاکٹر شمس بدایونی

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دھلی

غالب اور بدایوں

ڈاکٹر شمس بدایونی

غالب انسٹی ٹیوٹ
غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

GHALIB AUR BUDAUN (Urdu)

By :

Dr. Shams Budauni

ISBN - 81-8172-045-8

اہتمام	:	شاہد ماہلی
اشاعت	:	۲۰۱۰ء
قیمت	:	۲۵۰/روپے
مطبوعہ	:	اصیلا آفسیٹ پریس، دہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ،
ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔۲
www.ghalibinstitute.com -- email: ghalib@vsnl.net

غالب کے ایک ناقد و محقق

پروفیسر نذیر احمد مرحوم

کے نام

جن کی ترغیب پر میں نے غالب اور غالبیات کا از سر نو مطالعہ کیا

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سُبو میں ہے جیحوں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترتیب

عکس اور تصویریں

پیشِ گفتار

غالب اور غالبیات سے شغف رکھنے والوں کے لیے غالب کی ہر بات اور غالب سے متعلق ہر بات خواہ وہ عبارت میں ہو یا اشارت میں، بلاے جاں ہے:

بلاے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

یہی وجہ ہے کہ دنیاوی عیش و آرام تج کر وہ نئی نئی باتوں کی کھوج میں لگے رہتے ہیں اور آئے دن معلومات و حقائق اور افکار و بصائر میں اضافے کرتے رہتے ہیں۔

غور طلب ہے کہ شہروں، بستیوں اور علاقوں کی نسبت سے غالب پر متعدد کتب و مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ چند حسب ذیل ہیں:

کتب:

۱۔ غالب اور حیدر آباد	ضیاء الدین احمد شکیب	حیدر آباد	۱۹۶۹ء
۲۔ بھوپال اور غالب	عبدالقوی دسنوی	بھوپال	۱۹۶۹ء
۳۔ غالب کی دلی	سید ضمیر حسن دہلوی	دہلی	۱۹۷۷ء
۴۔ غالب اور بنگال	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	کلکتہ	۱۹۷۷ء
۵۔ بنگال میں غالب شناسی	ڈاکٹر کلیم سہسرامی	ڈھاکہ	۱۹۹۰ء
۶۔ باندہ اور غالب	صالحہ بیگم قریشی	باندہ	۱۹۹۴ء

مقالات:

۱۔ غالب کا کلکتہ	حمید احمد خاں	ماہ نو، کراچی، فروری ۱۹۵۰ء

۲۔غالب اور ٹونک　ع م جوہر ٹونکی　نگار، لکھنؤ، ستمبر 1951ء

۳۔غالب اور میرٹھ　شوکت سبزواری　نگار، لکھنؤ، مارچ/اپریل ۱۹۵۴ء

۴۔رامپور اور غالب　بیگم نور الصباح　اخبار جہاں، کراچی، ۲۶/فروری ۱۹۶۹ء

۵۔غالب اور مارہرہ　ڈاکٹر محمد ایوب قادری مشمولہ غالب اور عصر غالب، کراچی ۱۹۸۲ء

۶۔غالب اور علی گڑھ　کاظم علی خاں　غالب نامہ، دہلی، جنوری ۱۹۹۶ء

دراصل کسی بھی بستی، شہر یا علاقے سے غالب کی نسبت کی یکساں بنیادیں اور صورتیں نہیں ہوسکتیں اور یہ بنیادیں اور صورتیں بھی اسی علاقے کی تاریخ شعروادب کے حوالے سے دریافت کی جاسکتی ہیں۔ اب تک علاقوں کی نسبت سے جو کام بھی ہوئے ہیں ان میں عموماً اہم اور ممتاز پہلوؤں پر توجہ دی گئی اُن پہلوؤں تک رسائی کا ذریعہ ذخیرہ غالبیات کو بنایا گیا۔ علاقائی سطح پر تلاش وتحقیق کم کی گئی اور علاقائی ماخذ سے حسب دلخواہ استفادہ نہیں کیا گیا۔

گذشتہ چند سالوں سے غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی نے بھی اُن شہروں کی نسبت سے، جن سے غالب کا اپنی حیات میں ربط رہا، سیمنار کرائے ہیں۔ سیمنار بھی دہلی میں نہیں ان ہی شہروں میں منعقد ہوئے ہیں۔ مثلاً ''غالب اور آگرہ'' عنوان سے آگرہ میں (منعقدہ ۲۸، ۲۹/اپریل ۲۰۰۱ء) اور ''غالب اور رامپور'' عنوان سے (منعقدہ ۲۷/اپریل ۲۰۰۳ء) رامپور میں۔ لیکن یہ سیمنار بھی اُن بنیادوں، نسبتوں اور صورتوں کو دریافت کرنے اور اُن کو تاریخی تسلسل میں محفوظ کرنے میں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوسکے جو ایک ''شخص اور شہر'' کے درمیان تشکیل پاجاتی ہیں۔ وجہ یہ کہ اُن بنیادوں صورتوں اور نسبتوں کو اس وقت تک صحیح سیاق وسباق میں پیش کیا ہی نہیں جاسکتا جب تک متعلقہ شہر کی عمومی شعری وادبی تاریخ اور اکابرورجال پر کماحقہ نظر نہ ہو اور غالب اور غالبیات کے ذخیرے تک ممکنہ حد تک رسائی نہ ہو۔

موضوع ''غالب اور بدایوں'' عرصہ دراز سے مجھے بھی دعوتِ تحریر دے رہا تھا، لیکن مواد منتشر تھا، جس کو تاریخی تسلسل میں مرتب کرنے، اس میں پیش کردہ معلومات کی تنقیح

کرنے، اس کا محاسبہ و محاکمہ اور نقد و تبصرہ کرنے کے دقت طلب کام کی وجہ سے تاخیر ہوتی رہی۔ اس سے قبل اس موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا جو میرے مجموعہ مضامین ''دید و دریافت'' (دہلی ۱۹۸۱ء) میں شامل ہے۔ مگر آج ۲۳ سال بعد وہ تشنہ محسوس ہوتا ہے۔ تاہم یہ سمجھ کر کہ غالب کا بدایوں سے گہرا تعلق ہے اور غالب نے بدایوں کی ادبی زندگی پر بھی اثرات چھوڑے، اس موضوع پر باردگر قلم اٹھانا پڑا۔

راقم الحروف نے اس کتاب میں بدایوں سے غالب کی نسبت کی ہر صورت اور غالبیات کے واسطے سے جملہ شکلوں کو تاریخی تسلسل اور تالیفی نظم و ترتیب کے ساتھ محفوظ کرنے کی سعی کی ہے۔ ایک طرف ارباب بدایوں کو غالب کے یہاں تلاش کیا ہے تو دوسری جانب غالب کو بھی مقامی شعری و ادبی تاریخ میں کھوجنے کی کوشش کی ہے۔ گویا کہیں بدایوں کو غالب کے حوالے سے جاننے کی کوشش کی ہے اور کہیں بدایوں کے حوالے سے غالب تک رسائی کے راستے تلاش کیے ہیں۔

امید ہے کہ یہ کتاب جہاں غالب اور بدایوں کی تاریخی و ادبی اہمیت کی تفہیم میں مدد دے گی وہیں غالب اور متعلقاتِ غالب پر ماہرین غالبیات کے پیش کردہ کارِ تحقیق کو بھی سہارا دے گی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اس بات کی تصدیق بھی ہو سکے گی کہ غالب اور غالبیات کے ضمن میں جو تحقیق ہو چکی ہے، وہ اپنی تمام تر زیرکی اور دیدہ سوزی کے باوجود ابھی قولِ فیصل اور حرفِ آخر نہیں ہے۔

کتاب کو قارئین کی سہولت کے لیے سات ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ ہر باب کے ضمنی عنوانات بھی ہیں۔ آخر میں اشاریہ دیا گیا ہے۔

مقامات سے نسبت دے کر غالب پر کتاب مرتب کرنے کی ایک معیاری صورت کیا ہو سکتی ہے، مواد ترتیب اور طریقِ پیشکش کے لحاظ سے اس کتاب کو اسی نہج پر تالیف کیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ اُن دیگر شہروں کے لیے بھی نمونہ بن سکتی ہے جہاں غالب کے تلامذہ یا مکتوب الیہ تھے اور جہاں غالب پسندی کا رواج تھا۔

اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں جن بزرگوں اور دوستوں سے تعاون ملا ان کا

شکریہ ادا نہ کرنا بددیانتی ہوگی۔ بزرگوں میں پروفیسر نذیر احمد، ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب، پروفیسر حنیف نقوی کا خاص طور پر ممنون ہوں۔ پروفیسر نذیر احمد نے تقریباً تیس صفحات پر مشتمل مقالے ''غالب اور بدایوں'' (جو ''غالب نامہ'' دہلی میں اشاعت کی غرض سے لکھا گیا تھا) کو کتابی شکل دینے کا مشورہ دیا اور جب کبھی ملاقات ہوئی تو اس کے بارے میں استفسار کرتے رہے اور اس کو مکمل کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کی بزرگانہ حیثیت میرے لیے ایک سائبان کی سی ہے۔ میرے اندر سنجیدگی سے کام کرنے کا جذبہ، نام ونمود سے بے پروائی، خالص علمی نقطۂ نظر اختیار کرنے کا عملی احساس انہی کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ میرے ہر ادبی کام میں ان کا مشورہ اور تعاون شامل رہتا ہے۔

سید حنیف نقوی (بنارس) میرے ہم وطن ہیں۔ وہ میری اکثر تحریروں پر مجھے مناسب مشورے دیتے رہے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب کے دوران بھی میں نے انہیں بارہا زحمت دی اور انہوں نے متعلقہ استفسار کے جواب مرحمت فرمائے۔ ان کی اس علم دوستی کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔

دوستوں میں ڈاکٹر حیات عامر (ریڈر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی)، ڈاکٹر شعائر اللہ خاں (رامپور) اور تسلیم اللہ غوری (بدایوں) نے بعض اہم ماخذ فراہم کیے۔ خصوصاً تسلیم غوری نے اپنے ذاتی ذخیرہ کتب سے حکیم غلام نجف خاں (تلمیذ غالب) کے سلسلے میں بعض دستاویزات برائے مطالعہ مہیا کیں اور شعرائے بدایوں سے متعلق بعض دوسری معلومات فراہم کرنے میں بھی مدد دی۔ میں ان حضرات کا بھی شکر گزار ہوں۔

اس کتاب کی اشاعت ممکن نہیں تھی اگر غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے ڈائرکٹر جناب شاہد ماہلی دستِ تعاون دراز نہ کرتے۔ انہوں نے اس کتاب کی اہمیت اور قدر و قیمت کو سمجھا اور اس کی اشاعت کی تمام تر ذمہ داری اٹھائی۔ اس کے لیے میں ان کا صدقِ دل سے احسان مند ہوں۔

بریلی ۲ر فروری ۲۰۰۴ء

شمس بدایونی

تصریح

پیش نظر کتاب جنوری ۲۰۰۴ء میں مکمل ہوگئی تھی، لیکن بوجوہ اس کی اشاعت التوا میں رہی۔ جنوری ۲۰۰۴ء سے دسمبر ۲۰۰۹ء کے مابین فاصلے کا احساس کم کرنے کے لیے کہیں کہیں عبارت میں معمولی تبدیلی کی گئی ہے۔ بعض سنین وفات کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اس دوران بدایوں کے اہل قلم کی غالب سے متعلق جن نئے مضامین اور کتب کی اشاعت عمل میں آئی ہے، اشاریہ میں معلوم مضامین و کتب کا اضافہ کر دیا ہے۔ لیکن یہ مطبوعہ کاوشیں میری نجی مصروفیات کے سبب مطالعے کا محور بن کر مسودے میں کسی بڑے اضافے کا موجب نہیں بن سکی ہیں۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

بزرگ ادیب پروفیسر نذیر احمد (وفات: ۱۹؍ اکتوبر ۲۰۰۸ء) کی شفقت مجھے میسر تھی۔ انھی کے ایما پر یہ کام شروع کیا تھا، آج جب کہ کتاب اشاعت کے مراحل طے کر رہی ہے، ان کی بہت یاد آرہی ہے۔ خدا انھیں اپنی رحمتوں سے ڈھانپ دے۔

۱۵؍جنوری ۲۰۱۰ء

شمس بدایونی

باب اول

بدایوں اور عہد غالب
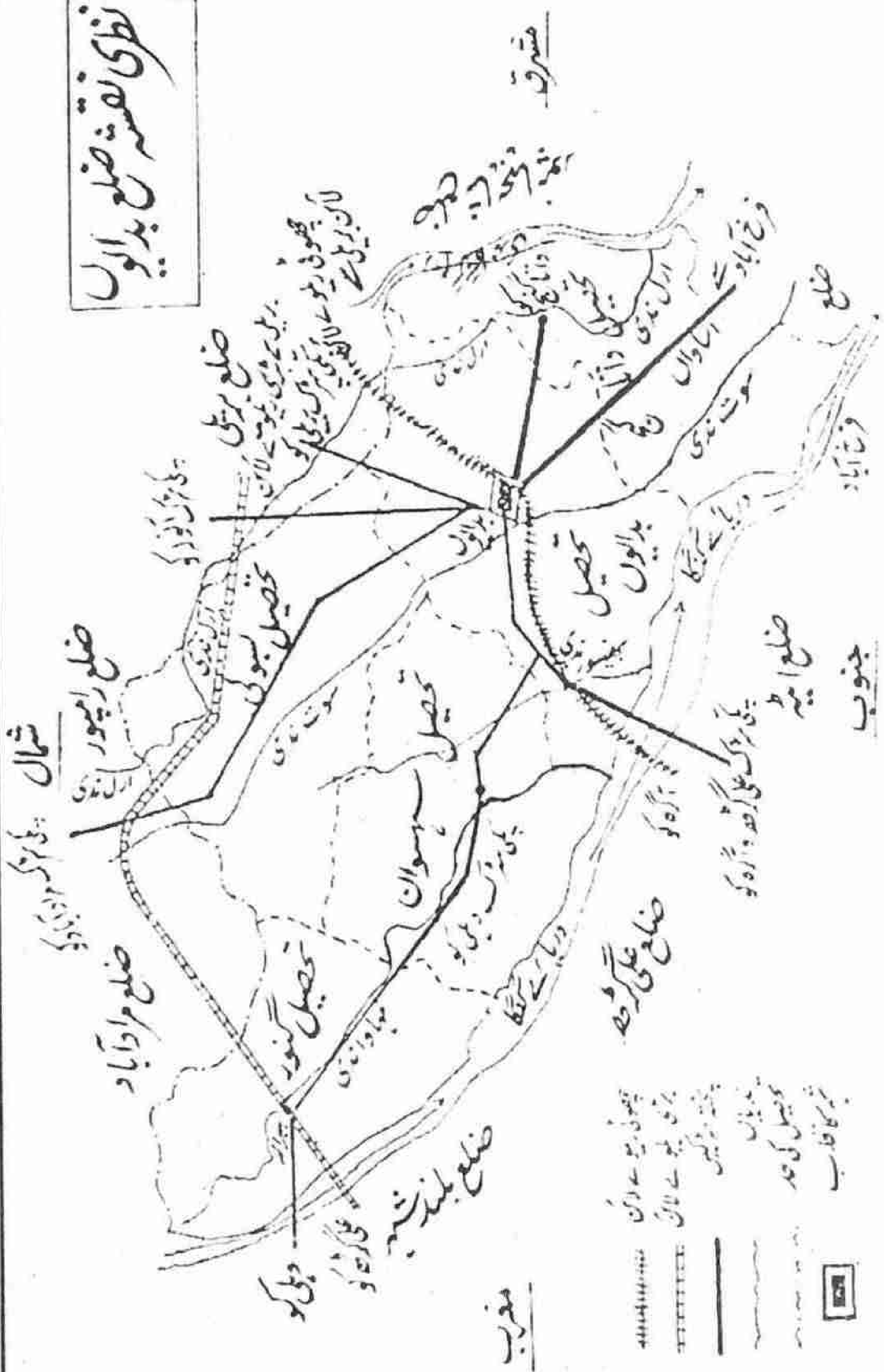
عکس نظری نقشہ، ضلع بدایوں

بدایوں کی تاریخی و ادبی اہمیت

بدایوں شمالی ہند کا ایک قدیم شہر ہے۔ یہ اپنی قدامت، علمی و تہذیبی روایت اور مسلم عہد حکومت میں ایک انتظامی اکائی ہونے کے سبب خاص تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔

ضلع بدایوں (روہیل کھنڈ کمشنری، اتر پردیش) گنگا اور رام گنگا، دو مشہور ندیوں کے درمیان وسیع میدان میں آباد ہے۔ اس کے شمال میں مراد آباد، رامپور؛ شمال مشرق میں بریلی؛ جنوب مشرق میں شاہجہاںپور اور جانب جنوب فرخ آباد، مین پوری نیز مغرب میں علی گڑھ اور بلند شہر اضلاع ہیں۔ ضلع کا موجودہ رقبہ ۵۱۵۸ مربع کلومیٹر ہے اور ضلع کی موجودہ آبادی ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۹،۶۷،۹۵۱ ہے۔ (سرل بھوگول، ضلع بدایوں، ص ۲۸)

بدایوں کی قدامت کے متعلق مؤرخین کی تحقیقات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ہزار قبل مسیح آباد تھا۔ یہاں دروپد راج کرتے تھے اور یہ علاقہ "پانچال" کے نام سے مشہور تھا۔ بعد میں اس علاقہ کا نام کٹھیر (صحیح تلفظ کٹے ہر) پڑ گیا۔ قوموں اور حکمرانوں کے عروج و زوال کے ساتھ اس کی شہری حیثیت بھی بنتی بگڑتی رہی اور الگ الگ ادوار میں، مختلف ناموں ویداموتھ، بدھ مئو، بیدامئو، بداؤن لکا، بداؤں اور آخر میں

بدایوں کے نام سے موسوم ہوا۔عہد قدیم میں بدایوں موریہ، شنگ، ساتواہن، پال اور تومڑ وغیرہ خاندان کے زیر اقتدار رہا۔عہد غزنوی (۹۹۷ء۔ ۱۰۳۰ء) میں بدایوں پانچال کے راجہ کے زیر فرمان تھا۔اس وقت ''اہی چھیتر'' (رام نگر آنولہ) کی مرکزی حیثیت مائل بہ زوال تھی۔ رفتہ رفتہ اہی چھیتر (अहिच्छत्रा) کے بجائے بدایوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ ۴۰۵ھ/ ۱۰۱۴ء میں راشٹر کوٹی خاندان کا راجہ مدن پال یہاں کا حکمراں تھااور وہ محمود غزنوی (ف ۱۰۳۰ء) کا ہم عصر تھا۔ اسی کے عہد میں مسلمان بدایوں میں آکر آباد ہوئے۔ (تذکرۃ الواصلین،ص:۶) فتح دہلی ۱۱۹۲ء سے قبل سرزمین ہند کی جن بستیوں کو اولیاء اللہ کے مقدس نفوس اپنی ضیاباریوں سے منور کررہے تھے، ان میں بہرائچ، قنوج، اجمیر اور ناگور کے ساتھ ایک نام بدایوں کا بھی ہے اس حقیقت کا ثبوت حضرت مُلہم شہیدؒ (ف ۴۰۹ھ/ ۱۰۱۸ء) حضرت علی شہیدؒ (ف۴۰۹/ ۱۰۱۸ء) حضرت ضیاء الدین مکیؒ (ف۴۰۹ھ/ ۱۰۱۸ء) کے مزارات ہیں جو محمد غوری (ف۱۲۰۶ء) کی آمد سے قبل بدایوں میں مسلمانوں کی آمد کا ثبوت دیتے ہیں۔ (تاریخی مقالات ص:۴۱)

مؤرخین بدایوں کے مطابق ۴۲۱ھ/ ۱۰۳۰ء میں حضرت سالار مسعود غازی (ف ۱۰۳۴ء) بدایوں پر حملہ آور ہوئے۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی علوم وفنون کی روشنی بدایوں کی سرزمین پر بھی پڑنے لگی اور وہ اس طرح کہ بعض مسلم خاندان و قبائل خانقاہوں، مدرسوں، اور مسجدوں کی تعمیر و تشکیل کا کام انجام دینے لگے۔عہد غزنوی کی بدایوں کے جانب شرق مائل بہ شمال بہ مقام سورج کُنڈ ایک مسجد کا پتا چلتا ہے جو عہد عالمگیری تک موجود تھی۔ (اکمل التاریخ ج/۱،ص:۲۷)

۵۹۹ھ/ ۱۲۰۲ء میں قطب الدین ایبک (ف ۱۲۱۰ء) نے قلعہ بدایوں فتح کیا (تاریخ فرشتہ ج/۱،ص:۲۷) اور وہ تقریباً یہاں ایک سال قیام پذیر رہا تاکہ راجپوتوں کی حکومت کا مکمل خاتمہ کرکے اس علاقے پر اپنا مکمل اقتدار قائم کرسکے۔ اس کے دوران قیام (۱۲۰۲ء۔ ۱۲۰۳ء) ایک مسجد اور ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی۔ مسجد'' جامع

قطبی'' اور مدرسہ ''مدرسہِ مُعزیہ'' کے نام سے تاریخوں میں مذکور ہوا ہے۔ (تذکرۃ الواصلین، ص: ۹۲، بدایوں۔ قدیم و جدید، ص: ۱۵۱) 'فوائد الفواد' میں مدرسہ کے ایک استاد خواجہ زین الدین کا تذکرہ آیا ہے۔

محمد غوری ہی کے عہد فتوحات میں شمس الدین التتمش (ف ۱۲۳۶ء) ۶۰۰ھ / ۱۲۰۴ء میں بدایوں کا گورنر بنا۔ (تاریخ فرشتہ ج ۱ / ص: ۲۴۹) التتمش کے عہد گورنری ۱۲۰۴ء تا ۱۲۱۴ء میں بدایوں علم و ادب کا مرکز بن گیا۔ اُس نے ۱۲۰۹ء میں ایک وسیع عیدگاہ تعمیر کرائی اور ۱۲۱۰ء میں جامع مسجد شمسی کی بنیاد رکھی۔ (بدایوں ضلع کا ہست وبود۔ ص ۲۴۳) التتمش کے عہد میں بڑے بڑے صاحب کمال عرب و یمن و دیگر بلاد وامصار سے یہاں آئے اور متوطن ہوگئے۔ زمانہِ قدیم کا بیدامئو اب 'مدینۃ الاولیاء' 'قبۃ الاسلام' اور 'پیراں شہر' کے نام سے مشہور ہوا۔

سلطان التتمش کے بعد بھی خلجی (۱۲۹۰ء۔ ۱۳۲۱ء)، تغلق (۱۳۲۱ء۔ ۱۴۱۴ء)، سید (۱۴۱۴ء۔ ۱۴۵۱ء)، لودھی (۱۴۵۱ء۔ ۱۵۲۶ء) اور مغل بادشاہوں کے عہد (۱۵۲۶ء۔ ۱۸۵۷ء) تک بدایوں مسلم حکومت کا ایک صوبہ رہا۔ جس کا گورنر عامل کہلاتا تھا۔ جس کا تقرر تخت دہلی کی طرف سے کیا جاتا تھا۔ (واقعات ہند ص: ۵۷ تا ۷۵)۔ شہنشاہ عالم گیر کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد جب مغل سلطنت میں ضعف آیا تو روہیلہ پٹھانوں نے اس علاقے میں قدم جمالیے۔ اور روہیل کھنڈ کا علاقہ ایک خودمختار ریاست کی شکل میں تاریخ کے صفحات پر ابھرا۔ ۱۷۷۴ء میں نواب اودھ شجاع الدولہ بدایوں پر قابض ہوا۔ (کنز التاریخ، ص: ۲۶۸ تا ۲۹۹) ۱۷۷۴ء سے ۱۸۰۱ء تک یہ علاقہ نوابانِ اودھ کے زیر فرمان رہا۔ ۱۲ / نومبر ۱۸۰۱ء کو نواب اودھ نے اسے انگریزوں کے سپرد کردیا۔ انگریزوں نے بدایوں کی صوبائی حیثیت ختم کرکے اسے ضلع کی شکل دی۔ ابتدا میں سہسوان ضلع بنا بعد کو بدایوں کو ضلع کی حیثیت دی گئی اور وہاں کا حاکم کلکٹر کہلایا۔ ۱۸۰۱ء سے ۱۹۴۷ء تک بدایوں ان کلکٹروں کے زیر انتظام رہا۔ تا آنکہ ۱۵ / اگست

۱۹۴۷ء کو بدایوں میں بھی آزادی کا جھنڈا لہرا دیا گیا۔

بدایوں کی بسیط تاریخ کو، جو اپنے جلو میں بعض خاص تاریخی واقعات، بعض حکمرانوں کی تقدیریں[1] بعض مقدس نفوس کی علمی و تبلیغی کوششیں، شعرا و ادبا کے تصنیفی کارنامے اور قدیم آثار و کتبات کا ایک بڑا ذخیرہ رکھتی ہے[2]، صفحے دو صفحے میں پیش کرنا مشکل ہے۔ غالب کی بھی اس تاریخی اور علم خیز شہر سے تعلق و نسبت کی متعدد پختہ بنیادیں ہیں۔ لہٰذا اس شہر کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کی ادبی اہمیت و حیثیت پر بھی تعارفی نوٹ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اسلامی ہند کے دورِ اوّل سے مغلوں کے عہد شباب تک بزرگانِ دین کی ایک بڑی جماعت بدایوں میں متوطن نظر آتی ہے۔ اس دور کے جتنے بھی تصنیفی، تالیفی و شعری کارنامے ہیں وہ انہی بزرگوں کے ہیں۔ معروف اسماء صاحبِ مشارق الانوار، مولانا رضی الدین حسن صغانی (ف ۱۲۵۲ء) اور خواجہ نظام الدین اولیاء (ف ۱۳۲۴ء) کے ہیں۔ اس جماعت میں شیخ شہاب الدین مہمرہ (ف ۱۲۸۷ء)، امیر حسن سجزیؒ

۱؎ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

بدایوں کی گورنری ایک ایسا امتیاز تھا جو سلطنت کے ممتاز ترین اور اہم ترین اشخاص کو دیا جاتا تھا... بدایوں کی گورنری تختِ دہلی کے لیے پہلی سیڑھی تھی۔ ایلتمش، رکن الدین وغیرہم اس علاقے میں یہ خدمت انجام دے چکے تھے۔ (تاریخی مقالات، ص: ۴۲)

۲؎ شمالی ہند میں گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کے وسط میں ابھرنے والی زبان لسانیات کی اصطلاح میں Pre Urdu کہلاتی ہے۔ اس 'پری اردو' کا ایک نمونہ بدایوں میں بھی دستیاب ہوا۔ حضرت شاہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (ف ۱۳۵۶ء) سے منقول ہے کہ جب مولانا علاء الدین اصولی (ف ۶۶۲ھ/ ۱۲۶۴ء) نے حضرت خواجہ علی مولا بزرگ (ف ۶۴۷ھ/ ۱۲۴۹ء) کے دستِ مبارک سے حضرت نظام الدین اولیا (ف ۱۳۲۴ء) کے سر پر دستار بندھوائی تو اس وقت مولانا علی بزرگ نے بہ زبانِ ہندوی کہا: ''ارے مولانا! یہ بڑا ہوسی'' یعنی یہ بزرگ ہوگا۔ مولانا اصولی کے استفسار پر مزید فرمایا کہ ''جو منڈاسا باندھے سو پائن پسرے'' یعنی جو دستار باندھ رہا ہے وہ اس کے پاؤں پڑ رہا ہے۔ یہ اردو کے اولین جملوں میں سے ہے۔ (خیر المجالس، ص: ۱۹۱)

(ف ۱۳۳۷ء)، شیخ ضیاء الدین نخشبیؒ (ف ۱۳۵۰ء) فارسی کے ممتاز شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ اکبراعظم (ف ۱۶۰۵ء) کے عہد کے ممتاز شعرا میں جمال الدین خاں ناصحیؔ (ف ۱۵۶۱ء)، شمس الدین خاں جھجار زاہدؔ (ف ۱۵۸۲ء)، ملا عبدالقادر، قادرؔ، البدایونی (ف ۱۵۹۵ء) کے نام اہم ہیں۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز کے ساتھ ہی بدایوں بھی اردو شاعری سے روشناس ہوا۔ اٹھارہویں صدی کے شعرائے بدایوں کے متعدد نام اردو تذکروں میں ملتے ہیں۔ عبدالحئی تاباںؔ (ف ۱۷۴۹ء)، معین الدین معینؔ (ف ۱۷۶۰ء)، شاہ محمدی بیدارؔ (ف ۱۷۹۶ء)، اکرام اللہ محشرؔ (ف ۱۸۰۵ء)، نواب ظہوراللہ خاں نواؔ (ف ۱۸۳۰ء) کے نام معروف ہیں۔

انیسویں صدی میں بدایوں میں باقاعدہ شعروادب کی بساط سی بچھ گئی۔ شعرائے بدایوں نے اساتذۂ دہلی و لکھنؤ سے سلسلۂ تلمذ قائم کیا۔ دہلوی اساتذہ میں ذوقؔ، غالبؔ، معروفؔ، عارفؔ، راسخؔ، ظہیرؔ، داغؔ، حالیؔ اور شیفتہؔ وغیرہم اور لکھنوی اساتذہ میں آتشؔ، افضلؔ، تسلیمؔ، امیرؔ، جلالؔ، فراقؔ وغیرہم سے استفاضہ واستفادہ کیا۔ اس طرح بدایوں میں دہلی اور لکھنؤ دونوں کے لہجے اور شعری اسالیب طرز اظہار و بیان مقبول و مروّج ہوا، لیکن بدایوں کے شعری ماحول پر لکھنؤ کے مقابلے دہلی اسکول کا اثر غالب رہا۔ ذوقؔ، غالبؔ، ظہیرؔ، داغؔ اور احسنؔ مارہروی کے تلامذہ نے اس رنگ کو یہاں پروان چڑھایا۔ اور یہ سلسلہ ابرؔ احسنی (ف ۱۹۷۳ء) اور جامیؔ بدایونی (ف ۱۹۶۵ء) کے تلامذہ کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔

انیسویں صدی کے آخری چار دہے اور بیسویں صدی کے ابتدائی تین دہے بقول شخصے بدایوں کے لیے کافی ''شاعر خیز اور شعرانگیز'' تھے۔ یہ شعری تسلّط کا زمانہ تھا۔ چنانچہ شعرا کی ایک بڑی تعداد بدایوں کے ادبی ماحول پر سایہ فگن نظر آتی ہے۔ چند ممتاز نام حسبِ ذیل ہیں:

عبدالحیٔ بیخود بدایونی (ف ۱۹۱۲ء)، مولوی انصار حسین زلالیؔ (ف ۱۹۲۵ء)، علی احمد خاں اسیرؔ (ف ۱۹۲۷ء)، رفیع احمد عالی (ف ۱۹۳۴ء)، تولا حسین تولا (ف ۱۹۳۶ء)، شوکت علی خاں فانی (ف ۱۹۴۱ء)، قمرالحسن قمرؔ (ف ۱۹۴۱ء)، نجم الدین احمد ثاقبؔ (ف ۱۹۴۵ء)۔

اس شعری تسلط کے باوصف علمی رجحان بھی مفقود نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ صاحب ''معیارالبلاغت''، منشی دیبی پرشاد سحرؔ (ف ۱۹۰۲ء) صاحب تذکرۂ 'شمیم سخن' عبدالحیٔ صفاؔ (ف ۱۹۱۴ء) صاحب 'کنزالتاریخ' رضی الدین بسملؔ (ف ۱۹۲۵ء) صاحب 'تنقید لسان الغیب' ابوالحسن صدیقی (ف ۱۹۲۸ء) صاحب 'مسئلہ علم مسلم مفکرین کی نظر میں' مولانا یعقوب بخش راغبؔ (ف ۱۹۲۹ء) صاحب 'مضامین میر محفوظ علی'، میر محفوظ علی (ف ۱۹۴۳ء)، صاحب 'قاموس المشاہیر' نظام الدین حسین نظامی بدایونی (ف ۱۹۴۷ء) وغیرہ اس علمی و ادبی رجحان کی ایک علامت قرار دیے جاسکتے ہیں۔

بیسویں صدی نثر کی صدی قرار دی گئی۔ اس صدی کے آخری چھ دہوں میں سرزمین بدایوں سے کئی قابلِ ذکر نام منظر عام پر آئے جن میں سے دو ایک نے دانشوری کی سطح کو چھولیا۔ مثلاً سلطان حیدر جوش (ف ۱۹۵۴ء)، پروفیسر ضیاء احمد (ف ۱۹۷۳ء)، ابوالفضل صدیقی (ف ۱۹۸۳ء)، اختر انصاری (ف ۱۹۸۸ء)، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (ف ۱۹۹۴ء)، پروفیسر آل احمد سرور (ف ۲۰۰۲ء)، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (ف ۲۰۰۳ء)، پروفیسر ابراہیم خلیل (مرحوم) کے نام پیش کیے جاسکتے ہیں۔ شعرا میں بھی یہ چند نام قابل ذکر ہیں— ضیاء القادری (ف ۱۹۷۰ء)، شکیل احمد شکیل (ف ۱۹۷۰ء)، ابر احسنی (ف ۱۹۷۳ء)، عروج زیدی (ف ۱۹۸۷ء)، اظہر کمالی (ف ۱۹۹۱ء)، فاروق احمد محشر (ف ۱۹۹۴ء)، انجم فوقی (ف ۱۹۹۵ء)، دلاور فگار (ف ۱۹۹۸ء)، اسعد بدایونی (ف ۲۰۰۳ء)، عرفان صدیقی (ف ۲۰۰۴)۔ اس سرزمین کے جن ادبی فرزندوں کا

سفر ابھی جاری ہے۔ ان میں ڈاکٹر حنیف نقوی (بنارس)، جیلانی بانو، عبداللہ ولی بخش قادری، ویریندر پرشاد سکسینہ، ڈاکٹر اسد اریب، ادا جعفری (کراچی)، زہرہ نگاہ (کراچی) وغیرہ کے نام ممتاز ہیں، جن کے نثری و شعری کارناموں سے بدایوں کی عظمتِ رفتہ کے نقوش ابھی معدوم نہیں ہوئے ہیں۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟ ✦ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی

کیمرے سے لی گئی مرزا کی اولین تصویر۔ ۱۸۶۷ء

(ماخذ: دیوان غالب، نظامی ایڈیشن، طبع سوم ۱۹۲۰ء)

عہد غالب کا بدایوں — ایک منظر نامہ

بدایوں کی تاریخی عظمت واہمیت کے مختصر تعارف کے بعد غالب اور بدایوں کے تعلق سے یہ جاننا ضروری ہوجاتا ہے کہ بدایوں اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کے لحاظ سے گرچہ غالب کے مولد اکبرآباد اور مسکن و مدفن دہلی کے وسط میں نہیں تھا، لیکن غالب سے بہت پہلے سیاحِ معرفت حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء (ف ۱۳۲۴ء) نے دہلی اور بدایوں کی منزلوں کو ملادیا تھا۔ اسلامی علم وفضل اور معرفت وطریقت کے موکب کی یہ بھی ایک منزل تھی۔

عہد غالب میں بدایوں قدیم نام بَداؤں (BADA,OON) کے نام سے موسوم تھا۔ لیکن منشی نبی بخش حقیرؔ کے نام غالب کے دو خطوط (خط نمبر ۲، ۹ مارچ ۱۸۴۸ء، نمبر ۱۸، ۱۹/نومبر ۱۸۵۲ء) میں جہاں بدایوں کا نام آیا ہے وہ انگریزی میں گزٹ کیے گئے تلفظ Budaun (بدایوں) کے مطابق ہے[1] غالباً یہ جدید طرزِ کتابت کا کرشمہ ہے۔

---

[1] یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ انگریزوں نے بُدایوں کا تلفظ بُدایوں (ب پر ضمہ کے ساتھ) کیا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ انگریز ہندوستانی ناموں میں زبر کی جگہ انگریزی حرف یو (U) کا استعمال کرتے تھے۔ بدایوں کی طرح پنجاب، لکھنؤ، کرنول، کلکتہ وغیرہ میں بھی حرف (U) کا استعمال دراصل فتحہ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ بہت نازک نکتہ ہے جسے سمجھے بغیر اکثر دستاویزات میں درج غیر معروف ناموں کا تلفظ کچھ سے کچھ ہوگیا ہے۔

ایک فارسی خط بنام میر تفضّل حسین خاں خیر آبادی میں قاضی فصیح الدین کے نام کے ساتھ وطنی نسبت کے طور پر ''بداونی'' لکھا ہے۔ (باغ دو در ص ۱۴۵) اس سے پتا چلتا ہے کہ غالب اس شہر کا تلفظ بداؤں کرتے اور بداؤں ہی لکھتے تھے۔

عہد غالب میں بدایوں علم وادب کے میدان میں کس مقام پر استادہ تھا، اس سلسلے میں ظفر حسن بدایونی کا حسب ذیل اقتباس شہر کے ادبی مزاج و گفتار پر کچھ کچھ روشنی ڈالتا ہے:

> ''میرے والد ماجد مولوی مظہر حسین صدر اعلیٰ بدایوں مرحوم و مغفور جو خود ایک فاضلِ جلیل تھے، فرماتے تھے کہ جب ہم نوعمر تھے تو شہر (بدایوں) کے اصحاب جُبّہ و دستار کو دیکھتے تھے، ابونواس اور متنبّی کے اشعار پر بحث و مذاکرہ کررہے ہیں۔ جوانی کے زمانے میں وہ چرچے تو سننے میں نہ آئے البتہ عرفی و نظیری کے مباحث رونق بزم ادب کا ذریعہ بن گئے۔ آخری دور میں یہ باتیں خواب و خیال ہوگئیں۔ ہاں داغؔ و امیرؔ کے تذکرے سرمایہ آرائشِ محفل رہ گئے۔''

(لمعات، ص: ۲، بحوالہ تذکرہ شعراے بدایوں ج ۱، ص ۱۷)

تاریخ بدایوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ عہدِ غالب کا بدایوں، تعلیم و تعلّم، تصنیف و تالیف، رشد و ہدایت اور شعر وادب کے مشاغل سے جُڑا ہوا تھا۔ سیاسی انحطاط و انتشار کے باوجود یہاں کی علمی زندگی پر زوال کے آثار نظر نہیں آتے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ بدایوں کی تہذیبی و علمی زندگی پر علما کی گرفت مضبوط تھی۔ اگر ملکی سطح پر دیکھیں تو ان علماے بدایوں کی سوچ میں ذہنی بالیدگی اور فکری توانائی کا عنصر نظر نہیں آتا۔ روایت اُن کے نزدیک حقیقت اور قدامت ہی ان کے لیے قدر اعلی تھی۔ بقول سید سلیمان ندوی:

> ''تیسرا فریق وہ تھا جو شدّت کے ساتھ اپنی قدیم روِش پر قائم رہا اور اپنے کو اہل السنّہ کہتا رہا۔ اس گروہ کے پیشوا زیادہ تر بریلی اور

بدایوں کے علما تھے۔" (مقدمہ حیات شبلی، ص:۴۶)

اس قدامت پسندی کے باوجود پروفیسر آل احمد سرور کے الفاظ میں:

"یہ دنیا ایک تہذیبی ماحول، ایک ادبی ذوق اور ایک علمی نظر رکھتی تھی۔ جو محدود ہوتے ہوئے بھی لائق احترام اور قابلِ قدر تھی۔"

(کلیات ضیاء، ص:۷۸)

شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی (ف ۱۷۶۲ء) کے خانوادے سے تلمذ رکھنے اور سند حاصل کرنے والے متعدد علما یہاں درس و افتاء میں مشغول تھے۔ علماء کے گھر ہی ان کے مدرسے تھے۔ بعض علماء نے باقاعدہ خانقاہوں میں بیٹھ کر رشد وہدایت کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ ان علماء کی تصنیف و تالیف کے موضوعات بیشتر کلامی، فقہی، درسی شروح، تصوف اور مختلف مذاہب کا ردّ وابطال تھے۔ عیسائیوں، آریہ سماجیوں، قادیانیوں، شیعوں اور اہل حدیث سے تحریری وتقریری مناظرے اس علمی زندگی کا حصہ تھے۔ یہ مناظرے قیل و قال، طنز و تعریض، سب وشتم، تعصب و تنگ نظری اور سوے تعبیر کے سبب آج بے اثر معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُس دور کی علمی چہل پہل کا یہ بھی ایک سبب ہوا کرتے تھے۔

شاہ اسمٰعیل شہید (ف ۱۸۳۱ء) کی توحید خالص اور اصلاحِ رسوم و بدعات سے متعلق تالیفات و تقاریر نے کئی علمی مسائل کھڑے کردیے۔ "مسئلہ امکان نظیر و امتناع نظیر" اُس دور کا سب سے اہم اور سرگرم علمی[1] مسئلہ قرار پایا۔ اور اس پر بحثیں شروع

---

[1] یہ مسئلہ کلامی اور منطقی تھا۔ اس کے دلائل و براہین اس درجہ غامض و مشکل تھے کہ علما کو پسینہ آجائے لیکن بدقسمتی سے یہ مدارس کی علمی چہاردیواری سے نکل کر واعظین اور مقررین کے ذریعے عوام تک پہنچ گیا۔

اس غامض مسئلے کو مولانا حالی نے صرف چار سطروں میں کس خوبصورتی سے پیش کردیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اس مسئلہ میں مولانا اسمٰعیل شہید کی یہ رائے تھے کہ خاتم النبیین کا مثل ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے، ممتنع بالذات نہیں ہے۔ یعنی آنحضرت کا مثل اس لیے پیدا نہیں ہوسکتا کہ اس کا پیدا ہونا آپ کی خاتمیت کے منافی ہے؛ نہ اس لیے کہ خدا اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ برخلاف اس کے مولانا فضل حق کی یہ رائے تھی کہ خاتم النبیین کا مثل ممتنع بالذات ہے اور جس طرح خدا اپنا مثل پیدا نہیں کرسکتا اسی طرح خاتم النبیین کا مثل بھی پیدا نہیں کرسکتا۔" (یادگار غالب، ص:۷۹)

ہوگئیں۔ شاہ محمد اسحٰق دہلوی (ف ۱۸۴۶ء) ان کے تلامذہ اور مسترشدین شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے نظریات کے حامی و مبلغ تھے۔ جبکہ مولوی محبوب علی دہلوی (ف ۱۸۵۴ء) اور مولانا فضل حق خیرآبادی (ف ۱۸۶۱ء) ان نظریات کے مخالف و منکر تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب کے نظریات کے ردّ وابطال کا آغاز کیا۔ اس مخالفت کو مولانا فضل حق خیرآبادی کے اُس مختصر رسالے 'امتناع النظیر' (۱۸۲۵ء) سے علمی اختلاف کا جواز مل گیا جس میں تقویۃ الایمان (شاہ اسمٰعیل شہید) کی عبارت پر اعتراض کے بعد ''مسئلہ امکان وامتناع نظیر'' کی بحث کا آغاز ہوا۔

راقم الحروف نے اپنے ایک مضمون ''عہد غالب — تحریک احیاے دین کے پس منظر میں'' (غالب نامہ، دہلی۔ جولائی ۱۹۹۸ء) میں تحریک ولی للّٰہی کے اصلاحی و انقلابی حدود کی درجہ بندی کرتے ہوئے اس کے پانچ محاذ قرار دیے تھے اور پانچویں محاذ کو معاشرتی محاذ قرار دیا تھا۔ اس محاذ کی نوعیت کے بارے میں لکھا تھا:

> ''پانچواں معاشرتی محاذ جس کا شیوع شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی کتب اور سید احمد شہیدؒ کی روحانی زندگی سے ہوا۔ گو اس کا سلسلہِ استناد شاہ ولی اللہ دہلوی سے ملتا ہے لیکن یہ شاہ عبدالعزیز (ف ۱۸۲۴ء) شاہ محمد اسحٰق (ف ۱۸۴۶ء)، شاہ عبدالقادر (ف ۱۸۱۵ء) اور شاہ عبدالغنی (ف ۱۸۷۸ء) کے واسطوں سے مولانا قاسم نانوتوی (ف ۱۸۸۰ء) تک پہنچتا ہے۔ ان کی علمی و عملی کوششوں کے ذریعے مسلمانوں میں ایک خاص علمی و فکری مسلک کی بنیاد پڑی جو 'مسلک دیوبند' کے نام سے مشہور ہوا۔'' (ص: ۷۴، ۷۵)

اس ''مسلک دیوبند'' کے خلاف جو ''مسلک اہلِ سنت و الجماعت'' ظہور میں آیا اس کا ابتدائی مرکز بدایوں تھا۔ بعد میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی (ف ۱۹۲۱ء) کی نسبت سے یہ دیوبندی مسلک کے بالمقابل ''بریلوی مسلک'' کے نام سے موسوم ہوا۔[۲]

---

۲ یہ بات ذہن نشیں رہنا چاہیے کہ اس ''جدید سنی فرقے'' کا تعلق اولاً بدایوں ہی سے تھا اور اس فرقے کے

اب رہے غالب تو اُن کا نقطۂ نظر شاہ اسمٰعیل شہید سے ملتا تھا۔ یعنی وہ غیر مقلد اور توحید خالص کے حامی تھے (یادگار غالب، ص ۸۱، غالب نامہ، ص: ۵۰) ایک خط میں نواب علاؤ الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

''میں موحدِ خالص اور مومنِ کامل ہوں۔ زبان سے لاالٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجود الا اللہ، لاموثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوے ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمت العالمین ہیں۔'' (غالب کے خطوط، ج ۱، ص ۳۹۷)

کلیات نظم فارسی (۱۸۶۳ء) کی 'چھٹی مثنوی' بیان نموداریِ شانِ نبوّت و ولایت'' مسئلہ امکان نظیر و امتناع نظیر پر غالب کے نقطہ نظر کی واضح ترجمان ہے۔ یہ مثنوی ۱۲۸ اشعار پر مشتمل ہے۔ شروع کے ۹۸ اشعار مولانا محمد سالم دہلوی کے ایک نثری رسالے کا منظوم فارسی ترجمہ ہیں۔ جو مرزا نے بہادر شاہ ظفر کی فرمائش پر کیا تھا۔ یہ منظومہ ۱۸۵۲ء میں معِ تحریر مولوی محمد سالم مطبع سلطانی دہلی سے چھپ کر شائع ہوا۔ مولانا راشد کاندھلوی نے اپنے ایک مضمون غالب کا منظومہ (آجکل، اپریل ۱۹۹۰ء) میں یہ انکشاف کیا کہ اس مثنوی کے آخر کے ۳۰ (تیس) اشعار جو مسئلہ امکان و امتناعِ نظیر کے موضوع پر ہیں اور بہ ظاہر مولانا فضل حق خیر آبادی کی تائید و توثیق کرتے نظر آتے ہیں،

بقیہ حاشیہ، ص: ۲۸ — بانی عثمانی خاندان ہی کے علما تھے۔ جنہوں نے شاہ اسمٰعیل شہید اور اُن کے متبعین سے تقریری و تحریری مناظرے کر کے اس تحریک کو 'نجدی تحریک' کے مشابہ قرار دیتے ہوئے تکفیر کی حدود میں لاکھڑا کیا تھا۔ مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے منصۂ شہود پر آجانے کے بعد بیک قلم تمام علمائے دیوبند کی تکفیر کردی گئی جو ولی اللٰہی فکر کے علم بردار تھے۔ اعلیٰ حضرت کے فعال اور متحرک قلم نے سنّی مسلک کی تشہیر و تبلیغ کی اور بالآخر یہ فرقہ؛ مسلکِ اعلیٰ حضرت، بریلوی مسلک یا مسلکِ اہلِ سنت و الجماعت کے نام سے موسوم ہوگیا۔ حقیقتاً اہل سنت و الجماعت کی اصطلاح خوارج اور شیعت کے ظہور شیوع کے بعد رائج ہوئی تھی اور مذاہب اربعہ کے ماننے والے خود کو اہل سنت و الجماعت ہی کہتے رہے ہیں۔ لیکن اب یہ اصطلاح ایک محدود فرقے کی اسلامی شناخت بن چکی ہے۔

ایک اتفاقی اور ہنگامی صورت میں غالب نے موزوں کیے تھے۔ جو جنوری ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے کے کہے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ (غالب کی چند فارسی تصانیف، ص: ۱۳۲)

حالی نے لکھا ہے:

''باوجودیکہ مولانا فضل حق نے اس مسئلے کے متعلق جو کچھ اُن کی رائے تھی مرزا کے خوب ذہن نشیں کردی تھی اور مرزا اسی کو اپنی مثنوی میں بیان کرنا چاہتے تھے۔ مگر جس طرح ایک ٹیڑھی چیز نلکی میں آکر سیدھی ہوجاتی ہے اسی طرح مرزا کی راست بیانی نے اس ٹیڑھی رائے کی تمام بل نکال ڈالے اور بغیر اس کے کہ مرزا کو وہابیوں کی حمایت منظور ہو، جو ٹھیک بات تھی وہ ان کے قلم سے بے اختیار ٹپک پڑی۔ پھر اس کے بعد جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا (فضل حق) کے جبر سے لکھا ہے اس کو مرزا کے اصلی خیالات سے کچھ تعلق نہیں۔'' (یادگار غالب، ص ۸۲۔۸۱)

غالب کے عہد کی دلی میں مذکورہ علمی مسئلے پر بحث و مباحثے کا بازار بہت دنوں گرم رہا۔[۱] دہلی کی طرح بدایوں کے علما اور ان کے متبعین بھی دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ بدایوں کے عثمانی خاندان کے علما پر مشتمل تھا، اس خاندان کے بیشتر اکابر غالی حنفی تھے اور ''ردِ وہابیت'' کو خدمتِ دین تصور کرتے تھے۔ مولوی عبدالمجید قادری (ف ۱۸۴۶ء) والد ماجد شاہ فضل رسول مست بدایونی نے شاہ اسمٰعیل شہید کی زندگی ہی

---

[۱] دیکھیے غالب نامہ (ص: ۴۹) غالب کے ایک فارسی خط میں بھی اس بحث کا حوالہ موجود ہے۔ جو انہوں نے ۱۷؍جنوری ۱۸۵۷ء کو سلطان العلما مولوی سید محمد مجتہد لکھنوی (ف ۱۸۶۷ء) کو لکھا تھا۔ خط کی متعلقہ عبارت حسب ذیل ہے:

''دریں ہنگام در شہر دو دانش مند باہم در آویختہ اند۔ یکے می سراید کہ آفریدگار ہمتائے حضرت خاتم الانبیاء علیہ و آلہ السلام می تواند آفرید و ایں یکے می فرماید کہ ممتنع ذاتی و محالِ ذاتی است۔ بندہ چوں ہمیں عقیدت (کذا۔ عقیدہ) دارد، نظمے در گیرندہ بدیں مدعا سرانجام دادہ است۔ ہر آئینہ وحشم دارد کہ سواد بہ نور نظر اصلاح روشن شد۔''

(تجلیات، عزیز لکھنوی، حصہ دوم، ص ۹۸۔۱۹۷۔ بحوالہ غالب کی چند فارسی تصانیف، ص: ۱۲۹)

میں ''تقویۃ الایمان'' کے رد میں ''ہدایت الاسلام'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ (اکمل التاریخ ج ۱/ص:۱۱۰) ہدایت الاسلام رسالہ شائع ہو چکا ہے۔ حامد اللہ ندوی نے اس کے قلمی نسخے کا تعارف 'اردو مخطوطات'' (بمبئی ۱۹۵۶ء، ص:۲۶) میں کرادیا ہے۔

اسی خاندان کے ایک بزرگ مولوی سعدالدین عثمانی (ف ۱۲۸۳ھ/ ۶۷-۱۸۶۶ء) نے بدایوں میں ولی اللّٰہی افکار وخیالات اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے مسلک ونظریات کی اشاعت کی۔ جس کی پاداش میں مولانا فضل رسول مست بدایونی کے ہاتھوں ان کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا (اردو نثر کے ارتقاء میں علما کا حصہ، ص:۳۸۰) اس سلسلے کے ان کے دو رسائل کا ذکر ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنے محولہ صدر علمی مقالے میں کیا ہے:

۱۔سعادت دارین (اردو۔سالِ تالیف ۱۲۵۰ھ/ ۳۵-۱۸۳۴ء) مطبوعہ مطبع صدیقی بریلی۔ ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء۔ بدعات کے رد اور توحید خالص کے بیان میں

۲۔رفاہ المسلمین فی شرح مسائل اربعین۔ (اردو۔ سالِ تالیف ۱۲۵۶ھ/ ۴۱-۱۸۴۰ء) مطبوعہ مطبع صدیقی بریلی۔ شاہ اسحٰق دہلوی کے رسالے ''مسائل اربعین'' کا اردو ترجمہ مع شرح۔ بدایوں کے عثمانی خاندان کے علما کا یہ دھڑا شاہ اسمٰعیل شہید کو محمد بن عبدالوہاب نجدی (ف ۱۷۹۲ء) کی تحریک کا ہندوستانی نمائندہ قرار دیتا تھا۔ شاہ صاحب کی کتب ''تقویۃ الایمان'' اور ''صراط مستقیم'' کا موازنہ کتاب التوحید (از محمد بن عبدالوہاب نجدی) سے کر کے ان کو خارج از اسلام اور ملت اسلامیہ میں تفرقہ ڈالنے والا فرد بتاتا تھا۔ اس جماعت کے سرخیل مولانا شاہ فضل رسول مست (ف ۱۸۷۲ء) اور ان کے بیٹے مولانا عبدالقادر قادریؒ (ف ۱۹۰۱ء) تھے۔ اس کے برخلاف دوسرا دھڑا سہسوان کے ان علما کا تھا جو غیر مقلد تھے اور مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی (ف ۱۹۰۲ء) سے سلسلۂ تلمذ رکھتے تھے۔ ان میں مولوی امیر حسن سہسوانی (ف ۱۸۷۴ء)

اور مولوی امیر احمد سہسوانی (ف ۱۸۸۹ء) کے نام ممتاز ہیں۔ بریلی میں مولانا محمد احسن نانوتوی (ف ۱۸۹۵ء) اور مولوی نقی علی خاں بریلوی (ف ۱۸۸۰ء) کی معرکہ آرائی نے اس علمی اختلاف کو باقاعدہ دو مسلکوں کی صورت دینے کی راہ ہموار کی[۱]۔ علماے بدایوں اس جدید فرقہِ اہل السنہ والجماعت کے پرزور حامی بن کر اُبھرے۔ شیخوپور، بدایوں میں غالب کی وفات (فروری ۱۸۶۹) کے بعد ''مسئلہ امکانِ نظیر و امتناع نظیر'' پر ۱۲۸۸ھ/ ۱۸۷۱ء میں مولانا عبدالقادر بدایونی اور مولانا امیر احمد سہسوانی کے درمیان مناظرہ ہوا جسے ''مناظرہ احمدیہ'' کے عنوان سے مولوی محمد نذیر سہسوانی (ف ۱۸۸۱) نے مطبع شعلہ طور، کانپور سے ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء میں طبع کرادیا۔ (احسن نانوتوی، ص: ۸۵) اس مناظرہ کی اشاعت کے بعد بحث در بحث کا سلسلہ دراز ہوکر تقریباً پچاس سال چلتا رہا، اور ہر دو فریق کے رسائل طبع ہوتے رہے۔ چند رسائل کے اسماء یہ ہیں:

☆ تحقیقات محمدیہ حل اوہام نجدیہ (مناظرہ احمدیہ کے رد میں)، مولانا فضل مجید بدایونی، مطبع الٰہی، آگرہ ۱۸۷۲ء

---

[۱] اُن دنوں بریلی میں مولانا محمد احسن نانوتوی (۱۸۲۵۔۱۸۹۵ء) ولی اللّٰہی افکار و خیالات کی نشر و اشاعت کررہے تھے۔ انہوں نے ستمبر ۱۸۶۲ء سے قبل بریلی میں مطبع صدیقی قائم کیا اور اس مطبع سے شاہ صاحب اور اُن کے متبعین کی کتب کی اشاعت کی (احسن نانوتوی، ص: ۶۸) بریلی ہی سے ۱۷ر ستمبر ۱۸۶۲ء کو ایک ہفتہ وار اخبار 'احسن الاخبار' جاری کیا۔ مطبع صدیقی اور 'احسن الاخبار' کے مالک و مدیر مولانا خود ہی تھے۔ (اختر شہنشاہی، ص ۱۴) مولانا نے ۱۸۷۲ء میں مصباح التہذیب (مصباح العلوم) کے نام سے ایک اسلامی مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔

تاریخی اعتبار سے اگر بریلی اور دیوبند کے درمیان اختلاف کا نقطہِ آغاز تلاش کریں تو پتا چلتا ہے کہ دراصل اختلاف کی ابتدا مولانا احمد رضا خاں سے پہلے ان کے والد مولانا نقی علی خاں (۱۸۳۰۔۱۸۸۰ء) اور مولانا احسن نانوتوی کے درمیان اثر ابن عباس کی صحت اور اس کے نتیجے میں مولانا احسن کی علانیہ تکفیر سے ہوئی تھی۔ اس کی تردید و دفاع علماے فرنگی محل اور علماے دیوبند نے پُرزور طریقے پر کیا۔ یہی بحث دراز ہوکر اعلیٰ حضرت تک پہنچی۔ اس سلسلے کے فریقین کے رسائل (جن میں چوٹی کے علما شامل ہیں) کا تعارف ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنی کتاب ''احسن نانوتوی'' میں کرادیا ہے۔

☆ سعادت دارین، مولانا سعد الدین عثمانی، مطبع صدیقی بریلی ۱۸۷۳ء

☆ تنبیہ الجہال بالہام الباسط المتعال (مناظرہ احمدیہ کے رد میں)، مفتی حافظ بخش بدایونی، لکھنؤ ۱۸۷۴ء

☆ القول الفصیح (مولانا قاسم نانوتوی کے رسالے 'تحذیر الناس' کے جواب میں)، مولوی فصیح الدین بدایونی، میرٹھ ۱۸۷۵ء

☆ احقاق الحق (تقویۃ الایمان کے رد میں)، مولانا فضل رسول مست، مطبوعہ

☆ سراج الایمان (احقاق الحق کا رد)، مولانا سید سراج احمد سہسوانی، مطبع بیت السلطنت، لکھنؤ

☆ شمس الایمان (رسالہ سراج الایمان کا رد)، مولانا محی الدین قادری عثمانی، مطبوعہ

☆ افادات صمدیہ (مولوی امیر حسن سہسوانی کے رسالے افادات ترابیہ کا رد)، مولانا عبد الصمد سہسوانی، مطبوعہ

☆ نقض الاباطیل فی الذب عن الشیخ اسمٰعیل، مولانا سید امیر حسن محدث سہسوانی (مولانا فضل حق کے رسالے امتناع النظیر کا رد)، مطبوعہ

☆ ردِّ رسالہ قانون شریعت (مولوی امیر حسن سہسوانی کے رد میں)، مولوی الٰہی بخش، مطبوعہ

(تفصیل کے لیے دیکھیں۔ احسن نانوتوی، ص: ۸۴ تا ۹۴۔ حیاۃ العلماء، ص: ۴۹، ۷۷)

معقولات کے ساتھ خاص اعتناء رکھنے والے علما اس دور کے دوسرے بڑے خیر آبادی علمی سلسلے اور اس کے گل سرسبد مولانا فضل حق خیر آبادی (ف ۱۸۶۱ء) سے فکری ہم آہنگی رکھتے تھے۔ خاص نام مولانا فضل رسول مست بدایونی (۱۷۹۸ء۔ ۱۸۷۲ء) کا ہے جو مولانا سخاوت علی جونپوری (ف ۱۸۵۸ء) اور مولانا نور الحق فرنگی محلی (ف ۱۸۶۶ء) کے تلمیذ تھے۔ (تذکرہ علمائے ہند اردو ترجمہ، ص: ۳۸۲) مولانا فضل حق سے خاص مراسم اور فکری ہم آہنگی تھی۔ (عبد القدیر بدایونی، ص: ۱۳) علم کلام پر مولانا

فضل رسول کی کتاب "المعتقد المنتقد (عربی) پر مولانا فضل حق نے تقریظ بھی لکھی تھی۔ مولانا فضل رسول ردّ وہابیہ میں مولانا فضل حق کے ہم نوا تھے۔ انہوں نے شاہ اسمٰعیل شہید کی کتب اور نظریات کا تحریری بطلان کیا۔ اس سلسلے کی ان کی معروف کتاب "سیف الجبار" ہے۔ (اردو۔ سالِ تالیف ۱۲۶۵ھ/ ۴۹۔۱۸۴۸ء۔ بار دوم مطبوعہ مطبع صبح صادق، ستیارپور۔ ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء) جوایک مقدمہ دو باب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں 'صراط مستقیم' کا بیان ہے۔ باب اول میں محمد بن عبدالوہاب کی تحریک اور شاہ اسمٰعیل کی تحریکِ جہاد کا بیان ہے۔ باب دوم میں محمد بن عبدالوہاب کی کتاب "کتاب التوحید" کے باب اول کا رد ہے۔ خاتمہ میں شاہ اسحٰق کے بعض رسائل کی خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ دوسری کتب البوارق المحمدیہ لرجم الشیاطین النجدیہ (فارسی، مطبوعہ میرٹھ) احقاقِ حق و ابطال باطل، تلخیص الحق، تصحیح المسائل (فارسی)، فوز المومنین بشفاعۃ الشافعین (اردو) ہیں جو اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ مولانا فضل رسول پہلے ہندوستانی عالم ہیں جنہوں نے شاہ اسمٰعیل شہید اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کے درمیان فکری رابطے تلاش کیے اور اسی نسبت سے ان پر لفظ "وہابی" کا اطلاق کیا۔ مسلمانانِ ہند کی قومی تاریخ میں لفظ وہابی کا غالباً یہ اولین استعمال تھا[1]۔ جو بعد میں خاندان ولی اللہ کے دوسرے اکابر پر بھی (جو برطانوی ہند کو دارالحرب کہتے تھے اور جہاد کو جائز قرار دیتے تھے) چسپاں کیا جانے لگا۔ انگریز مورخین نے اس لفظ کو باغی کے معنوں

---

[1] لفظ "وہابی" ۱۷۴۴ تا ۱۸۰۳ء کے درمیان اہل عرب یا ترکوں نے وضع کیا۔ آل سعود اور محمد بن عبدالوہاب کی مشترکہ سیاسی و مذہبی تحریک نے شریف مکہ اور سلطنتِ عثمانیہ کو ان کے بالمقابل کھڑا کردیا تھا۔ اس دوران مذہبی مناظرے، رسائل کی اشاعت اور فوجی معرکے جاری رہے۔ محمد بن عبدالوہاب کی برپاکردہ توحید خالص اور اس کے اثر کے تحت آل سعود کا بصورت حکمراں ظہور وفتوحات حاصل کرنا ترکوں اور شریف مکہ کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ چنانچہ نفرت انگیز سیاسی پروپیگنڈے کے طور پر ان کے متبعین کو "وہابی" کے لقب سے مطعون کیا گیا۔ شیخ عمران نے کہا ہے:

ان کان تابع احمد متوھباً　　فان المقر باننی وہابی

ترجمہ: اگر احمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیروکار وہابی ہے تو مجھے اقرار ہے کہ میں وہابی ہوں۔

میں استعمال کیا اور تحریک احیاے دین کو وہابی مومنٹ (Wahabi Movement) کا نام دیا۔ انگریز مصنفین میں سب سے پہلے لفظ وہابی کا استعمال ڈبلو ڈبلو ہنٹر نے اپنی کتاب اَور انڈین مسلمانز (Our Indian Musalmans) مطبوعہ ۱۸۷۱ء میں کیا تھا[1]۔

مولانا فضل رسول مست بدایونی، نواب محمد یار خاں سورتی کی طلب پر ۱۸۶۲ء میں حیدر آباد گئے (اکمل التاریخ ج ۲، ص ۵۲) مرزا غالب کو کرید ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے حکیم غلام نجف خاں (شیخوپور بدایوں) کو مولانا کے دریافت حال کے لیے لکھا:

> ''مولوی فضل رسول صاحب[2] حیدر آباد گئے ہیں، مولوی غلام امام شہید آگے سے وہاں ہیں۔ محی الدولہ محمد یار خاں سورتی نے ان صورتوں کو وہاں بلایا ہے، پر یہ نہیں معلوم کہ وہاں ان کو کیا پیش آیا ہے۔ اگر تم معلوم کر سکو یا کچھ تم کو معلوم ہو گیا ہو تو مجھ کو ضرور لکھو۔''

(خط مکتوبہ ۱۱/ جنوری ۱۸۶۳ء۔ غالب کے خطوط ج/ ۲، ص: ۶۳۲)

مولانا فضل رسول اور نواب محمد یار خاں سورتی ردِّ وہابیہ میں متحد الخیال تھے۔ غالب نے نواب سورتی سے تعلق استوار کرنے کے لیے ردوہابیہ میں جو مثنوی لکھی تھی وہ انہیں بھیجی۔ لیکن نواب کی جانب سے رسید تک نہیں ملی۔ (خط بنام ذکا مکتوبہ ۲۶/ اگست ۱۸۶۳ء)

عہد غالب کے ایک اور عالم وشاعر مولانا شاہ سلامت اللہ کشفی بدایونی (۱۷۸۹۔

---

[1] سر سید احمد خاں نے ڈاکٹر ہنٹر کی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اقرار کیا تھا کہ ''میں خود وہابی ہوں اور وہابی ہونا کوئی جرم نہیں ہے۔'' (حیات جاوید، ص: ۱۷۸)، یہ تبصرہ پائنیر کی نومبر ۱۸۷۱ء سے پیشتر کی کسی اشاعت میں شامل ہوا تھا۔ بعد میں حافظ احمد حسن (لندن) نے پمفلٹ کی صورت میں چھپوا کر اسے تقسیم کیا۔

[2] پروفیسر نثار احمد فاروقی نے مذکورہ خط میں فضل رسول سے مراد منشی فضل رسول واسطی (ف ۱۸۷۹) لیے ہیں جو غلام احمد شہید کے بھانجے تھے اور مظفر علی اسیر لکھنوی کے شاگرد۔ (تلاش غالب، ص ۵۷) لیکن ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے بوستان اودھ از راجا درگا پرشاد (مطبع احمدی، لکھنؤ، ۱۸۸۶ء، ص: ۱۹۷) کے حوالے سے واسطی کے حیدر آباد جانے کی نفی کی ہے۔ (غالب اور عصر غالب، ص: ۱۸۷) جب کہ اکمل التاریخ، ج/ ۲، ص: ۵۲، اور قاموس الشاہیر، ج/ ۲، ص: ۱۱۵ سے فضل رسول بدایونی کا حیدر آباد جانا ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا فضل رسول سے مراد یہی بدایونی عالم ہیں۔

۱۸۶۴ء) تھے۔ جو علم حدیث و تفسیر میں شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی (ف ۱۸۲۴ء) اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ رفیع الدین دہلوی (ف ۱۸۱۷ء) کے شاگرد تھے۔ (تذکرہ علمائے ہند، ص:۲۲۱) ان کو شاعری میں مرزا قتیل (ف ۱۸۱۸ء) سے تلمذ تھا۔ (اکمل التاریخ ج ۱/ ص ۱۱۳) لکھنؤ و کانپور میں بود و باش رہی۔ فارسی و اردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کرتے تھے۔ فارسی میں ''دیوان کشفی'' یادگار ہے (قاموس المشاہیر، ج ۲/، ص:۱۵۳)۔ کتب کثیرہ کے مصنف تھے۔ غالب کے ایک مکتوب میں ان کا ذکر بھی آ گیا ہے۔ سید غلام حسنین قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں:

> ''حضرت: کشفی کے دیوان کے انطباع کی تاریخ اچھی ہے۔ کہیں اصلاح کی حاجت نہیں۔ مگر دوسری تاریخ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس فن کے قاعدے کے موافق مصرعہ تاریخ میں سے تکلف کے عدد نکالنے چاہئیں یعنی پان سوتیں۔ 'کلوخ انداز را پاداش سنگ است' اس مصرعہ کے اعداد میں اتنی گنجائش کہاں کہ پان سوتیں نکل جائیں اور ۱۲۷۸ بچ رہیں۔''

(مکتوب نمبر ۵، محررہ ۱۸۶۱ء۔ غالب کے خطوط ج ۴/، ص:۱۴۱۹)

دیوان کشفی (مطبوعہ: مطبع شعلہ طور، کانپور۔ ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) کے آخر میں سالِ انطباع پر تاریخی قطعات ہیں۔ غالب کے خط میں بلگرامی کے جس تاریخی قطعے کے مصرعۂ تاریخ کا اندراج ہے (کلوخ انداز را پاداش، سنگ است) دیوان میں یہ مصرعِ سعدیؔ اور اس بحر میں تاریخی قطعے کا اندراج نہیں۔ کلیات قدر (مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۱ء) میں بھی یہ قطعہ تاریخ شامل نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے اعتراض کے بعد اس قطعے کو دیوان سے خارج کر دیا گیا۔ دیوان کشفی (اور کلیات قدر، ص:۳۳۳) میں قدر بلگرامی کا جو قطعہ شامل ہے اس کے متعلق غالبؔ کا یہ جملہ:

''کشفی کے دیوان کی تاریخ اچھی ہے۔ کہیں اصلاح کی حاجت نہیں''

اس قطعے کے مطالعے کی دعوت دیتا ہے۔ قطعہ حسب ذیل ہے:

کلام کشفی جادو کلام را نازم
بگوش طبع خواص و عوام شد مطبوع

چو طبع گشت کلامش قبول طبع فتاد
تمام گشت چو دیواں تمام شد مطبوع

یکِ بیاضِ سطور و دگر سوادِ خطش
جو عارضِ سحر و زلفِ شام شد مطبوع

زہے ترانہ و فرد و قصیدہ و غزلش
ہمہ کلام بلاغت نظام شد مطبوع

نوشت قدرؔ پئے طبع مصرعہ تاریخ
''کلامِ کشفی نادر کلام شد مطبوع''

۱۲۷۸ھ

اسی دور کے ایک نامور عالم قاضی عبدالسلام عباسی بدایونی (ف ۱۸۷۲ء) تھے۔ جو فارسی کے بھی بلند پایہ شاعر تھے۔ قرآن کریم کی منظوم تفسیر ''زاد الآخرت'' (۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ء) اردو اور مثنوی ''طوفان عشق'' (فارسی) ان سے یادگار ہے۔ ان کے علاوہ ''اخیار الابرار (۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء) اور شرح دلائل الخیرات'' مع ترجمہ ان کی تالیفات ہیں۔[1] (تذکرہ شعراے بدایوں، ج/۱، ص: ۴۲۳)

عہد غالب کے بعض دوسرے علماے کبار کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ مولانا عبدالباری سہوانی (ف ۱۳۰۳ھ/ ۸۶۔۱۸۸۵ء)

۲۔ مولانا نور احمد قادری (ف ۱۸۸۳ء)

۳۔ مولانا اشرف علی نفیسؔ (ف ۱۸۵۸ء)

۴۔ مولانا شفاعت اللہ شفاعت (ف ۱۸۷۱ء)

۵۔ مولانا احسان اللہ واعظؔ (ف ۱۸۷۷ء) تلمیذ شاہ عبدالعزیز دہلوی

۶۔ مولانا عبدالوالی چشتی (ف ۱۸۸۶ء)

۷۔ مولوی انوارالحق (ف ۱۸۸۷ء)

۸۔ مولوی علی بخش خاں شرر (ف ۱۸۸۵ء)

۹۔ مولانا تاج الدین نقوی (ف ۱۸۷۶ء)

---

[1] صاحب قاموس المشاہیر (ج/ ۲، ص ۶۲) نے مثنوی کا نام ''حسن و عشق'' اور تصوف کی کتاب کا نام اخبارالاخیار درج کیا ہے۔

۱۰۔مولانا سناء الدین (ف ۱۸۶۱ء) تلمیذ مولانا فضل امام خیر آبادی و شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

۱۱۔مولوی حکیم علی حسین بدایونی تلمیذ شاہ عبدالعزیز دہلوی

عہد غالب کے بدایوں میں ایسی علمی و مذہبی فضا کے باوصف ادبی چہل پہل نظر نہیں آتی۔ اکثر سخنور بسلسلہ ملازمت کسی دوسرے بڑے شہر میں قیام پذیر تھے۔لیکن مجموعی طور پر سارا شہر ایک علمی و ادبی ماحول پیش کرتا تھا۔اس ماحول میں بھی قصبے کا سا سکون، ٹھہراؤ اور ثقاہت تھی۔ علماء و ادباء اپنے اپنے ذاتی کتب خانوں میں بیٹھے لکھنے پڑھنے کے شغل میں مصروف رہتے تھے۔ غالب کی وفات (۱۸۶۹ء) سے قبل یہاں ایک مطبع ''مطبع حبیبی'' اور ایک ہفتہ وار اخبار 'حبیب الاخبار' کا پتا چلتا ہے۔ (اختر شہنشاہی ص:۵۷۔اردو کے اخبار نویس ج ۱/ص:۹۰) ۱۸۶۹ء کے بعد اسی صدی میں یہاں متعدد مطابع قائم ہوئے اور اخبارات و گلدستے جاری ہوئے، جن کی فہرست میں نے اپنے علمی مقالے 'نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات' (ص:۲۹۶ تا ۲۹۹) میں پیش کردی ہے۔

عہد غالب ہی میں بدایوں میں شعراے اردو کا ایک تذکرہ مولوی اشرف علی نفیسؔ بدایونی نے لکھا، جو تاریخی نام 'انتخاب دہر' (۱۲۶۳ھ) کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ تذکرہ ۱۲۶۳ھ/ ۴۷-۱۸۴۶ء میں شروع ہوکر ۱۲۶۵ھ/ ۴۹-۱۸۴۸ء میں مکمل ہوا۔اب تک کی دریافت کے مطابق بدایوں میں لکھا جانے والا یہ پہلا تذکرہ ہے۔ (رک۔ بدایوں میں اردو تذکرہ نویسی کی روایت۔ اردو ادب دہلی۔شمارہ ۳۔۴۔ ۱۹۹۴ء)۔ ۱۸۷۲ء میں 'شمیم سخن' لکھا گیا۔ جسے عہد غالب سے متعلق کرنا درست نہیں ہوگا۔'انتخاب دہر' غیر مطبوعہ رہا۔

حکیم وحیداللہ ولد حکیم سعیداللہ، صاحب دیوان شاعر تھے۔انہوں نے تاریخ ہند پر کئی کتابیں لکھیں:

● مختصر سیر ہندوستان (فارسی)، ۱۲۶۷ھ/ ۵۱۔۱۸۵۰ء، اکابر ہند کے ذکر میں
مخزونہ۔ذاتی کتب خانہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم (کراچی)

● آئینہ جہاں نما (فارسی) بلاد و امصار کے بیان میں
مخزونہ۔ڈاکٹر محمد ایوب قادری

● تذکرہ حکومت المسلمین (فارسی) تاریخ روہیل کھنڈ
خطی نسخہ۔مخزونہ۔رضا لائبریری، رامپور

● تاریخ بھرت پور تاریخ بھرت کے بیان میں

خاص بدایوں کی بھی تین تاریخیں قلم بند کی گئیں:

● صحیح السیر فی کوائف الخلد (فارسی) مصنف احمد رضا حمیدی (ف ۱۸۸۷ء)
سال تصنیف: ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۲ء)

● تاریخ بدایوں (فارسی) مولانا عبدالقادر (ف ۱۹۰۱ء)
سال تصنیف ۱۲۸۴/ ۶۸۔۱۸۶۷ء

● تاریخ بدایوں (اردو)، رائے بختاور سنگھ
مطبوعہ: روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، بریلی، ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۸ء

عہد غالب میں اولیائے بدایوں کے بھی ایک تذکرے اور سوانح کا حوالہ ملتا ہے:

● باقیات الصالحات (فارسی)، مولانا عبدالوالی چشتی (ف ۱۸۸۶ء)
سال تصنیف ۱۲۶۴ھ/ ۴۸۔۱۸۴۷ء

● تاریخ شیخ شاہی (فارسی)، (سوانح سلطان العارفین) مولوی امانت حسین دانشمندی (ف ۱۸۶۷ء) سالِ تصنیف ۱۲۲۶ھ/ ۱۸۱۱ء

عہد غالب میں (بہ اِستثناء تلامذہ غالب) شعرائے بدایوں کے جو نام تاریخ و تذکروں میں محفوظ ہیں ان میں یہ چند قابل ذکر ہیں:

۱۔آزاد: محمد علی خاں (ف ۱۸۵۹ء) تلمیذ ذوق دہلوی

۲۔ بندہؔ: شیخ حفیظ اللہ (ف ۱۸۶۰ء) تلمیذ رفعتؔ رامپوری۔

مصنف رسالہ بیت المعرفت

شرح ظہوری، انشائے فیض رساں، آداب الصبیان وغیرہ

۳۔ بیتاب: میاں عبداللہ شاہ (ف ۱۸۸۰ء) برادرزادہ و تلمیذ شاہ محمدی بیدآر اکبرآبادی

۴۔ تسلیم: منشی انوار حسین (ف ۱۸۹۲ء) معروف تاریخ گو۔

مصنف تاج المدائح۔ عدد التاریخ، ملخص تسلیم وغیرہ صاحب دیوان

۵۔ دردی: مفتی محفوظ علی (ف ۱۸۳۲ء)

۶۔ رسوا: مولانا فیض احمد (ف ۱۸۵۸ء) مجاہد آزادی

۷۔ زار: داؤد اللہ (ف ۵۷ یا ۱۸۵۶ء)

۸۔ سحر: منشی دیبی پرشاد (ف ۱۹۰۲ء) کتب کثیرہ کے مصنف و مؤلف۔

معروف کتب معیار البلاغت، نظم پرویں، اثر رنگ چیں وغیرہ۔ صاحب دیوان

۹۔ شرر: علی بخش خاں (ف ۱۸۸۵ء) مخالف سرسید احمد خاں۔

سرسید کے عقائد کے رد میں تین رسائل لکھے۔ صاحب دیوان

۱۰۔ شفاعت: شفاعت اللہ (ف ۱۸۷۱ء)

صاحب ترانہ غرائب (۱۸۶۹ء) یعنی منظوم فسانہ عجائب۔ صاحب دیوان

۱۱۔ قیس: افضل الدین (ف ۵۲ یا ۱۸۵۱ء)

۱۲۔ کامل: حکیم سعید الدین (ف ۱۸۹۸ء) تلمیذ عارف دہلوی۔ صاحب دیوان

۱۳۔ کشفی: شاہ سلامت اللہ (ف ۱۸۶۴ء) تلمیذ مرزا قتیل۔ صاحب دیوان

۱۴۔ مذاق: شاہ دلدار علی (ف ۱۸۹۴ء) تلمیذ ذوق دہلوی صاحب دیوان

۱۵۔ مست: شاہ فضل رسول (ف ۱۸۷۲ء) صاحب دیوان

۱۶۔ مسکین: عظیم اللہ (ف ۱۸۸۶ء)

۱۷۔ممتاز: حکیم ممتاز الدین (ف ۱۸۹۰ء) تلمیذ شاہ نصیرؔ دہلوی

۱۸۔موجد: وہاب الدین (ف ۱۸۲۰ء)

۱۹۔ناطق: نظام الدین (ف ۱۸۶۸ء) تلمیذ معروف دہلوی

۲۰۔نفیس: اشرف علی (ف ۱۸۵۸ء) مجاہد آزادی۔ تلمیذ نواؔ، مصنف: انتخاب دہر

۲۱۔نوا: ظہور اللہ خاں (ف ۱۸۳۰ء) تلمیذ بقاء اللہ بقاؔ

مذکورہ شعرا فارسی و اردو کے ممتاز شعرا کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان میں بعض صاحب دیوان ہیں اور بعض کے دیوان مطبوعہ موجود ہیں لیکن ان میں سے اکثر شعرا نے بسلسلہ ملازمت بدایوں سے باہر دہلی، لکھنؤ، رامپور، بھوپال، ٹونک وغیرہ میں بود و باش اختیار کی، اور قدرے شہرت بھی حاصل کی۔ دوسرے شعرا کو گمنامی کی گرد نے ڈھانپ لیا۔

بدایوں میں غالبؔ کے مخالفین و مدّاحین

(عہدِ غالبؔ میں)

غالبؔ کے ہم عصر علما، مصنّفین اور شعرا میں سب ہی صاحبِ علم وفضل ہیں۔ انہی میں غالبؔ کے مداحین و معرّفین بھی ہیں اور ان کے مخالف و نکتہ چیں بھی۔ مرزا نے قاضی عبدالجمیل جنونؔ بریلوی (ف ۱۹۰۰ء) کو اپنے ایک خط (محرّرہ ۴؍اپریل ۱۸۶۴ء) میں لکھا تھا:

> ''سہوان کے صاحب اگر 'قاطعِ برہان' کا جواب لکھتے ہیں خدا اُن کو یہ توفیق دے کہ عبارت کے معنی سمجھ لیں، تب جواب لکھیں''۔
>
> (غالب کے خطوط، ج ر ۴، ص:۱۵۰۹)

تحقیق کے باوجود علم نہ ہوسکا کہ یہ کون صاحب تھے۔ راقم الحروف نے ۱۹۸۱ء میں ''سہسوان کے صاحب'' سے مراد منشی انوار حسین تسلیمؔ سہسوانی (ف ۱۸۹۲ء) لیے تھے۔ (دید و دریافت، ص: ۲۳) بعد میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے بھی اپنی کتاب ''غالب اور عصرِ غالب'' (ص:۱۸۹) میں میری کتاب کے حوالے سے اسی بات کو دہرا

دیا۔ لیکن میرا یہ خیال غلط تھا۔ تسلیم غالبؔ کے مداحوں میں تھے۔ تفصیل آئندہ اوراق میں آرہی ہے۔

''برہانِ قاطع'' محمد حسین تبریزی کا فارسی لغت ہے جو ۱۰۶۲ھ/ ۱۶۵۲ء میں لکھا گیا۔ یہ لغت سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد (۱۶۲۵-۱۶۷۴ء) میں گولکنڈہ میں مرتب ہوا۔ غالبؔ نے ''برہانِ قاطع'' کی تنقید ''قاطعِ برہان'' کے نام سے لکھی۔ اس میں غالبؔ نے برہان کی خامیوں کی نشاندہی کر کے ۲۸۴ الفاظ پر اعتراض وارد کیے۔ یہ کتاب مع تقریظِ غالب مطبع نولکشور لکھنؤ سے ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۲ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کتاب (قاطعِ برہان) کے شائع ہوتے ہی فارسی داں حلقوں میں ایک طوفان برپا ہوگیا۔ اس کے متعدد جواب لکھے گئے۔ مثلاً (۱) محرق قاطع برہان [۱۸۶۳ء]، (۲) ساطع برہان [۱۸۶۵ء]، (۳) موید برہان [۱۸۶۵ء]، (۴) قاطع القاطع [۱۸۶۵ء]۔ غالبؔ نے خود بھی ان کتب کے جواب لکھے اور ان کے تلامذہ و متوسلین نے بھی، جن کی ایک طویل فہرست ہے۔ یہ بحث ۱۸۶۸ء تک چلی۔ آخر میں اس نے شاعری کی صورت اختیار کر لی اور دونوں جانب سے قطعہ در قطعہ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ غور طلب امر یہ ہے کہ ''قاطعِ برہان'' کے رد میں پہلی کتاب ۱۸۶۳ء میں شائع ہوئی۔ ۱۸۶۴ء میں اس کا رد ''سہسوان کے صاحب'' رقم فرمارہے تھے۔ یعنی اگر سہسوان میں لکھی جانے والی کتاب منظرِ عام پر آجاتی تو ''قاطعِ برہان'' کے رد میں اور ''برہانِ قاطع'' کی تائید میں یہ دوسری کتاب ہوتی۔ اس کتاب کے تعلق سے یہ سوالات ہنوز قائم ہیں:

۱- سہسوان کے وہ کون بزرگ تھے جو ''قاطعِ برہان'' کی قطع و برید فرما رہے تھے؟

۲- کیا وہ طبقۂ علماء سے تھے یا شاعروں کے اس طبقے سے جو محض اظہار برتری یا نام و نمود کے لیے باہم دست و گریبان رہتے ہیں۔

۳- اس رد کے لکھنے کا محرک کیا تھا؟

۴- یہ رد پایۂ تکمیل کو پہنچا یا نہیں؟

۵- بدایوں میں غالب شکنی کے محرکات کیا تھے۔ مومن پرستی، ذوق پرستی، غالبؔ کی شیعت یا غالبؔ کا شعری میدان میں روشِ عام سے ہٹا ہونا۔

راقم الحروف نے اپنی کتاب ''دید و دریافت'' میں ذوق پرستی کو بدایوں میں غالب شکنی کا سبب قرار دیا تھا اور بدایوں میں ذوقؔ کے تلامذہ اور اُن تلامذہ کے ذریعے 'ذوق اسکول' کے سلسلے درسلسلے کی وضاحت کی تھی۔ اور ذوقؔ سے موجودہ دور تک اس روایت کے اثرات کی نشاندہی کی تھی۔ (دید و دریافت، ص: ۴۴) لیکن سیّد محفوظ الرحمٰن (سہسوانی) نے اپنے ایک مضمون ''دید و دریافت-ایک مطالعہ'' میں لکھا:

> ''لیکن اس سوال کا جواب تشنہ ہے کہ بدایوں نے غالبؔ کے دور میں غالب شکن کیوں پیدا کیے۔ مصنف کا یہ مفروضہ کہ ذوق پرستی نے غالب شکنی کے مزاج کو فروغ دیا، زیادہ صحیح نہیں۔ 'برہانِ قاطع' کی قطع و برید جو سہسوانی بزرگ فرما رہے تھے ...اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ کی شیعت سے شعرا و حکمائے سہسوان (جو غیر مقلد تھے) نالاں تھے۔ بایں سبب ردِ غالب میں سہسوانی پیش پیش رہے۔ اور چونکہ حکیم مومن خاں مومنؔ غیر مقلد بھی تھے اور سہسوان سے مخصوص تعلق رکھتے تھے، لہٰذا مومن پرستی کے نتیجے میں غالب شکنی سمجھ میں آنے والی بات ہے جس کا وافر ثبوت مولانا اعجاز احمد (معجزؔ) سہسوانی کا کارنامہ موازنۂ 'مومن و غالب' ہے، جو اپنی جگہ غالب شکنی کی واضح دلیل ہے''۔ (رہنمائے تعلیم، دہلی، فروری ۱۹۸۲ء)

مذکورہ صدر اقتباس میں سیّد محفوظ الرحمٰن نے غالبؔ کی شیعت اور ذوق پرستی کے بالمقابل مومن پرستی کو غالب شکنی کا سبب قرار دیا ہے اور اس کی وجہ مومن کی طرح شعرا و حکمائے سہسوان کا غیر مقلد اور اسی بنیاد پر مومنؔ کا سہسوان سے 'مخصوص تعلق' ہونا لکھا ہے۔ لیکن انھوں نے مومنؔ کے سہسوان سے 'مخصوص تعلق' کی وضاحت نہیں کی۔ جہاں تک راقم الحروف کی محدود معلومات ہے، بدایوں میں مومنؔ کا کوئی شاگرد بھی نہیں تھا۔

سہسوان سے تعلق کی بنیاد تنہا ان کا 'سفر سہسوان' ہے جو براہِ بدایوں کیا گیا۔ بدایوں سے متعلق مومنؔ کا ایک شعر بھی ملتا ہے:

بدایوں میں مجھے جوشِ جنوں لایا ہے دلّی سے
یہ کیوں کر چارہِ پندِ خرد مندانِ ہوش آیا

(کلیاتِ مومن، ص:۱۸۰)

مقصد سفر کے متعلق اختلاف ہے۔ سیّد محمد عبدالباقی سہسوانی نے لکھا ہے:

''مومنؔ نواب محمد سعید خاں سے جو اس زمانے میں سہسوان میں ڈپٹی کلکٹر تھے، ملاقات کی غرض سے آئے اور یہیں پر مولانا تاج الدین نقوی کی خدمت میں حاضر ہو کر مستفید ہوئے''۔

(حیوۃ العلما، ص:۳۰)

مومنؔ کے نواب محمد سعید خاں سے مخلصانہ روابط تھے جو اُن دنوں بحیثیت ڈپٹی کلکٹر سہسوان میں موجود تھے، جو بعد میں ۲۰/اگست ۱۸۴۰ء کو ریاست رامپور میں مسند آرائے سلطنت ہوئے۔ سہسوان میں ۳۱/اکتوبر ۱۸۲۳ء کو کلکٹری قائم ہوئی تھی اور مئی ۱۸۳۸ء کو یہ بدایوں منتقل کر دی گئی۔ (ذوالقرنین بدایوں نمبر ۱۹۵۶ء، ص:۴۳) لہٰذا مومنؔ ۱۸۲۳ء تا ۱۸۳۸ء کی درمیانی مدّت میں سہسوان میں وارد ہوئے۔ مولانا تاج الدین نقوی (ف ۱۸۷۶ء) سہسوان کے ایک جیّد عالم اور مسلک اہلِ حدیث کے حامل تھے۔ ضمیر الدین احمد عرش گیاوی نے لکھا ہے کہ مومنؔ اپنے ہم راز، دوست حکیم مظہر علی رئیس سہسوان کے یہاں تشریف لے گئے اور حکیم مظہر علی کی تحریک پر شرح سدیدی و نفیسی لکھی۔ (حیاتِ مومن، ص:۵۸، ۶۴) ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کا خیال ہے:

''سہسوان کی آمد کا مقصد ایک طرف ان حضرات (یعنی نواب محمد سعید خاں اور مولانا تاج الدین نقوی) سے ملاقات تھی اور دوسری طرف 'صاحب جی' کا عشق تھا''۔

(مومن: شخصیت اور فن، ص:۱۱۰)

’صاحب‘ کی تشریح بعض سہسوانی بزرگ یہ کرتے ہیں کہ یہ ایک مغنیہ تھی جس پر مومنؔ فریفتہ تھے، جو سخن گو و سخن سنج تھی۔ صاحبؔ تخلص کرتی تھی۔ مومنؔ نے اس کا ذکر متعدد اشعار میں کیا ہے، مثلاً:

صاحب نے اس غلام کو آزاد کردیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

صاحب ’خوش معرکۂ زیبا‘ نے ان کا نام امۃ الفاطمہ بیگم تحریر کیا ہے اور انھیں مومنؔ کا شاگرد لکھا ہے۔ (ج ۲/، ص:۵۸۱) امۃ الفاطمہ کا ذکر متعدد تذکروں میں ملتا ہے۔ کسی تذکرہ نگار نے انھیں خانگی لکھا، کسی نے رنڈی، کسی نے طوائف اور کسی نے مغنیہ۔ یہ لکھنؤ سے دہلی آئی تھیں۔ واپسی میں براہِ سہسوان لکھنؤ گئیں۔ دہلی اور سہسوان میں ان کا قیام کتنی مدت رہا اس کا تحریری ثبوت نہیں ملتا۔ یہ درست ہے کہ مومنؔ ان سے دل لگا بیٹھے تھے۔ اپنی مثنوی ’قول غمیں‘ میں اس کے عشق کو موضوع بنایا ہے۔ اکرام بریلوی نے اپنی کتاب ’’حکیم مومن خاں مومن‘‘ (کراچی، ۲۰۰۳ء) میں ان کے عشق کی داستان تفصیل سے درج کی ہے۔

سہسوان سے متعلق مومنؔ کے یہ چند اشعار ہیں جن میں ’صاحب جی‘ کے عشق کی بازگشت سنائی دیتی ہے:

صاحبو میرا حال مت پوچھو — بندہ سخت بے وفا ہوں میں
چھوڑ دلّی کو سہواں آیا — ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
عذر بے جا ہے سرکشی کے لیے — شاکیِ بے سبب جفا ہوں میں
اک خداوند شوخ کے غم میں — قابلِ رحم ہوگیا ہوں میں
مجھے پہنچا دو میرے ’صاحب‘ تک — کہ غلامِ گریز پا ہوں میں

(کلیاتِ مومن، ص: ۱۸۳)

دلدار نصری رامپوری مرحوم جو تاریخ کے اچھے اسکالر تھے، انھوں نے اپنے مضمون ’’مولوی فضل حق خیرآبادی اور رامپور‘‘ میں مومنؔ کے مقصدِ سفرِ بدایوں و سہسوان کے

بارے میں بالکل نئی اطلاع دی ہے جس کی مجھے کہیں سے بھی سند نہیں مل سکی۔ خود انھوں نے بھی اپنے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "مومنؔ خاں تحریک سیّد احمد شہید کے سلسلے میں رامپور آئے تھے۔ اس وقت نواب احمد علی خاں صاحب حکمراں تھے۔ بدایوں بھی گئے تھے جہاں محمد سعید خاں جو بعد میں رامپور کے نواب ہوئے، ڈپٹی کلکٹر تھے۔ یہ دورہ مجاہدین کی بھرتی کے لیے کیا گیا تھا۔ مومنؔ خاں خود تو جہاد میں شریک نہ ہو سکے لیکن جو کوشش میدانِ جنگ سے باہر رہ کر وہ کر سکتے تھے اس میں کمی نہیں کی"۔

(رضا لائبریری جرنل، رامپور، شمارہ نمبر ۲، ۱۹۹۵ء، ص: ۲۹۵)

مومنؔ کے سفر سہسوان سے یہاں کی شعری فضا پر کیا اثرات مرتب ہوئے اس کے بارے میں کچھ لکھنا ناممکن ہے۔ مومنؔ کا یہ سفر غالبؔ کے خلاف فضا بنانے کا محرک بنا۔ یہ بھی بے بنیاد سی بات معلوم ہوتی ہے۔ البتہ مومنؔ کے اس سفر سے شعرا، علماء و حکمائے سہسوان کا مومنؔ سے زیادہ بہتر طور پر تعلق استوار ہونا اور نتیجے کے طور پر مومن کو یہاں عمومی طور پر پسند کیا جانا، قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔

الغرض ردِّ غالب کی بنیاد سہسوان میں رکھی گئی۔ اس کا امکان ہے کہ غالب شکنی کا سبب علماء، شعرا و حکمائے سہسوان کا غیر مقلد ہونا بھی ہو۔ غالبؔ مائل بہ شیعت تھے اور سلفی مسلک کے پیروکاروں میں شیعت یا دوسرے مسلک کے پیروان کے لیے نرم گوشہ نہیں ہے۔ لیکن اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

غالبؔ کے مخالفین میں ایک نام علی بخش خاں شررؔ کا بھی ہے۔ شررؔ ۱۲۳۷ھ/ ۱۸۲۱ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے اور یہیں ۲؍مئی ۱۸۸۵ء کو وفات پائی۔ عربی و فارسی ادبیات کے منتہی تھے۔ سرکاری ملازمت بھی کی اور صدر الصدور کے عہدے تک پہنچے۔ فنِ مناظرہ میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ سر سیّد احمد خاں (ف ۱۸۹۸ء) کے مذہبی افکار کے رد میں تین رسالے باسم 'شہاب ثاقب'، 'تائید الاسلام' اور 'موید الاسلام' (مطبوعہ نولکشور

الحاج مولوی علی بخش خاں شرر بدایونی

(ماخذ: اعتقاداتِ سرسید و شرر بدایونی از محمد طیب بخش۔ بریلی ۱۹۸۵ء)

پریس، لکھنؤ، ۱۸۷۳ء) لکھے اور سرسیّد سے ایک عرصے تک پندرہ روزہ 'منشور محمدی' (بنگلور)، 'نورالآفاق' (کانپور)، 'نورالانوار' (کانپور) وغیرہ کے صفحات پر تحریری مناظرے کیے۔ سرسیّد نے ان کا دل جیتنے کے لیے 'خزینۃ البضاعۃ' کمیٹی کی ایک میٹنگ کی اور مذہبی تعلیم کی نگراں کمیٹی کو ازسرِنو تشکیل دیا۔ نئی کمیٹی کا کنوینر مولوی علی بخش کو بنایا۔ علاوہ مذکورہ صدر تین رسائل کے دیوانِ شرر (آگرہ، ۱۸۵۲ء)، تنقیح المسائل، قاعدۃ التدریس کتب بھی شائع ہوئیں۔ بہ حیثیت شاعر تذکرہ نادر وخم خانہ جاوید میں ان کا ترجمہ شامل ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں 'شعرائے بدایوں دربارِ رسول میں'، ص:۵۵ تا ۵۹)۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنے مضمون ''غالب سے معاصرین کی ادبی چھیڑ چھاڑ'' میں شررؔ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور انھیں غالبؔ کے مدمقابل کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''(شرر) خود کو غالبؔ کا مدمقابل سمجھتے تھے اور ان کے جواب میں ہم ردیف وہم قافیہ غزلیں لکھتے تھے''۔

(غالب اور عصرِ غالب، ص:۸۹)

ضیاء القادری نے لکھا ہے:

''مرزا غالب سے ہمیشہ شاعری میں چھیڑ چھاڑ رہی''۔

(اکمل التاریخ، ج ۱، ص:۶۶)

ڈاکٹر ایوب قادری نے مولف 'اکمل التاریخ' سے جب اس اجمال کی شرح چاہی تو انھوں نے اپنے مکتوب مورخہ ۳ر فروری ۱۹۶۹ء میں ایوب قادری کو تحریر فرمایا:

''اکمل التاریخ کو چھپے ہوئے پچپن سال کے قریب ہوگئے۔ اب مجھے کوئی تفصیل یاد نہیں ہے۔ کتاب لکھنے کے زمانہ میں مدرسہ قادریہ کا سارا کتب خانہ میرے سامنے تھا۔ مولوی علی بخش خاں مرحوم و مغفور کے خاندان کے ذخائر تک بھی رسائی تھی۔ کچھ قلمی مواد مولوی

حامد بخش مرحوم اور مولوی سراج الحق صاحب کے یہاں بھی تھا۔ اس ذخیرے میں کہیں یہ بات بھی لکھی تھی کہ مرزا غالبؔ اور مولوی علی بخش شررؔ سے شعر و شاعری میں چشمک اور چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ میں نے متعدد غزلیں غالبؔ کی زمین میں ان کے دیوان میں دیکھی تھیں۔ ان کا مطبوعہ دیوان میرے سامنے رہا تھا''۔ (غالب اور عصرِ غالب، ص:۸۸)

پروفیسر آل احمد سرور جن کے پیش نظر علی بخش خاں شررؔ کی قلمی بیاض رہی ہے اور وہ خود بھی اسی خانوادے کے فرد تھے، انھوں نے شررؔ کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ بات قابلِ غور ہے کہ اکثر غزلوں پر ہم طرح غزلیں ملتی ہیں۔ مصنف اکمل التاریخ نے لکھا ہے کہ 'مرزا غالبؔ سے ہمیشہ شاعری میں چھیڑ چھاڑ رہی' اس کا کوئی اور ثبوت نہیں مل سکتا...مگر غالبؔ کی غزلوں سے بہت پھیکی ہیں۔ ان میں ذوق کا رنگ زیادہ ہے''۔

(نئے اور پرانے چراغ، ص:۱۲۶)

غالبؔ کے قطعہ بند اشعار جو چکنی ڈلی سے متعلق ہیں، اسی زمین میں شررؔ نے بھی پیچوان کی رسید میں ایک قطعہ لکھا جو دیوانِ شرر (مطبوعہ اسعد الاخبار، آگرہ، ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۲ء) سے اخذ کر کے مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے دیوانِ غالب اردو (نسخۂ عرشی) میں نقل کیا ہے۔ اس قطعے کے چند اشعار آخری باب میں ملاحظہ فرمائیں۔

غالبؔ اور شررؔ کے مابین اس ادبی چشمک کی مزید تفصیل اور نوعیت کا علم نہیں ہو سکا، اب رہے غالبؔ کے مداح و معترف، تو ان میں ہمیں دو نام ملتے ہیں:

(۱) منشی انوار حسین تسلیمؔ سہسوانی

(۲) شاہ دلدار علی مذاقؔ بدایونی

تسلیمؔ سہسوانی (۲۹ رجون ۱۸۱۵ء - ۹ رمئی ۱۸۹۲ء) کی سہسوان میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد مراد آباد میں امین کے عہدے پر مامور رہے۔ بعد ازاں نواب رامپور کے دربار سے وابستہ ہو گئے، وہاں سے لکھنؤ پہنچے اور نولکشور پریس میں اردو

و فارسی کتب کی صحت کا کام ان کے سپرد ہوا۔ ''اودھ اخبار'' لکھنؤ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ تصنیف و تالیف سے بھی شغف تھا۔ فنِ تاریخ گوئی پر ملخّص تسلیم (مرادآباد، ۱۸۹۶ء) علمِ بیان و بدیع میں تاج المدائح (لکھنؤ، ۱۹۲۸ء) اور بعض دوسری کتب یادگار ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں انوار حسین تسلیم سہسوانی۔ از حنیف نقوی، آجکل، دہلی، نومبر ۱۹۵۸ء)۔

تسلیمؔ نے اپنی کتاب ملخّص تسلیم میں غالبؔ کا دو جگہ تعریف و توصیف کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ غالبؔ کا آٹھ شعر پر مشتمل ایک تاریخی قطعہ جو محسنؔ لکھنوی کے تذکرہ 'سراپا سخن' (طبع اول ۱۲۷۷ھ/ ۶۱-۱۸۶۰ء) کے لیے لکھا گیا تھا اور جو اس تذکرے کے صفحہ ۳۹۳ پر درج ہے، اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ (ملہم التاریخ، ص: ۱۷، اردو ترجمہ ملخّص تسلیم) دوسری جگہ جلالؔ لکھنوی (ف ۱۹۰۹ء) کے رسالہ ''افادہ تاریخ'' پر نقد کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا ہے:

> ''اسی حالتِ بے اختیاری میں جو تالیف کتاب کے وقت طاری تھی، غالبؔ و صہبائیؔ کو بہت برا کہا ہے۔ یہ وہی تعصب ہے جو بعض لکھنویوں کو دہلویوں سے ہوتا ہے۔ افسوس کہ یہ مرض لاعلاج ہے۔ حالاں کہ غالبؔ ہند میں اپنی نظیر آپ تھا''۔

(ملہم التاریخ، اردو ترجمہ ملخّص تسلیم، ص: ۷۵)

راقم الحروف نے ۱۹۸۱ء میں 'قاطع برہان' کا جواب لکھنے والوں میں تسلیمؔ کو شامل کیا تھا (دید و دریافت، ص: ۲۳) لیکن مذکورہ صدر رائے رکھنے والا 'قاطع برہان' کا جواب لکھنے والوں میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

تسلیمؔ کے صہبائی سے خاص مراسم تھے۔ غالبؔ سے مراسم کا علم نہیں، لیکن مرزا غالبؔ جب پہلی مرتبہ ۱۲۷۶ھ/ ۱۸۶۰ء میں رامپور آئے، تو اثنائے سفر، مرادآباد میں بھی رُکے، یہیں پر اُن کی ملاقات تسلیمؔ سہسوانی سے ہوئی۔ سہ ماہی 'العلم' کراچی (اپریل تا جون ۱۹۷۱ء) میں تسلیمؔ کے متعلق ان کے شاگرد مرزا احمد شاہ بیگ جوہرؔ کا ایک مضمون

شائع ہوا، مضمون نگار نے اطلاع دی:

> حضرت غالبؔ رامپور جاتے ہوئے مرزا مدار بیگ کے یہاں مرادآباد میں فروکش ہوئے۔ منشی صاحب مرحوم (مراد تسلیمؔ) ملنے گئے تو انھوں نے اپنی آمد کی تاریخ کی فرمائش کی۔ آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا:
>
> ''قادر سخنورے آمد... ۱۲۷۶ھ'' (ص۱۱۶)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے غالبؔ اور تسلیمؔ کی ملاقات کا مذکورہ صدر حوالے سے ذکر کرتے ہوئے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

> ''رامپور کے دورانِ سفر میں مرزا مرادآباد میں ٹھہرے تھے۔ مرزا لکھتے ہیں: 'بعد روانگی کے مرادآباد پہنچ کر بیمار ہوگیا۔ پانچ دن صدرالصدور صاحب کے یہاں پڑا رہا۔ انھوں نے تیمارداری اور غم خواری کی' (خطوطِ غالب، حصہ اول، ص:۲۱۷)۔ یہ صدرالصدور مولوی محمد حسن خاں بریلوی المتخلص بہ اسیرؔ (وفات تقریباً ۱۸۷۳ء) تھے، جو اُس زمانے میں وہاں صدرالصدور تھے۔ اسیرؔ اور غالبؔ سے خاصے تعلقات تھے''۔ (غالب اور عصرِ غالب، ص:۱۷۹)

ڈاکٹر قادری نے غالبؔ کے دوسرے سفر رامپور (۱۸۶۵ء) کو پہلے سفر رامپور (۱۸۶۰ء) سے متعلق کردیا ہے۔ مرزا پہلے سفر رامپور میں دہلی سے رامپور آتے ہوئے مرادآباد میں فروکش ہوئے تھے اور دوسرے سفر رامپور (۱۸۶۵ء) میں رامپور سے دہلی جاتے ہوئے مرادآباد میں پانچ دن قیام کیا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ یہ قیام دورانِ سفر ایک حادثہ پیش آجانے کے سبب تھا۔ (حادثے کی تفصیلات کے لیے دیکھیے 'ذکرِ غالب'، ص۹۶، ۹۷)۔ مرزا اس حادثے سے بچ کر مرادآباد پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور ایک مقامی سرائے میں رات بسر کی۔ اگلی صبح محمد حسن خاں اسیرؔ (ف ۱۸۷۳ء) صدرالصدور انہیں اپنے گھر لے گئے۔ مرزا نے وہاں پانچ دن قیام کیا۔ مرزا ہرگوپال تفتہؔ کے نام ایک خط مورخہ جنوری ۱۸۶۶ء میں غالبؔ نے اس واقعے کا تذکرہ کیا ہے۔ نواب کلب علی خاں کے نام خط نمبر:۱۶، مورخہ ۱۰رجنوری ۱۸۶۶ء میں بھی

انھوں نے اس حادثے کی اطلاع دیتے ہوئے اسیرؔ کے یہاں قیام کا تذکرہ کیا ہے۔
(غالب کے خطوط، ج ۳، ص: ۱۲۲۱)

مولانا حالیؔ نے 'حیاتِ جاوید' (حاشیہ ص: ۷۵) میں اور پروفیسر نثار احمد فاروقی نے حالیؔ کے حوالے سے تلاشِ غالب (ص: ۵۵) میں صدر الصدور سے مراد سر سیّد احمد خاں لیے ہیں۔ اور غالبؔ کا پانچ روزہ قیامِ مرادآباد؛ سر سیّد کے یہاں دکھایا ہے۔ لیکن نواب کلب علی خاں کے نام محولہ بالا خط میں صدر الصدور کے نام (مولوی محمد حسن خاں بہادر صدر الصدور) کے اعلان و اندراج کے بعد مولانا حالی اور فاروقی صاحب کے بیانات غلط ثابت ہوجاتے ہیں[۱]۔

محمد حسن خاں اسیرؔ، غالبؔ کے شاگرد مفتی سلطان حسن خاں احسنؔ (ف ۱۸۸۲ء) کے حقیقی چچا تھے۔ ان دونوں کا تعلق بدایوں کے علماء کے عثمانی خاندان سے تھا۔ غالبؔ کے معروف شاگرد قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی (ف ۱۹۰۰ء) بھی عثمانی خاندان ہی کے فرد تھے۔ لیکن بزرگوں کے بریلی میں متوطن ہوجانے کے سبب یہ بھی بریلوی مشہور ہوگئے۔ محمد حسن خاں اسیرؔ اور جنونؔ کا خاندان مفتی درویش محمد (ف ۱۷۶۹ء) کی اولاد میں تھا، جن کا شجرۂ نسب بدایوں کے عثمانی علماء کی خاندانی تاریخ 'اکمل التاریخ' (ج ۱، ص: ۳۰) میں مع ترجمہ درج ہے۔

اسیرؔ کے والد مولوی ابوالحسن حسنؔ عدالت محکمہ افتاء بریلی میں فائز تھے۔ صدر الصدور کے عہدے تک پہنچے۔ انھوں نے مستقل طور پر بریلی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اسیر کا مولد بدایوں تھا یا بریلی، اِس کے متعلق علم نہیں، البتہ وہ بریلی ہی میں رہے۔ ملازمت میں ترقی کرتے ہوئے وہ بھی صدر الصدور کے عہدے تک پہنچے۔ منصب افتاء پر فائز رہنے کے سبب بریلی میں یہ لوگ مفتی کہلائے اور ان کا خاندان

---

[۱] حالی کی یہ روایت اتنی معروف ہوگئی ہے کہ بڑے بڑے محققین دھوکا کھا جاتے ہیں۔ خطوط غالب کا تحقیقی مطالعہ (۱۹۸۱ء) کے مصنف ڈاکٹر کاظم علی خاں نے اپنے ایک مقالے "غالب اور علی گڑھ" (غالب نامہ دہلی، جنوری ۱۹۹۶ء، ص: ۳۴۷) میں بھی صدر الصدور سے مراد سر سید احمد خاں لے لیے ہیں اور حیاتِ جاوید کی پوری روایت اپنے الفاظ میں درج کردی ہے۔

'خاندانِ مفتیان' کے نام سے موسوم ہوا۔

اسیرؔ کا شمار عثمانی خاندان کے علماء میں تھا۔ باوجود ملازمت کے، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا بھی مشغلہ جاری رہا۔ اردو و فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ مختلف علوم پر متعدد کتب یادگار ہیں۔ (اکمل التاریخ، ج ۱/، ص: ۴۳) فارسی و اردو کلام کا مجموعہ ''چمنستانِ سخن'' (مطبع رفاہِ عام، گورکھپور، ۱۹۰۸ء) شائع ہو چکا ہے۔ اسیرؔ نے غالبؔ کی وفات پر ایک قطعہ کہا تھا جو حسبِ ذیل ہے:

غالب کہ بود پیر مغانِ سخنوری　　　ایں دہر چو بدارِ سلامت گرفت آہ

ساغر شکست و میکدۂ شعر شد خراب　　　مینا گریست زار کہ 'غالب بمرد آہ'

۱۲۸۵ھ

(چمنستانِ سخن، ص: ۲۱ بحوالہ 'غالب اور عصرِ غالب'، ص: ۲۴۲)

اسیرؔ اور غالبؔ کے تعلق کی ہنوز وضاحت نہیں ہو سکی ہے۔ اسیرؔ کی علمی حیثیت، دنیاوی منصب اور خاندانی عظمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ امکان بعید از قیاس نہیں کہ وہ غالبؔ کے مکتوب الیہ بھی رہے ہوں۔

غالبؔ کے بدایونی مداحوں میں دوسرا نام شاہ محمد دلدار علی مذاقؔ بدایونی (۲۹/ دسمبر ۱۸۱۹ء - ۱۱/ اکتوبر ۱۸۹۴ء) کا ہے جو ذوقؔ دہلوی (ف ۱۸۵۴ء) کے ممتاز شاگرد تھے۔ مذاقؔ ۱۸۳۶ء میں ذوقؔ کے شاگرد ہوئے، صوفی منش انسان تھے۔ ذکر و شغل میں مشایخانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ سیر و سیاحت بھی کی۔ مذاقؔ کا بوجہ تلمذ محمد ابراہیم ذوقؔ اور زیارت بزرگانِ دین اکثر دہلی آنا جانا رہتا تھا، جہاں وہ صاحبانِ علم و ادب سے بھی ملاقات کرتے ہوں گے۔ ان کے پرپوتے اور سوانح نگار ابرار علی صدیقی نے لکھا ہے:

> ''دہلی میں استاد ذوقؔ کے ساتھ شہر اور قلعہ کے مشاعروں میں بھی شرکت کا اتفاق ہوا۔ اس کے علاوہ مومنؔ اور غالبؔ کی صحبتیں اُٹھائیں۔ جب بھی دہلی جانا ہوتا ان سے بھی ضرور ملنے جاتے۔ یہ دونوں حضرات بھی آپ سے خصوصی محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ چنانچہ آپ ان پُر خلوص ملاقاتوں کا اس طرح ذکر فرماتے ہیں:

ناسخ و آتش ہے نہ ذوق و نصیر　　مومن و غالب کی وہ سنگت نہیں
کیونکہ ہو یاروں سے اب صحبت برار　　اگلے سے وہ یار وہ صحبت نہیں''

(آئینۂ دلدار، ص: ۱۲۶)

مرزا غالب نے مذاق کے اس شعر کی بقول ابرار علی صدیقی بے حد تعریف فرمائی:

مرتے ہیں ہر دم لب جاں بخش پر　　ہم کو تو مرنے کی بھی فرصت نہیں

(آئینہ دلدار، ص: ۱۲۶)

ابرار علی نے مذاق کے احباب میں منجملہ مولانا فضل حق خیرآبادی (ف ۱۸۶۱ء) مفتی صدرالدین آزردہ (ف ۱۸۶۸ء)، مولانا فیض الحسن ادیب (ف ۱۸۸۷ء)، مومن خاں مومن (ف ۱۸۵۲ء)، مولانا محمد حسین آزاد (ف ۱۹۱۰ء) وغیرہم کے مرزا غالب کا نام بھی درج کیا ہے۔ (ص: ۷۶) غالب اور مذاق کے مابین احباب جیسا ربط وتعلق تھا کسی دوسرے ماخذ سے اس کی تصدیق نہیں ہوئی۔ میرے خیال میں یہ تعلق خُرد اور بزرگ ہی کا رہا ہوگا۔ جیسا کہ غالب کے فارسی خط بنام مفتی سیّد احمد خاں سیّد (ف ۱۸۵۹ء) سے ظاہر ہے جس میں غالب، مذاق بدایونی کا نام محبت کے ساتھ درج کرتے ہیں مگر مشفقی اور سلمہ اللہ تعالیٰ کے اضافے کے ساتھ۔ (آئینہ دلدار، ص: ۹۲، ۹۳) یہ ایک طویل خط ہے جو غالب کے فارسی مکتوبات میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ صاحبِ 'آئینہ دلدار' نے ''ملفوظات، طیبات مذاق میاں'' (مرتبہ اخیار علی بدایونی، مطبوعہ امیر الاقبال پریس، بدایوں، سالِ اشاعت ندارد) سے اخذ کر کے اسے شاملِ سوانح کیا ہے۔ (ص: ۹۱، ۹۲) اس خط کے مضمون کے پس منظر کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

> ''مفتی سیّد احمد خاں صاحب بریلوی نے ایک مرتبہ اپنے استاد مرزا غالب کو خط لکھا، جس میں اصلاح کے لیے کچھ غزلیں وغیرہ بھی ارسال کی تھیں۔ اتفاق سے خط لکھتے وقت مذاق میاں بھی وہاں موجود تھے۔ بربنائے تعلقات آپ نے (مراد مذاق میاں) مرزا صاحب کو سلام لکھوادیا۔ مرزا غالب اس زمانے میں نہایت عدیم الفرصت تھے کیوں کہ وہ 'تاریخ فرمانروایانِ خاندانِ تیموریہ' کی ترتیب وتالیف میں

بے حد منہمک تھے، اس لیے جواب میں تاخیر ہوئی۔ بالآخر مرزا صاحب نے سیّد صاحب کو اس تاکید کے ساتھ خط لکھا کہ تم میاں مذاقؔ سے مشورۂ سخن کیوں نہیں کرتے اور آخر میں مذاقؔ میاں کو مشفقانہ انداز میں سلام بھی لکھا"۔ (آئینۂ دلدار، ص: ۱۲۸، ۱۲۹)

اس خط کی وہ عبارت جو مذاقؔ میاں سے متعلق ہے، حسبِ ذیل ہے:

"دل بہ نثر آنچناں بستہ ام کہ بہ نظم توانم پرداخت۔ مشفقی مولوی محمد دلدار علی صاحب مذاقؔ کہ بدانست بندہ در معنی آفرینی باسلطان الشعرا شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ برابرو بہ اعتقاد خویش شاگرد آں دیرینہ سخنور اند۔ آخر نہ ہمدم و ہم نشیں آں والا گہر اند۔ چرا با ایشاں در سخن مشورت نرود۔ مشورت در سخن ننگ نیست۔ غلط کاران استادی و شاگردی را دور بردہ اند۔ نزد بندہ ہم زبانے و ہم نفسے پیش نیست۔ نامہ نگار شاگردان خویش را ہمدم و ہم رازی شمرد و ہرگز بچشم کم دراناں نمی نگرد۔ اوستاد چرا باخود بالدو شاگرد چرا فروتنی کند۔ ہر کہ در راہِ دوگام از خود پیش است رہنما بودنش بجائے خویش است...

مشفقی مولوی محمد دلدار علی صاحب مذاقؔ سلمہ اللہ تعالیٰ سلام خوانند۔

والسلام مع الاکرام۔

از اسد اللہ نگارشتہ پنجشنبہ سوم اکتوبر ۱۸۵۰ء"

(آئینۂ دلدار، ص: ۹۲، ۹۳)

مذکورہ صدر اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ غالبؔ کی نظر میں مذاقؔ کی کیا اہمیت تھی۔ ابرار علی صدیقی نے غالبؔ سے مذاقؔ کی ملاقات کا ایک واقعہ بھی درج کیا ہے جو ظاہر ہے خاندانی روایت پر مبنی ہے۔ لیکن ابرار علی نے جس احتیاط، سلیقے اور حوالوں کے ساتھ ان کی سوانح مرتّب کی ہے اس سے غلط بیانی کا کوئی ظاہری امکان نظر نہیں آتا۔ واقعہ حسبِ ذیل ہے۔ ابرار علی نے لکھا ہے:

"ایک دفعہ مذاقؔ میاں صاحب کا دہلی جانا ہوا تو حسبِ معمول

مرزا غالبؔ کے یہاں بھی گئے۔ دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ اس وقت وہاں آپ ہی کا ذکرِ خیر ہو رہا تھا۔ مرزا غالبؔ کے بعض احباب اور شاگرد بھی موجود تھے اور وہ ان لوگوں سے کہہ رہے تھے 'استاد ذوقؔ کو تو بنا بنایا شاگرد ہاتھ آ گیا'۔ غرض اجازت پا کر آپ اندر مکان میں داخل ہوئے۔ مرزا غالبؔ نے آپ کو اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور حسبِ عادت محبت آمیز انداز میں آپ کی طرف دیکھ کر کہنے لگے: 'بھتیجے تمھارے سر کے بالوں کو دیکھ کر مجھے وحشت ہوتی ہے'۔ مذاقؔ میاں کی عمر اس وقت تقریباً ۲۲، ۲۳ سال کی تھی۔ سر پر گھنے گھونگریالے بال تھے جو بہت خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔ الغرض آپ نے ادب کے ساتھ جواب دیا کہ 'چچا بال تو میرے سر پر اور وحشت آپ کو ہوتی ہے کچھ سمجھ میں نہیں آیا'۔ مرزا غالبؔ اس جواب سے بہت خوش اور محظوظ ہوئے پھر مسکراتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا اور کہا 'میاں سنو! ہم نے گیسو، ببریاں اور کاکل رکھے، اس کے بعد اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ مگر جو منڈے سر میں آرام ہے وہ کسی حال میں نہیں''۔

(آئینہ دلدار، ص:۱۲۸)

مذاقؔ کی پیدائش ۲۹ر دسمبر ۱۸۱۹ء کو ہوئی۔ غالبؔ سے ملاقات کے ایام میں ان کی عمر تخمیناً ۲۲، ۲۳ سال درج کی گئی ہے اس اعتبار سے یہ ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۳ء کا واقعہ قرار پاتا ہے۔ غور طلب یہ بھی ہے کہ کیا اس وقت مرزا نے اپنے سر کے بال منڈا دیے تھے۔ مالک رام نے لکھا ہے:

''جوانی میں داڑھی منڈاتے اور سر پر پٹھے رکھتے تھے، جب کہولت کا زمانہ آیا اور داڑھی مونچھ میں سپید بال آ گئے تو داڑھی منڈانا ترک کر دی... جس دن داڑھی بڑھائی اسی دن سر منڈایا''۔

(ذکرِ غالب، ص:۱۵۷، ۱۵۸)

دیبی پرشاد سحر

(ماخذ: تذکرہ شعراے بدایوں، ج/۱، از شہید حسین، کراچی ۱۹۸۷ء)

(تذکرے میں یہ فوٹو ٹکٹ سائز میں دیا گیا ہے)

گویا اس ملاقات کے وقت مرزا کی عمر کم وبیش ۴۵، ۴۶ سال کی رہی ہوگی اور اس عمر میں مرزا نے اپنا حلیہ بدل لیا تھا۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے 'آئینہ دلدار' اور 'شعرائے بدایوں - دربارِ رسول میں' ص:۷۲ تا ۷۸)

غالبؔ کے وہ معاصرین اور تلامذہ جو بدایوں یا اطراف بدایوں سے تعلق رکھتے تھے، ان کی غالبؔ سے متعلق کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گزری۔ گمان ہے کہ غالبؔ کی وفات پر تاریخی قطعات کہے گئے ہوں گے، مرثیے بھی لکھے گئے ہوں گے لیکن یہ بات ہمارے علم و اطلاع میں نہیں ہے۔ غالبؔ کے ایک معاصر ادیب منشی دیبی پرشاد سحرؔ (ف ۱۹۰۲ء) کے تین قطعات ملتے ہیں جو ان کے دیوان، دیوانِ سحرؔ ملقب بہ سحر سامری (مطبوعہ نولکشور پریس، لکھنؤ، ستمبر ۱۸۸۱ء) میں شامل ہیں۔ قطعات حسبِ ذیل ہیں:

حیف کہ غالب ز جہاں رخت بست   بود یکے شاعر با حلم و فضل
مرد چو او ایں ہمہ بے جان شدند   شعر و سخن، نشر و ہنر، علم و فضل

۵۰۰ + ۱۱۰ + ۴۵۰ + ۲۰۵ + ۱۱۰ + ۱۱۰ = ۱۲۸۵ھ

آخری مصرعے میں مستعمل ہر لفظ، شعر، سخن، نشر، ہنر، علم، فضل میں ہر ایک لفظ کے بیچ کا حرف (مثلاً شعر میں ع، سخن میں خ وغیرہ) کے اعداد ساقط کیے جائیں گے اور واو عطف کا عدد بھی شمار نہیں ہوگا۔ تب سنہ برآمد ہو سکے گا۔

تھا شاعر نامی یہی اب دنیا میں   افسوس یہ ہے کہ مرگیا غالب بھی
ہے سحرؔ یہ مصرعہ مرے لب پر جاری   'دنیا سے آج چل بسا غالب بھی'

۱۲۸۵ھ

مرگیا غالب جو لافانی تھا شاعر ہند میں   لے گیا دنیائے دوں سے حسرتیں کیا کیا دریغ
فکر میں اے سحرؔ میں بیٹھا ہوا تھا ناگہاں   یہ ندا آئی فلک سے ''وائے واویلا دریغ''

۱۲۸۵ھ

(سحر سامری، ص:۷۲)

نواب ظہور اللہ خاں نوآ بدایونی (۱۷۶۴-۱۸۳۰ء) حکیم بقاء اللہ بقآ کے نامور شاگرد تھے۔ قصیدہ نگار اور فارسی گو کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ جرأتؔ و شاگردانِ جرأتؔ سے شاعری میں چھیڑ چھاڑ رہی اور نوبت ہجویات تک جا پہنچی۔ عرصے تک لکھنؤ میں قیام کیا۔ اُن کی خاندانی تاریخ باسم تاریخ بنی حمید (قلمی) میں اُن کا ترجمہ شامل ہے، جس میں ان کی مدح میں کہے گئے غالبؔ کے تین فارسی شعر بھی نقل کیے گئے ہیں۔ غالبؔ سے متعلق دستیاب مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتب اور معاصر ماخذ میں یہ اشعار نہیں ملتے۔ اس لیے ان اشعار کی غالبؔ سے نسبت محقق نہیں۔ بالفرض انھیں غالبؔ کا طبع زاد مان بھی لیا جائے تو ان اشعار کا زمانۂ تصنیف غالبؔ کا 'قیامِ لکھنؤ' کا زمانہ رہا ہوگا۔ غالبؔ سفرِ کلکتہ کے دوران لکھنؤ میں تقریباً آٹھ ماہ قیام پذیر رہے تھے۔ (اواخر اکتوبر یا اوائل نومبر ۱۸۲۶ء تا ۲۱ رجون ۱۸۲۷ء) اور اس مدت میں وہ مستقل بیمار رہے تھے۔ اس زمانے میں نوآ کا قیام بھی لکھنؤ میں رہا ہوگا کیونکہ تذکرہ نویسوں اور تاریخ بنی حمید کے بقول نوآ سفرِ ایران (۱۸۱۰ء) کے بعد کچھ مدت دکن میں رہ کر واپس لکھنؤ آ گئے تھے۔ یہ امکان ہے کہ غالبؔ کی مزاج پرسی کے لیے نوآ بھی حاضر ہوئے ہوں اور غالبؔ نے نوآ کی قصیدہ گوئی، مثنوی نگاری اور مزاج کے عُجب کے بارے میں جو کچھ سن رکھا ہو یا پہلے سے کچھ مراسم رہے ہوں اسی کی روشنی میں فی البدیہہ چند شعر موزوں کر دیے ہوں۔ بعد میں یہ روایت اُن کے خاندان کے بزرگوں تک محفوظ رہ گئی ہو۔ واللہ اعلم۔ اشعار حسبِ ذیل ہیں:

نوائے بدایونی آں پُرغرور — کہ از صحبتِ خلق دارد نفور
قصیدہ بہ طرز نوی می نوشت — ازو خوب تر مثنوی می نوشت
بانداز صائب کلامش ہمہ — ازاں خوب تر التیامش ہمہ

(تاریخ بنی حمید، قلمی، ص:۳۵)

بابِ دوم

بدایوں اور تلامذۂ غالب

رشکی — قاضی محمد عنایت حسین بدایونی

(ماخذ: تلامذہ غالب، مالک رام، دہلی ۱۹۸۴ء)

غالبؔ کے تلامذہ

غالبؔ کے بدایونی شاگردوں میں حسب ذیل آٹھ نام ملتے ہیں:

۱- رشکیؔ (فراقؔ) قاضی عنایت حسین

۲- زکیؔ نواب سیّد محمد زکریا خاں

۳- صادقؔ (عزیزؔ) مولوی محمد عزیز الدین

۴- مدہوشؔ منشی سخاوت حسین

۵- فداؔ (جمالیؔ) حکیم سیّد احمد حسن

۶- مائلؔ میر عالم علی خاں

۷- وفاؔ (طالبؔ) میر ابراہیم علی خاں

۸- منشی آغا علی سہسوانی

مالک رام کی تالیف 'تلامذۂ غالب' (طبعِ دوم) میں مذکورہ تلامذہ کے احوال و کوائف اور کلام محفوظ ہوگیا ہے۔ 'تلامذۂ غالب' (طبعِ اول) کی اشاعت کے بعد مختلف اہلِ قلم نے مالک رام کے اس کام کا جائزہ لیا۔ پیش کردہ احوال وکوائف کی تنقیح، تردید

اور تصحیح کی۔ ان حالات کو مزید بہتر صورت میں مرتب کرنے، نامکمل معلومات کی وضاحت و صراحت کے لیے اس پر اضافے بھی کیے گئے۔ تقریباً ایک درجن سے کچھ زائد مضامین لکھے گئے۔

بدایونی تلامذہ کے سلسلے میں راقم الحروف نے ۱۹۸۱ء میں 'غالب بدایوں میں' عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا (مشمولہ 'دید و دریافت' ص: ۲۲ تا ۶۴) بعد ازاں ۱۹۸۲ء میں 'غالبؔ کے چند سہسوانی تلامذہ' (مشمولہ قومی زبان، کراچی، جنوری ۱۹۸۳ء) مضمون لکھا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے تلامذۂ غالب کے دونوں ایڈیشنوں پر جو مضمون نما تبصرے لکھے:

☆ 'تلامذۂ غالب پر ایک نظر' دو ماہی اکادمی، لکھنؤ، جنوری، فروری ۱۹۸۳ء

☆ 'تلامذۂ غالب طبعِ ثانی پر ایک نظر' دو ماہی اکادمی، لکھنؤ، جولائی، اگست ۱۹۸۶ء

ان میں سہسوانی تلامذہ کے متعلق اضافے اور تصحیحات پیش کیں۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم نے اپنے مختلف مضامین میں غالبؔ کے بعض بدایونی تلامذہ کا تعارف پیش کیا اور ان کے بارے میں اہم معلومات کا اضافہ کیا۔ یہ مضامین ان کی کتاب 'غالب اور عصرِ غالب' میں شامل ہیں۔

مالک رام نے طبعِ دوم میں مذکورہ صدر تحریروں سے استفادہ کیا۔ لیکن جیسا کہ ان کا طریق کار تھا کہ وہ ترجمہ کے آخر میں سارے ماخذ کا ایک جگہ اندراج کر دیتے تھے جس سے قاری یہ نہیں جان سکتا تھا کہ کون سی بات و معلومات کس مصدر و ماخذ سے اخذ کی گئی۔ غالبؔ کے بدایونی تلامذہ کے متعلق انھوں نے بعض جگہ غیر ضروری تفصیل اور بعض جگہ غیر ضروری تلخیص پیش کی اور بعض اختلافی باتوں کو بوجوہ درج ترجمہ نہیں کیا۔ معلومات کی تنقیح بھی نہیں کی اور یہ شاید ان کے لیے ممکن بھی نہیں تھا۔ ان تلامذہ کے نام غالبؔ کے خطوط سے بھی انھوں نے ماخذ کے طور پر استفادہ نہیں کیا۔ چنانچہ بعض باتیں ان ترجموں میں غلط درج ہو گئیں اور بعض محلِ نظر ہیں۔

راقم الحروف نے ان تلامذہ کے دستیاب جملہ ماخذ پیش نظر رکھتے ہوئے ازسرِ نو ان کے حالات سپردِ قلم کیے ہیں۔ تسلسل کے خیال سے مالک رام کی پیش کردہ معلومات کو بھی تحریر میں سمو دیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس سلسلے کی تمام وکمال دستیاب معلومات کا احاطہ کرتے ہوئے ان تلامذہ کی غالبؔ سے نسبت کو متحقق طور پر آشکارا کیا جائے۔

رشکیؔ (فراق) قاضی محمد عنایت حسین:

شیوخ صدیقی کی شاخ بنو حمید میں ۱۵رشوال ۱۲۴۷ھ/ ۱۸رمارچ ۱۸۳۲ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ (تلامذۂ غالب، ص:۴۴۶) ان کے بزرگ شیخ حمیدالدین مخلص گنوری سبزواری (۱۱۸۹ء- ۱۳۱۲ء) جو حضرت محمد بن ابوبکر صدیقؓ کی اولاد میں شمار کیے جاتے ہیں، خاندانی روایت کے مطابق غیاث الدین بلبن کے عہدِ حکومت (۱۲۶۲ء تا ۱۲۸۷ء) میں وارد بدایوں ہوئے۔ ان بزرگ کی نسبت سے یہ خاندان حمیدی کہلایا۔ شیخ حمیدالدین کے بیٹے شیخ صدرالدین (ف ۱۳۴۶ء) بدایوں کے قاضی ہوئے۔ شیخ حمید، شیخ سعدیؒ کے برادرِ عم زاد تھے اور امیر خسروؔ کے استاد (تاریخ بنی حمید، قلمی، ص:۹) فارسی تاریخوں یا سعدی و امیر خسروؔ سے متعلق کتب میں اس رشتے کا مذکور نہیں۔ لہٰذا 'تاریخ بنی حمید' کا یہ انکشاف توجہ طلب ہے۔

رشکی کا خاندان علم وفضل میں ممتاز تھا۔ علماء میں شیخ افضل محمد جنھوں نے مشہور تفسیر 'بحر مواج' پر حاشیہ لکھا۔ قاضی بدرالدین جنھوں نے 'صدرا' پر حاشیہ لکھا جو اُن کے نام سے 'بدرا' مشہور ہوا۔ عہدِ عالمگیری کے معروف عالم قاضی محمد جلیس (ف ۱۷۰۶ء) مرید شیخ معصوم سرہندی، شیخ خلیل اللہ (ف ۱۷۱۰ء) جامع فتاویٰ عالمگیری اسی خاندان کے فردِ فرید تھے۔ (تاریخ بنی حمید، قلمی، ص:۲۰ تا ۲۴)۔

شعرا میں شیخ معین الدین معینؔ و فائقؔ (ف ۱۷۶۰ء) تلمیذ سودا، نواب ظہوراللہ خاں نواؔ (ف ۱۸۳۰ء) تلمیذ بقاء اللہ بقاؔ، مذاق بدایونی (ف ۱۸۹۴ء) تلمیذ ذوقؔ، شفاعت بدایونی (ف ۱۸۷۱ء)، مجاہد آزادی اشرف علی نفیسؔ (ف ۱۸۵۸ء) کے نام

ممتاز ہیں۔

رشکی کے نانا قاضی عبدالسلام عباسی (ف ۱۸۷۲ء) اپنے دور کے نامور عالم تھے۔ شاعری سے بھی شغف تھا۔ سلاؔم تخلص کرتے تھے۔ صاحب تصانیف تھے، قرآن کی منظوم تفسیر 'زاد الآخرت' (۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ء) یادگار ہے۔ چنانچہ رشکی نے بھی اپنے خاندانی علم و فضل کا وافر حصہ وراثت میں پایا۔

رشکی کے والد کا نام از روے شجرہ خاندانی نقی الدین تھا (تاریخ بنی حمید، انشاء اللہ، ص: ۳۵) جس زمانے میں یہ تاریخ مرتّب ہوئی رشکی کے والد حیات تھے اور وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ مالک رام نے ان کا نام محمد نقی حمیدی (تلامذۂ غالب، ص: ۲۴۶) اور عبدالرزاق راشد حیدر آبادی نے ان کا نام علی نقی الدین لکھا ہے۔ (دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ص: ۱۴۴، طبعِ دوم) جو از روے شجرۂ خاندانی غلط ہے۔

رشکی نے حسب مروجہ تعلیم کا آغاز کیا۔ ناظرہ خوانی کے بعد حفظ قرآن کیا۔ فارسی کی کتابیں اپنے والد سے اور عربی کی مروّجہ کتب اپنے نانا سے پڑھیں۔ نظم نویسی و نثر نگاری میں عمدہ لیاقت پیدا کی۔ بعد میں وکالت کا امتحان دے کر درجۂ اعلیٰ کی سند حاصل کی۔

رشکی نے ملازمت کا آغاز بدایوں میں سرکار انگریزی میں سر رشتہ دار عدالت سے کیا۔ کچھ مدت بعد اسے ترک کیا اور نواب محمد علی خاں والیِ ٹونک (ف ۱۸۹۵ء) کی ملازمت و مصاحبت اختیار کی۔ جب دسمبر ۱۸۶۷ء میں انگریزی سرکار نے نواب کو معزول کر کے بنارس میں نظر بند کر دیا تو رشکی نے بھی حقِ رفاقت ادا کیا۔ ۱۸۸۱ء تک بنارس میں ان کے قیام کا پتا چلتا ہے۔ بنارس میں وہ نواب ٹونک کے داروغہ کارخانہ جات رہے۔ (تذکرۂ بہار بوستان شعرا، ص: ۳۳۳) بنارس میں قیام کے دوران انھوں نے بہ سلسلۂ ملازمت (غالباً ۱۸۷۲ء) لاہور کا ایک سفر بھی کیا اور وہاں مولانا حالی سے ملے۔ (دیباچہ مرآۃ الخیال، ص: ۶) واپسی پر سہارنپور میں قیام کیا جہاں عبدالحئی بیخودؔ بدایونی (ف ۱۹۱۲ء) کے بڑے بھائی اعجاز احمد وکیل کو حالی سے ملاقات کی روداد اور ان

کا کچھ کلام سنایا۔ بیخودؔ کا لڑکپن تھا۔ وہ حالیؔ کا کلام سن کر ان کے گرویدہ ہوگئے اور جلد ہی ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ بیخودؔ نے رشکیؔ کو اپنا خالہ زاد شفیق بھائی لکھا ہے۔
(دیباچہ مرأۃ الخیال، ص:۶)

رشکیؔ بنارس میں چند سال گزار کر بدایوں واپس آ گئے اور وکالت کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۸۸۳ء میں حیدرآباد گئے اور وہاں وکالت کی بساط جمانے میں کامیاب رہے۔ فروری ۱۹۰۷ء سے ستمبر ۱۹۰۸ء تک ایک سال چند ماہ جودھپور میں رہے۔ (بیاض مونس نظامی میں درج تاریخوں کی بنیاد پر) ۱۲؍ستمبر ۱۹۰۸ء کے بعد حیدرآباد آ گئے۔

ستمبر ۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی میں طغیانی آئی جس کی زد میں ان کا گھر بھی آ گیا۔ تمام اسباب نذرِ سیلاب ہوگیا۔ ظفر علی خاں نے اس موقعے پر ایک نظم کہی تھی، جس کا ایک شعر نقل کیا جاتا ہے:

اے نامراد ندی تجھ پر غضب خدا کا
الٹا ہے تو نے تختہ یارانِ میکدہ کا

مالک رام نے 'دکن ریویو' نومبر ۱۹۰۸ء کے حوالے سے تاریخِ طغیانی، حیدرآباد دکن غرق شد (=۱۹۰۸ء) درج کی ہے۔ (تلامذۂ غالب، ص:۶۴۴) لیکن پروفیسر نثار احمد فاروقی نے طغیانی کے اس سنہ پر شبہ ظاہر کیا ہے۔ (تلاشِ غالب، ص:۲۹۶) لیکن صحیح سنہ کا اندراج کرنے سے وہ بھی قاصر رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جودھپور کا قیام عارضی تھا۔ مال و اسباب، حیدرآباد کے گھر ہی میں محفوظ رہا ہوگا جو طغیانی کی نذر ہوگیا۔

ستمبر ۱۹۰۸ء کے بعد حیدرآباد سے وہ بدایوں واپس آ گئے اور عدالت دیوانی میں وکالت کرتے رہے۔ حیدرآباد سے واپسی کی وجہ جہاں مال و اسباب کا ضیاع تھا وہیں اپنے پیر سے قربت کی تمنا بھی تھی۔ ان کی طبیعت پر تصوف کا غلبہ تھا اور وہ پیر سے قربت کے متلاشی رہتے تھے۔ خواجہ اللہ بخش تونسوی (۱۸۲۳ء-۱۹۰۱ء، نبیرہ خواجہ سلیمان تونسوی) سے بیعت تھے۔ خواجہ سلیمان (ف ۱۸۵۰ء) کی شان میں ہر سال عرس کے موقعے پر منقبت کہتے تھے۔ ایک منقبت کا مقطع ہے:

سال پورا ہوا رشکی ہے پریشاں اب تک
یہ نہ تھا اس کو گماں خواجہ سلیماں فریاد

۱۹۱۲ء میں دوبارہ عازمِ دکن ہوئے اور حیدرآباد پہنچ کر جام باغ محلے میں سکونت پذیر ہوئے (دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ص: ۴۱۴)۔ ۱۹۱۸ء میں بدایوں آگئے اور یہیں ۶رصفر ۱۳۳۷ھ/ ۱۲رنومبر ۱۹۱۸ء کو انتقال کیا (مقدمہ تجلیاتِ سخن، ص:۲۹)۔ حضرت سیّد احمدؒ کی درگاہ واقع ساگرتال میں مدفون ہوئے۔

رشکی کی زوجۂ اول سے ایک بیٹی تھی۔ زوجۂ ثانی سے دو بیٹے عطا حسنین، حبیب الحسنین عرف محمد اکبر حسین پیدا ہوئے۔ موخرالذکر بھی وفات پا چکے ہیں۔ ان کی اولاد محلّہ سوتھا میں سرخ شہیدؒ کے مزار کے متصل سکونت پذیر ہے۔

رشکی پرانی وضع قطع کے آدمی تھے۔ حافظِ قرآن، حاجی الحرمین، بزرگانِ دین سے عقیدت رکھنے والے۔ چہرے پر خوش نما داڑھی تھی۔ کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا جو دستبردِ زمانہ کی نذر ہوگیا۔ ان کے بیٹے اکبر حسین میرے بدایوں والے گھر 'روشن محل' سے متصل ہی رہتے تھے۔ راقم الحروف نے ۱۹۸۱ء میں اکبر حسین کی اولاد کے پاس اورنگ زیبؒ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآنِ کریم کا ایک نسخہ دیکھا تھا جو بعد میں کسی کتب فروش کے ہاتھ خاصی قیمت پر فروخت کردیا گیا۔ راقم الحروف کے اصرار پر انھوں نے مجھے رشکی کا ایک فوٹو عنایت کیا جو مالک رام صاحب کو بھیج دیا گیا اور 'تلامذۂ غالب' (طبعِ دوم) میں شامل ہوا۔

عبدالرزاق راشد حیدرآبادی کو رشکی کی ایک بیاض کہیں سے دستیاب ہوئی جس میں غالبؔ کے چار شعر ایسے نقل ہوئے ہیں جن کا اندراج متداول دیوان اور اس کے کسی قلمی نسخے میں بھی نہیں ملتا۔ لہٰذا عرشی صاحب اور کالی داس گپتا رضا نے اپنے مرتّبہ دیوانوں میں رشکی کی بیاض کے حوالے سے اس کلام کو بھی شامل کیا ہے۔ راشد حیدرآبادی کا بیاض سے متعلق تعارفی مضمون رسالہ 'تحفہ' حیدرآباد (شمارہ ۸-۹، شعبان، رمضان ۱۳۴۴ھ/ فروری، مارچ ۱۹۲۶ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے رشکی کے مختصر حالات بھی درج کیے تھے۔

رشکی غالبؔ کے کب شاگرد ہوئے، اس بارے میں کہیں کوئی صراحت نہیں ملتی۔ راشد حیدر آبادی نے لکھا ہے:

> ''کچھ عرصے تک ریاست ٹونک میں ملازم رہے۔ اسی مقام پر مرزا غالبؔ سے تلمذ اختیار کیا۔ جب کہ والی ٹونک کی خواہش پر (غالبؔ) ان سے ایک دو دفعہ ملنے گئے تھے''۔

('تحفہ' حیدر آباد بحوالہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ص: ۴۱۴)

غالبؔ کے سفرِ ٹونک کا کوئی تحریری ثبوت نہیں۔ البتہ اس تحریر سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ رشکی نے قیامِ ٹونک کے زمانے میں غالبؔ سے تلمّذ اختیار کیا ہو۔ ظاہر ہے یہ مدت دسمبر ۱۸۶۷ء والی ٹونک کے معزول ہونے سے قبل ہی کی رہی ہوگی۔ غالبؔ کا ان کے نام کوئی خط اور غالبؔ کے خطوط میں ان کا نام کہیں بھی نظر سے نہیں گزرا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالبؔ کے آخری دور کے شاگرد ہیں۔ غالبؔ کی وفات (۱۸۶۹ء) کے بعد انھوں نے شاہ دلدار علی مذاقؔ بدایونی (ف ۱۸۹۴ء) سے اصلاح لی اور غالباً انھی کے ایما پر رشکیؔ تخلص ترک کر کے فراقؔ تخلص اختیار کیا۔ مذاقؔ کے شاگردوں کے تذکرے 'بہار بوستانِ شعرا' (ص: ۳۲، ۳۳) میں ان کا ترجمہ فراقؔ تخلص کے تحت ہی درج ہے۔ اس تذکرے میں اشکی سہوِ کتابت ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے 'تلاشِ غالب' (ص: ۲۹۵) میں مذکورہ تذکرے کے حوالے سے اشکیؔ تخلص کی صحت پر اصرار کیا ہے، جو غلط ہے۔

مالک رام نے 'تلامذۂ غالب' (طبعِ اول) میں انھیں رشکی اور طبعِ دوم میں فراقؔ تخلص کے تحت درج ترجمہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اہلِ بدایوں میں اول تخلص ہی سے معروف ہیں۔ اسی لیے راقم الحروف نے بھی رشکیؔ تخلص کو ترجیح دی۔ رشکی کا دیوان شائع نہیں ہوا۔

مونس نظامی (ف ۲۰۰۶ء) مالک نظامی بک ایجنسی محلّہ سوتھا بدایوں کی ملکیت میں رشکی کی ایک بیاض تھی جو بعد میں نواب رحمت اللہ خاں شروانی (مزمل منزل، علی

گڑھ) کے ذاتی کتب خانے کی زینت بنی۔ مونس صاحب نے از راہِ علم دوستی یہ بیاض مجھے عنایت فرمائی جس سے مجھے استفادے کا موقع ملا۔ اس بیاض کے تعارف سے قبل دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ مالک رام نے لکھا ہے:

''جب موسیٰ ندی میں طغیانی آئی (ستمبر ۱۹۰۸ء) اور ان کا گھر نذرِ سیلاب ہوا، تو اسی میں کلام بھی ضائع ہو گیا''۔

(تلامذۂ غالب، ص:۶۴۴)

لیکن دو بیاضوں کا بعد از وفات پایا جانا (بیاض راشد حیدرآبادی، بیاض نواب رحمت اللہ خاں) مالک رام کے مذکورہ خیال کی تردید کرتا ہے۔

حنیف نقوی نے لکھا ہے:

''اسی طرح قاضی عنایت حسین بدایونی کا حال رشکیؔ تخلص کے تحت لکھا گیا ہے جب کہ انھوں نے وفات (۶رصفر ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۲رنومبر 1918ء) سے کم از کم چالیس سال پہلے یہ تخلص ترک کر کے فراقؔ تخلص اختیار کر لیا تھا''۔ (غالب: احوال و آثار، ص:۱۹۷)

حنیف نقوی کے بیان کو مالک رام نے بھی طبع دوم میں اختیار کر لیا۔ لیکن راقم الحروف کو دستیاب بیاض میں فراقؔ تخلص نظر نہیں آیا۔ یہ بیاض ۱۸۹۳ء تا ۱۹۰۸ء تقریباً پندرہ سال کے کلام پر مشتمل ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ فراقؔ تخلص استاد کے ایما پر یا تو عارضی طور پر اختیار کر لیا ہوگا یا ابتدائے شاعری میں فراقؔ تخلص رہا ہوگا۔ بعد میں رشکیؔ اختیار کیا ہوگا۔

یہ بیاض مجلد ہے۔ اس کے نصف سے زیادہ اوراق سادہ ہیں۔ سادہ اوراق شروع اور آخر میں ہیں۔ درمیان کے اوراق پر کلام ہے جن پر صفحات نمبر ۱ تا ۱۲۱ ہیں۔ بیاض میں غزلوں کی تعداد کے نمبر بھی دیے گئے ہیں، مگر یہ سلسلہ بعد کو گم ہو جاتا ہے۔ بیاض میں شامل غزلیات کو میں بوجوہ شمار نہیں کر سکا۔ ایک اندازے کے مطابق سوا سو سے زائد غزلیات ہوں گی۔ علاوہ غزلیات کے غالبؔ کے قطعہ بند غزل پر ایک خمسہ ہے۔ بیاض

کے آخر میں قدسی کی نعت پر مذاقؔ بدایونی کا خمسہ اور مذاقؔ ہی کا کہا ہوا مولا علی کا سہرا بھی شامل ہے۔ (ص:۱۱۶)

بیاض کے مطالعے سے اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی کہ اس کے مشمولات بہ قلم رشکی ہیں۔ اس کے علاوہ روشنائی، خط اور غزلیات کی بے ترتیبی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ایک سے زیادہ کاتبوں نے کسی دوسری بیاض یا پراگندہ اوراق سے نقل کیا ہے۔ کاتبوں کے ضمن میں محمد اکبر حسین صدیقی حمیدی اور عطا حسنین کے نام ملتے ہیں دونوں اسمارشکی کے صاحبزادگان کے ہیں۔

بیاض میں بعض غزلیات کے اوپر تاریخ مع سنہ و مقام درج کی گئی ہے جس کی فہرست سازی سے معلوم ہوا کہ حیدرآباد کے حوالے سے تاریخوں کی مدت ستمبر ۱۸۹۳ء سے ۱۵/مارچ ۱۸۹۸ء تک ہے۔ اس مدت میں مزید تاریخیں بھی ملتی ہیں جن پر مقام کا اندراج نہیں ہے قیاساً وہ بھی قیامِ حیدرآباد کے زمانے کی ہیں۔ شہر جودھپور کی تاریخیں ۲۹/فروری ۱۹۰۷ء سے ۱۲/ستمبر ۱۹۰۸ء تک کی ہیں۔ گویا اس مدت میں رشکی کا قیام جودھپور میں تھا۔ ممکن ہے وہ فروری ۱۹۰۷ء سے قبل حیدرآباد دکن سے جودھپور منتقل ہوگئے ہوں۔ بیاض میں مندرجہ غزلیات کی مدت ۲۰/ستمبر ۱۸۹۳ء سے ۱۲/ستمبر ۱۹۰۸ء تک کو محیط ہے۔ لہٰذا ستمبر ۱۸۹۳ء سے پہلے اور ۱۲/ستمبر ۱۹۰۸ء کے بعد کا کلام کہاں محفوظ ہے، تفتیش طلب بات ہے۔

اس بیاض میں حیدرآباد اور جودھپور کے علاوہ سکندرہ راؤ، جاوڑہ، علی گڑھ اور رامپور کے نام امکنہ کے ضمن میں اور قاضی عنایت حسین، وحیدالدین خاں صاحب تعلقدار سکندرہ، مولوی عبدالعزیز صاحب کے اسما محمد اکبر صدیقی حمیدی اور عطا حسنین (صاحبزدگانِ رشکی) کے علاوہ ملتے ہیں۔

بیاض میں چند غزلیات غالبؔ کی زمین میں ہیں، غالبؔ کا قطعہ:

اے تازہ واردانِ بساط ہوائے دل

پرخمسہ بھی ملتا ہے۔ (ص:۸۷) لیکن مجموعی طور پر ان کی غزلیات پر غالبؔ کے اسلوب کا اثر نہیں ہے۔ شاید اس کا باعث یہ بھی ہو کہ انھیں غالبؔ سے استفادے کا زیادہ موقع نہیں ملا یا پھر غالبؔ کا اصلاح شدہ کلام آنکھوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

بیاض میں بعض جگہ اصلاح شدہ مصرعے بھی ملتے ہیں جیسے ص:۸۰ پر خمسہ بر غزل مرزا غالبؔ کا تیسرا مصرع تھا:

مجھ کو نہ دین و دنیا کا واللہ ہوش ہے

کو فسخ کر کے یہ مصرعہ لکھا گیا ہے:

افسردہ ہے کوئی تو کوئی سرفروش ہے

جس کا مطلب ہے کہ ناقل نے اصلاحِ کلام پر بھی نظر رکھی ہے۔

تذکرہ 'بہار بوستان شعراء' میں ان کے بیس شعر درج ترجمہ ہیں۔ بعض دوسرے تذکروں سے اضافہ کر کے مالک رام نے ان کے ۱۳۲ اشعار نقل کیے ہیں۔ سطورِ ذیل میں بیاض رشکی سے چند اشعار کا اضافہ کر کے مذکورہ اشعار کو الف بائی ترتیب میں درج کیا جا رہا ہے:

(۱)

ہدفِ تیرِ نظر، یاد آیا   دل بھی یاد آیا، جگر یاد آیا
حشر میں فتنہ محشر ہی نہ تھا   کون سا جانیے شر یاد آیا
ہجر سے ہوگئی بدتر شبِ وصل   آتے ہی وقت سحر یاد آیا

تم خریدار نہیں میرے یہ قابو کا نہیں   دل کا سودا سرِ بازار کروں یا نہ کروں

عاشق ہوں جاں نثاری میں گو، سب سے بڑھ کے ہوں
اتنی کمی ہے اہلِ مقدر نہیں ہوں میں
کوچہ میں آسماں کی طرح تیری رات دن
گردش میں ہوں پہ چرخِ ستمگر نہیں ہوں میں

جس جا پہ جلوہ گر ہوئے خاک اس کو کر دیا
کہتے ہو پھر بھی داورِ محشر نہیں ہوں میں

سختیوں کا میں ہوا خوگر تو آساں ہوگئیں
تھیں جفائیں جس قدر آخر پشیماں ہوگئیں
اس نے دیکھا کس نگہ سے ہم نے پایا کیا مزہ
میرے زخمِ دل کو وہ آنکھیں نمکداں ہوگئیں
قیس تھا، فرہاد تھا، رشکی بھی ان سے کم نہ تھا
ایسی شکلیں داخلِ شہر خموشاں ہوگئیں

کب مقابل نالۂ دل کے ہوئی اس کی صدا
ہم نے جب نالہ کیا خاموش نَے ہونے لگی

دل تو ہدفِ تیرِ نگہ ہوچکا رشکی
مشتاق ہے خنجر کی روانی کا گلو بھی

شورِ محشر سنتے سنتے دل میں تھے ہم مضطرب
اک خرامِ ناز تھا اس کا قیامت کچھ نہ تھی
وہ ہوں قاتل میرے، میں ہوں قتل، ان کے ہاتھ سے
آرزو یہ تھی تمنائے شہادت کچھ نہ تھی

لذتِ مرگِ جوانی اور ہے — خضر، عمر جاودانی اور ہے
شعلہ دل سرد ہو ممکن نہیں — آگ دوزخ کی بجھانی اور ہے

(۲)

ہم گنہگار ہیں، مانا واعظ لطف داور نہیں دیکھا جاتا

تمھارا قامتِ موزوں ہے گویا مصرعِ اولیٰ اور اس کا سایہ دلچسپ ہے مصرع برابر کا
ملاؤ دل جو مجھ سے تم، تو مالا مال ہو جاؤں تمھارا دل ہے پتھر کا، مگر پارس کے پتھر کا

آئینہ دیکھا تو یہ حیرت ہوئی آپ وہ محوِ تماشا ہوگیا
دیکھ کر اغیار کو، کی آنکھ بند پردے پردے میں اشارا ہوگیا
دل میں رہتا ہے کسی بت کا خیال کعبۂ دل بھی، کلیسا ہوگیا

مرا مطلع ہے غالبؔ، آتشؔ و ناسخؔ کے دیواں پر نہ کیوں احسنت تحسین ہو زبانِ ہر سخنداں پر
نہ آیا ہاتھ کچھ، جز حسرت و اندوہ و حیرانی دیا دل مفت اس پیماں شکن کے عہد و پیماں پر
نہ تڑپے زیر خنجر اس ادب سے اُس ستمگر کے نہ پڑ جائے کہیں قطرہ مرے قاتل کے داماں پر
نہ بولے زندگی میں خیر، لیکن بعد مرنے کے قدم رنجہ کبھی فرمایئے گورِ غریباں پر
یہ پہلا مرتبہ ہے، آگے آگے دیکھیے، کیا ہو ابھی زورِ جنوں کا ہاتھ پہنچا ہے گریباں پر

وقت آخر ہے، جو آنا ہے تو آؤ صاحب! اب نہیں ہے ہمیں جینے کا بھروسا دم بھر

مدینہ میں نہیں جو دل، وہ کیا دل مدینہ ہے چمن، دل ہیں عنادل
مٹے جو الفت خیرالوریٰ میں ہمیں ایسا کہیں دیدے خدا دل

وہ آئیں پس از مرگ امید کیا ہے؟ ہم اپنے نصیب آزمائے ہوئے ہیں

میری آنکھوں میں جو رہنا انھیں منظور نہیں آرہیں دل میں، دل آنکھوں سے بہت دور نہیں

دل دیا، جان بھی دی، وصل کا سائل نہ ہوا اور بھی آپ نے کچھ میری خطائیں دیکھیں؟

دیس کے گانے کی اس محفل میں لَے ہونے لگی یاد ہم کو بھی وطن کی، پَے بہ پَے ہونے لگی

روز گردش ہے نئی، جَور کے انداز نئے پیس ڈالے نہ یہ چرخِ ستم ایجاد مجھے
آگ سی آگ ہے، بیتاب ہوں، دیکھو خواجہ! خاک کر دے نہ کہیں، اب مری فریاد مجھے

وہ آئیں بے بلائے میرے گھر یوں ہو تو بہتر ہے ہماری آہ کا ان پر اثر یوں ہو، تو بہتر ہے
کسی کی یاد دل میں ہو، کسی کا نام لب پر ہو ترا رشکی اگر آخر سفر یوں ہو، تو بہتر ہے

وہ ایک رات جلی، میں جلا کیا دن رات کمال مجھ میں ہے یا شمع انجمن میں ہے
کسی نے آنکھ سے دیکھا نہیں، اے خضر! (کذا) سنا ہے آبِ شفا یار کے دہن میں ہے

قاصد ذرا سنبھال کے تو دیجو ان کو خط سیماب وار دل مرا خط کی شکن میں ہے
مانا کہ مانی کھینچے گا تصویر یار کی پر ہاں کلام ہم کو کمر اور دہن میں ہے
اس کی زبان منہ میں جو لی ہے فراقؔ نے شیرینی اس سبب سے اس کے دہن میں ہے

یہ مانا، ہم نہ کریں شکوۂ ستم، لیکن خدا کے سامنے ہونا کبھی حساب بھی ہے

لو، نالۂ سحر بھی اثر کر کے رہ گئے وہ آتے آتے، غیر سے کچھ ڈر کے رہ گئے
فصّاد نے جو فصد لی میری، تو کیا ہوا ٹکڑے ہی ٹوٹ ٹوٹ کے نشتر کے رہ گئے
جب ان کی بزم ہی سے نکالے گئے فراقؔ کہیے تو منہ دکھانے کے کس در کے رہ گئے

پاؤں سے جاتے ہو کوئے یار میں سر اٹھا رکھا ہے کس دن کے لیے!

نواب محمد زکریا خان رضوی زکیؔ، دہلوی

(ماخذ: تلامذۂ غالب، مالک رام، دہلی ۱۹۸۷ء)

زکیؔ دہلوی ثم بدایونی، نواب سیّد محمد زکریا خاں:

مالک رام نے زکیؔ کے ترجمہ میں ان کو دہلوی لکھا ہے جو درست ہے۔ لیکن بدایونی تذکرہ نویس انھیں شعرائے بدایوں میں شمار کرتے ہیں۔ (تذکرہ شعرائے بدایوں، ج ۱/، ص:۳۶۹) میں نے بھی ان کو غالبؔ کے بدایونی تلامذہ میں شامل کرلیا ہے۔ انھوں نے بدایوں میں زندگی کے صرف آخری چند سال (۱۸۹۶ تا ۱۹۰۳ء) گزارے تھے اور یہیں متوطن ہوکر وفات پائی اور یہیں مدفون ہوئے۔ البتہ ان کے قیام کے یہ سات سال بدایوں کی ادبی فضا کے لیے خوشگوار ثابت ہوئے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے:

> ''زکیؔ دہلوی کے اثر سے جو بدایوں میں ایک عرصے تک رہے،
> غالبؔ کا اثر اس شہر پر بھی پڑا''۔ (تقریب مشمولہ لمعات: ص۔م)

زکیؔ کا خاندان سادات کشمیری سے تھا۔ ان کے بزرگ دہلی میں متوطن ہوگئے اور بالآخر دہلوی کہلائے۔ دلّی میں یہ خاندان علمی اعتبار سے معزز اور جاہ و ثروت کے لحاظ سے ممتاز تھا۔ لیکن زکیؔ کو وراثت میں صرف علم و ادب کی دولت ملی۔ بزرگوں کی جو بچی بچائی جائیداد تھی وہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی نذر ہوگئی۔ ان کے خاندان کے بعض افراد بھی اس ہنگامۂ پُر آشوب میں انگریزوں کی گولی کا نشانہ بنے۔

زکیؔ کے والد کا نام سیّد محمود خاں تھا۔ نام کے ساتھ خان کا لاحقہ بزرگوں کے شاہی خطاب 'خانی' کی یادگار کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ وہ صاحبِ دیوان شاعر تھے اور محمودؔ تخلص تھا۔ صاحب 'عمدۂ منتخبہ' نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں معظم جنگ، سرورؔ (ف ۱۸۳۴ء) زکیؔ کے نانا کے بھائی تھے۔

قاضی عبدالودود نے لکھا ہے:

> ''زکیؔ نے اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھا ہے کہ 'غالبؔ اور میرے بزرگوں کے درمیان روابط دوستی و یک جہتی تھی۔ (یہ اعظم

الدولہ سرور کے بھائی کے پوتے تھے) اور اس تعلق کی بنا پر دس بارہ
برس کی عمر سے آستاں بوسی کیا کرتا تھا''۔ (جہانِ غالب، ص:۲۵۵)

زکی ۱۸۳۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے (انتخاب زریں، ص:۱۴۸)۔ صاحبِ 'فیضانِ غالب' نے ان کا سالِ پیدائش ۱۸۴۹ء درج کیا ہے (ص:۱۳۴) جو درست نہیں۔ زکیؔ کی تعلیم دہلی میں ہوئی۔ فارسی، عربی، منطق اور ریاضی کی تعلیم غالبؔ، صہبائیؔ اور پنڈت رام کشن بسملؔ سے حاصل کی۔ قرآنِ کریم بھی حفظ کیا۔ فنِ طب، فقہ، حدیث اور نجوم میں بھی کامل دستگاہ بہم پہنچائی۔ موسیقی اور خوش نویسی میں بھی مہارت حاصل کی۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ متعدد علوم وفنون میں کامل دستگاہ رکھنے کے سبب محکمۂ تعلیم میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے اور بتدریج ترقی کر کے صوبہ یوپی کے مدارس کے ڈپٹی انسپکٹری کے عہدے تک پہنچے۔ اس تعلق سے یوپی کے مختلف اضلاع میرٹھ، گورکھپور، بریلی، الٰہ آباد اور بدایوں میں رہے۔ زکیؔ نے ۱۸۹۶ء میں منشی دیبی پرشاد سحرؔ (ف ۱۹۰۲ء) سے بدایوں میں چارج لیا۔ (داستانِ تاریخ اردو، ص:۳۳۱) اور یہیں سے ۱۹۰۱ء میں ملازمت کی میعاد پوری کرنے کے بعد پنشن لی (تاریخ ادب اردو، سکسینہ، حصہ نظم، ص:۳۹۹)۔ اس کے بعد وہ بدایوں ہی میں متوطن ہوگئے۔ دھیرے دھیرے وہ بدایوں کے علمی و ادبی ماحول کا ایک حصہ بن گئے۔ منشی دیبی پرشاد سحرؔ بدایونی سے ان کے دوستانہ مراسم ہوگئے تھے۔ سحرؔ کے ہمراہ اکثر علی احمد خاں اسیرؔ بدایونی (ف ۱۹۲۷ء) کے یہاں نشستیں رہتی تھیں۔ (مضمون علی احمد خاں اسیر، العلم، کراچی، جنوری ۱۹۵۹ء)۔ بدایوں میں ہونے والی شعری نشستوں اور مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے اور دادِ سخن دیتے تھے (مقدمہ میخانۂ جامی، ص:۱۲)۔ انہی محفلوں سے ان کا رنگِ سخن (جو پیروی غالب سے عبارت تھا) بدایوں کے شعرا میں مقبول ہوا اور انھوں نے شعوری طور پر اسے قبول کیا۔ شاداب ذکی نے لکھا ہے:

"بدایوں کی ادبی محفلوں میں اصغر علی ضابطؔ کے یہاں ہونے
والی محافل خاص طور پر یادگار ہیں۔ ان محفلوں میں دیگر مقامی شعرا کے

ساتھ زکی بھی شریک ہوکر کلام اور دادِ سخن سے نوازتے تھے“۔

(مقدمہ انتخاب کلامِ زکی، ص:۱۱)

آفتاب احمد جوہرؔ بدایونی (ف۱۹۸۱ء) نے بھی 'میخانہ جامی' کے مقدمہ میں اسی طرح کا خیال ظاہر کیا ہے (ص:۱۲) لیکن یہ درست نہیں۔ کیونکہ چودھری اصغر ضابطؔ رئیس کھیڑا بزرگ بدایوں، زکی کے بدایوں آنے (۱۸۹۶ء) سے قبل ۱۸۹۲ء میں وفات پا چکے تھے۔ (کلماتِ ضابط، ص:۲۹۸) البتہ کھیڑا بزرگ میں چودھری محمد سعید الدین حسین سعیدؔ (ف ۲۱/جون ۱۸۹۷ء) کے دم سے رونق تھی۔ ممکن ہے زکی ان کی کسی محفلِ سخن میں شریک ہوئے ہوں۔

تقریباً سات سال بدایوں میں گزار کر ۱۳۲۱ھ/ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے بدایوں میں وفات پائی (انتخابِ زریں، ص:۱۴۸) اور یہیں حضرت نظام الدین اولیاء کے والد ماجد حضرت سیّد احمد بخاریؒ (ساگر تال نوادہ) کے پائیں جنوبی دیوار کے باہر بیرون چبوترے پر دفن ہوئے۔ اس چبوترے پر چار پختہ قبریں ہیں، ان میں مشرق سے مغرب کی طرف پہلی قبر زکی کی، دوسری بیخودؔ بدایونی کی اور تیسری راقم الحروف کے والد محمد روشن (ف ۱۹۷۲ء) کی ہے، چوتھی قبر کے متعلق علم نہ ہوسکا۔

زکی کی اہلیہ کا نام مریم بیگم تھا، جنھوں نے ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔ ان کے بطن سے ایک بیٹی اور پانچ بیٹے پیدا ہوئے۔ بیٹوں کے نام ہیں (۱) سیّد ذوالفقار علی رضوی (۲) سیّد ابوالقاسم رضوی (۳) سیّد حامد حسن رضوی (۴) سیّد عنایت حسین رضوی (۵) سیّد ولایت حسین رضوی۔ زکی کے خاندان کے بعض افراد کراچی (پاکستان) میں سکونت پذیر ہیں۔ مالک رام نے ان کی اولاد کے بارے میں کچھ اور تفصیلات دی ہیں جنھیں ہم نظر انداز کرتے ہیں۔

زکی، غالبؔ کے ان شاگردوں میں ہیں جنھوں نے آغازِ شاعری میں ان سے تلمذ اختیار کیا اور غالبؔ کی وفات (۱۸۶۹ء) تک ان سے فیضِ سخن حاصل کیا۔ انھوں نے اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھا ہے:

''از سن دوازدہ سالگی آستانہ بوس حضرت غالبؔ می بودم یعنی سخن گوئی شرف شاگردی دریافتم۔ چنانچہ تادورِ حیات حضرت مغفور کا سہ لیس خمخانہ کمال بودم''۔ (دیباچہ دیوانِ زکی، ص:۴)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ کے بعض دوسرے تلامذہ زکیؔ کو غالبؔ کا شاگرد تسلیم کرنے میں تامّل کرتے تھے۔ (دیباچہ دیوانِ زکی، ص:۵) چنانچہ زکیؔ نے غالبؔ سے ایک سند بہ زبانِ اردو حاصل کی جسے دیباچہ کے ساتھ شامل کیا۔ سند پر ۱۲۳۸ھ والی مہر ہے۔ لیکن سند میں غالبؔ کا یہ جملہ ''میں نیم جاں چند روز کا مہمان ہوں'' اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ سند غالبؔ کے اخیر عمر کی ہے جو غالباً ۱۸۶۸ء سے پہلے نہیں لکھی گئی ہوگی۔

اس سند کا عکس بخط غالب ادیب الٰہ آباد (فروری ۱۹۱۳ء) میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں یہ سند متعدد جگہ نقل کی گئی۔ خلیل الرحمٰن داؤدی نے اپنی کتاب ''مجموعہ نثر غالب اردو'' (لاہور ۱۹۶۷ء) میں بھی اسے شامل کیا ہے۔

زکیؔ ۱۸۶۸ء تک اتنے پختہ مشق اور قادرالکلام ہو چکے تھے کہ خود مرزا نے ان کے کلام کی تحسین کی۔ ۲۹ر جنوری ۱۸۶۸ء کے خط میں مرزا انھیں لکھتے ہیں:

''آپ کا کیا کہنا۔ اس عمر میں علم و فضل میں پایہ بلند حاصل کیا ہے کہ دوسروں کو یہاں تک پہنچنا مشکل ہے۔ مثنوی کے اشعار میں نے دیکھے اور پسند کیے۔ بطریقِ سہلِ ممتنع ہیں۔ اردو فصیح، عبارت سلیس، الفاظ نہایت سنجیدہ و متین۔ حرف حرف شستہ و رفتہ، جو خوبیاں نظم میں چاہئیں وہ سب موجود''۔ (غالب کے خطوط، ج ر ۲، ص:۷۹۹)

مولوی حشمت اللہ حشمت، پنڈت جواہر ناتھ کول، ساقیؔ (ف ۱۹۱۶ء) تولا حسین تولاؔ بدایونی (ف ۱۹۳۶ء)، سیّد احمد دہلوی (ف ۱۹۱۸ء، مولف فرہنگِ آصفیہ) ان کے شاگردوں میں ہیں۔ 'خم خانۂ جاوید' (ج ر ۱، ص: ۳۰۷) اور فیضانِ غالب (ص: ۱۳۴) میں علی احمد خاں اسیرؔ بدایونی کو بھی زکیؔ کا شاگرد لکھا ہے جو غلط ہے۔ اسیرؔ کی بیشتر کتب میرے مطالعے میں رہی ہیں، ان میں بھی زکیؔ سے تلمذ کا اندراج نہیں۔

زکی کا دیوانِ غزلیات 'دیوانِ زکی' (مطبع رضوی، دہلی، ۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۵ء) کے نام سے ان کی زندگی ہی میں طبع ہو گیا تھا۔ مطبع رضوی کے مالک سیّد محمد میر حسن رضوی، زکی کے چچازاد بھائی تھے۔ یہ دیوان انہی کے اہتمام میں چھپا۔ اس میں ردیف وار ۲۰۳ غزلیں ہیں۔ زکی نے دیوان کے آغاز میں چھ صفحات کا دیباچہ غالبؔ کی تقلید و اتباع میں بہ زبانِ فارسی لکھا۔ (خیال رہے کہ غالبؔ نے اپنے اردو دیوان پر بہ زبانِ فارسی دیباچہ لکھا تھا) اس دیوان پر غالبؔ کی چند سطور بطور سند شاگردی بھی شامل ہیں جن پر سال تحریر نہیں۔ آخر میں چار تاریخی قطعات بھی مندرج ہیں جن میں تیسرا قطعہ زکی کے معاصر اور دوست علی احمد خاں اسیرؔ کا بھی ہے۔ مادۂ تاریخ کا شعر حسبِ ذیل ہے:

در فکر سال طبعش بودم اسیرؔ حیراں
گفتا بگوش ہاتف 'طرز بیان غالب'
۱۳۱۲ھ

راقم الحروف کی ذاتی لائبریری میں دیوانِ زکی (ناقص الاول و آخر) موجود ہے۔

مالک رام نے لکھا ہے:

"بہت کچھ کلام غیر مطبوعہ رہ گیا، جو اُن کے خاندان میں موجود ہے"۔ (تلامذۂ غالب، ص: ۲۴۴)

زکی کا شمار طرزِ غالبؔ کو نباہنے اور قبول کرنے والے شعرا میں کیا جاتا ہے۔ ان کے کلام کو ماضی میں بہت اہمیت کی نظر سے دیکھا گیا اور موجودہ عہد میں بھی غالبؔ کے خاص تلامذہ میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ماضی میں حسرتؔ موہانی نے سلسلۂ غالبؔ کے تحت ان کے دیوان کا انتخاب پیش کیا جو انتخابِ سخن جلد دہم (ص:۱۳۶ تا ۱۸۵، مطبوعہ رئیس المطابع کانپور، ۱۹۲۹ء) میں شامل ہے۔ تقریباً نصف صدی بعد شاداب ذکی بدایونی نے بھی ان کے دیوان کا انتخاب کیا جو باسم "انتخاب کلامِ زکی" (لیتھو کلر پرنٹرس، بریلی، ۱۹۸۵ء) شائع ہوا۔ اس انتخاب کے مقدمے میں مرتّب نے زکی کے حالات اور ان کی ادبی حیثیت پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ نمونۂ کلام:

روشن چراغ تجھ سے ہوا لالہ زار کا — تو ہی فروغ ہے چمن روز گار کا
رونق پذیر تجھ سے ہوئی بزم کائنات — وا تجھ سے در ہے میکدۂ روزگار کا
تو وہ کریم ہے کہ تری بارگاہ میں — پایہ بلند ہے نگہِ شرم سار کا
بندے ہو تم زکی، رہو راضی رضا کے ساتھ — دل سے مٹاؤ نام و نشاں اختیار کا

یوں نہ کھینچ اس قدر اے دستِ جنوں گستاخی — دامنِ یار بھی کیا میرا گریباں ٹھہرا

بیداد میں لطف کیوں نہاں تھا — کیا یہ بھی عدو کا امتحاں تھا

پہلو کو بدلوں اتنی بھی طاقت کہاں ہے اب — مجھ کو تو جنبشِ رگِ جاں بھی گراں ہے اب

یہ مانا کہ میں لائقِ صحبت نہیں لیکن — اتنا تو سمجھیے کہ کجا غیر، کجا آپ

نقشِ پا بن کے بھی رہیے تو مٹا دیتا ہے — اس کے کوچے میں نہیں اپنی گزر کی صورت

بے سرو پائی مجھے، تم کو مبارک پاس وضع — میں بھی ہوں مجنوں صفت تم ہو اگر لیلیٰ مزاج

منزل ہے اہلِ عشق کی پیشِ نظر مگر — یہ قافلے پہنچتے ہیں اکثر بری طرح
کیا کہیے کاروانِ وفا کی خرابیاں — مارے گئے ہیں راہ میں رہبر بری طرح
کیا ذکر مہر و قہر کا ملنا ترا، غرض — اچھی طرح ہوا نہ میسر بری طرح
سبزہ نہیں کہ دشت کے دھوکے میں دل لگے — ویرانہ بھی ہوا تو مرا گھر بری طرح
وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اُٹھو گے یا نہیں — در پر لگا کے بیٹھے ہو بستر بری طرح

خرام یار سے پامال کرنا سیکھا ہے — کچھ اور ہے روشِ روزگار، اب کے برس

کرتا ہوں میں خطوں میں جو اظہارِ شوقِ وصل
لکھتے ہیں وہ جواب میں تردید کے خطوط

لکھی جو میں نے آرزوے قتل، یار کو
بھیجے عدو نے بھی مری تائید کے خطوط

غم دینے دیر کر کے محرم میں آئے ہیں
اس بے وفا کے بھیجے ہوئے عید کے خطوط

اچھا نہیں سہی، نہ ہوا بات کا لحاظ
رکھیے مگر تلافیِ مافات کا لحاظ

کثرت میں بھی تصورِ وحدت سے شاد رہ
آئینہِ صفات میں رکھ ذات کا لحاظ

منہ سے نکل نہ جائے زکی بات راز کی
رکھ بیخودی میں بزمِ خرابات کا لحاظ

اس کی طلب میں ہر نفس آغازِ شوق ہے
رکھتا ہے کون عمرِ گزشتہ حساب میں

ہر بات میں حوالہ ہے ہر بحث میں سند
ناصح کو مانتے ہیں ہم اہلِ کتاب میں

لکھتے ہو اس قدر غزلِ مختصر زکی
آزردہ ہوں گے اہلِ مذاق انتخاب میں

تلاشِ یار میں ہے ہر قدم سیرِ چمن ہم کو
گلِ صحرائے غربت ہو گیا داغِ وطن ہم کو

تہی دستِ تمنا رہ گیا جیبِ ہوس خالی
تحیر تھا تماشائے بتانِ سیم تن ہم کو

ناخن سے فکر کے کبھی کھلتی نہیں زکی
پڑ جاتی ہے جو رشتۂ تدبیر میں گرہ

نفس کو شعلہ مرے سوزِ بے کسی نے کیا
زبانِ شمع مجھے چاہیے دعا کے لیے

فرصتِ ہستی کی وقعت کیا نہیں پیشِ نظر
کس لیے نظارۂ گلہائے خنداں کیجیے

نہیں ہوں دادِ طلبِ ضبطِ شوق کا تم سے
نہیں ہے مجھ کو اگر حسرتِ بیاں نہ سہی

خموش بزم میں بیٹھے ہو کوئی بات ہے یہ
زبان دی ہے خدا نے تمھیں دہاں نہ سہی

دلوں سے عشق و وفا کے خلل نہیں جاتے
یہ شاہ وہ ہیں کہ جن کے عمل نہیں جاتے

صادق (عزیز)، مولوی محمد عزیز الدین:

شیوخ صدیقی کی شاخ 'خاندان فرشوری' کے چشم و چراغ تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ بعہد شمس الدین التمش (ف ۱۲۳۶ھ) ہندوستان آئے۔ اول بلگرام میں سکونت گزیں ہوئے اس کے بعد ۸۴۹ھ/ ۱۴۴۵ء میں قاضی کمال الدین فرشوری و شیخ یوسف فرشوری معِ قبائل بہ زمانہ حکمرانی سیّد علاء الدین (۱۴۴۳-۱۴۵۱ء) بدایوں آ کر متوطن ہوگئے۔ شیوخ صدیقی کا یہ خاندان بدایوں میں فرشوری کے نام سے موسوم ہوا۔ جس محلّے میں یہ بزرگ اقامت گزیں ہوئے وہ محلّہ بھی فرشوری ٹولہ کہلایا اور آج تک اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ (انساب شیوخ فرشوری، ص:۴۸)

اس خاندان کے افراد نے علم و فضل کے سبب شاہی دور حکومت میں بہت ترقی کی۔ انہی میں ایک بزرگ فصیح الدین تھے۔ جنہیں سترہ جلوس محمد شاہی میں ''فصیح اللہ خاں'' خطاب سے سرفراز کیا گیا۔ بدایوں، دہلی، پانی پت، کرنال وغیرہ میں جاگیریں دی گئیں۔ سرکار بدایوں کی سوانح نگاری کی خدمت بھی تفویض ہوئی۔ (انساب شیوخ فرشوری، ص:۲۸)

فصیح اللہ خاں کے بیٹے ابوالموید خاں (۱۷۵۶ - ۱۸۳۹ء) بھی اپنے دور کے نامور عالم تھے۔ انہیں بھی دربار شاہی سے ''خانی'' کا خطاب ملا تھا (انساب شیوخ، ص: ۲۸)۔ یہ بدایوں سے ترک وطن کر کے دہلی جا بسے تھے۔ موروثی و نجی جائیداد کی دیکھ بھال اور تعلیم و تعلّم مشغلہ تھا۔ دلی میں ''جاگیردار'' کہلاتے تھے۔ ان کے صرف ایک پسر پیدا ہوا، یہ عزیز الدین کے والد مولوی اساس الدین تھے۔

مولوی اساس الدین (۱۷۹۰- ۱۸۸۲ء) عربی و فارسی کے عالم تھے۔ دہلی میں ان کے دو مکانات زنانہ و مردانہ اور دیوان خانہ کٹرہ آدینہ بیگ خاں، قاضی حوض کے شمال میں اور املاک و معافی واقع مواضعات سہی پور و تاتارپور جوار دہلی میں واقع تھیں۔ (کنز التاریخ ص: ۳۰۴، حاشیہ) جو ۱۸۵۷ء میں تباہ و برباد ہوگئیں۔ لال کنواں کے

اس علاقے میں بقول مالک رام، آجکل سنیما ایکسلسیئر ہے۔ کوچہ پنڈت کے مقابل سیدھے ہاتھ کو ''گلی عزیز الدین وکیل'' ہے جس پر ابھی بھی نام کی تختی لگی ہوئی ہے (تلامذۂ غالب، ص:۳۴۹)۔ مصنف 'سیر المنازل' نے اس علاقے میں میاں جان صاحب کی مسجد، سبز کنواں اور ایک دوسری بے نام مسجد کا تذکرہ کیا ہے اور مسجد کا تاریخی قطعہ بھی درج کیا ہے (سیر المنازل، ص:۲۰)۔

مولوی اساس الدین ۱۸۵۷ء تک مع اعزا و اہل و عیال کے دہلی میں مقیم رہے۔ تدریس مشغلہ تھا۔ موروثی جائیداد پر گزر بسر تھی۔ انھوں نے دو نکاح کیے۔ زوجۂ اول سے دو فرزند پیدا ہوئے۔ بڑے فرزند کا نام سعید الدین رکھا گیا اور چھوٹے کا عزیز الدین۔

سعید الدین سعید و کاملؔ (۹ر مئی ۱۸۲۵ء - ۱۱ر دسمبر ۱۸۹۸ء) متفرق علوم و فنون کے ماہر تھے۔ طب ذریعۂ معاش تھا۔ روہیل کھنڈ کے مختلف اضلاع میں مطب کیا۔ حکیم سعادت علی خاں (ف ۱۸۶۶ء) رئیس آنولہ مدار المہام ریاست رامپور کے معالجے کے سلسلے میں رامپور و آنولہ رہے۔ نواب محمد علی خاں والی ٹونک کے شفاخانہ کے بھی مہتمم رہے۔ (جنوری ۱۸۶۵ء تا دسمبر ۱۸۶۷ء کے درمیان) طب میں حکیم صادق علی خاں دہلوی (ف ۱۸۴۸ء) اور شاعری میں مرزا زین العابدین خاں عارفؔ دہلوی (ف ۱۸۵۲ء) سے تلمذ تھا۔ خان بہادر مولوی رضی الدین بسملؔ (ف ۱۹۲۵ء) انھیں کے فرزند تھے۔

عزیزؔ ۱۷ر صفر ۱۲۴۴ھ/ ۲۹ر اگست ۱۸۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ عزیزؔ کی تعلیم و تربیت دہلی میں اپنے دادا حافظ ابوالموید خاں کے زمانۂ حیات تک (۱۸۳۹ء) ان ہی کے زیر نگرانی ہوئی۔ دلّی میں علوم مروّجہ کی تکمیل کے بعد طب کی بھی تحصیل کی لیکن بطور پیشہ کے طب کو اختیار نہیں کیا۔ خوش خطی کی بھی مشق کی۔ خوش نویسی کے آخری تاجدار سیّد محمد امیر رضوی عرف میر پنجہ کش (ف تقریباً ۱۸۵۷ء) کے شاگرد ہوئے۔

عزیزؔ اپنے والد اور دادا کی طرح عالمِ دین اور عالمِ زبان و ادب نہیں تھے۔ ان کے نام کے ساتھ لفظ مولوی محض اس لیے استعمال ہوا کہ بدایوں کے عوام الناس مسلمان

وکیل کو احتراماً 'مولوی' کہتے ہیں اور ہندو وکیل کے ساتھ تعظیماً لفظ بابو کا اضافہ کرتے ہیں۔ یہ دونوں لفظ آج بھی بدایوں میں رائج ہیں۔

عزیزؔ نے علومِ مروّجہ کی تحصیل کے بعد ۱۸۵۵ء میں وکالت میں درجۂ اعلیٰ کی سند حاصل کی اور سرکار انگریزی کی ملازمت کے تحت دلّی میں وکیل ضلع مقرر ہوئے۔ مئی ۱۸۵۷ء تک وہ دلّی میں وکالت جمانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انھوں نے گلی قاسم جان کے کنارے جانب مشرق لب سڑک مقابل کوچہ آدینہ بیگ خان چھوٹے مرزا صاحب کا بالا خانہ کرایہ پر لیا تھا جس پر وکالت سے متعلق ان کی نشستیں رہتی تھیں۔

(کنز التاریخ، حاشیہ ص: ۳۰۵)

اٹھارہ سو ستّاون کے ہنگامۂ پُر آشوب میں ان کا خاندان بھی لُٹ لٹا گیا۔ جنرل بخت خاں (ف ۱۸۵۹ء) جب فوج لے کر بریلی سے دہلی پہنچا تو اس نے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے برطانوی حکومت کے اہلکاروں، وُکلاء اور بقال و مہاجن وغیرہ سے تاوان کے نام پر روپیہ وصول کیا۔ نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ دہلوی (ف ۱۸۶۹ء) نے اس واقعے کو خوب منظوم کیا ہے:

اہل دہلی نہ کریں بختؔ کا شکوہ کیوں کر

بخت خاں جی ہوئے جب باج ستانِ دہلی

(فریادِ دہلی، ص: ۱۸)

اس معاملے میں عزیز الدین بھی کئی مرتبہ قلعے میں بلائے گئے اور بطور نظر بندوں کے بٹھائے گئے ان سے ایک ہزار روپے طلب کیے گئے۔ پھر کم کر کے پانچ سو مانگے گئے۔ مگر رقم کی ادائیگی کا ان کے پاس انتظام نہیں تھا اور تاوان کی ادائیگی کے بغیر خلاصی کی کوئی صورت بھی نہیں تھی۔ اس عالم یاس و ناامیدی میں مرزا غالبؔ نے دستِ تعاون بڑھایا اور ایک رقعۂ سفارشی بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا خضر سلطان دہلوی (ف ۲۳ر ستمبر ۱۸۵۷ء) کے نام تحریر فرمایا۔ یہ مرزا غالبؔ کے شاگرد تھے۔ مصنف 'کنز التاریخ' کے الفاظ میں رقعے کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

''میں آپ سے یقیناً کہتا ہوں کہ یہ سال بھر سے یہاں وکالت کرتے تھے ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ نہ انھوں نے اس قدر وکالت میں پیدا کیا۔ آپ ان کو معاف کرادیجیے۔ یہ حافظ ابوالموید خاں کے پوتے ہیں، میرے شاگرد ہیں اور میں ان کو اپنا عزیز سمجھتا ہوں''۔

(کنزالتاریخ، ص: ۳۲۱)

غالبؔ کی یہ سفارش ناکام نہیں رہی اور شہزادے خضر سلطان کے توسط سے عزیزؔ کو اس جبر سے نجات مل گئی۔

۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کو دلّی میں ہنگامہ شروع ہوا تھا۔ اوائل ستمبر تک وہ اس کے ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ جب مالی مشکلات حد سے زیادہ بڑھ گئیں تب انھوں نے ۱۳رستمبر ۱۸۵۷ء کو مع اہلِ خانہ، بدایوں کے لیے رختِ سفر باندھا اور اُفتاں و خیزاں بدایوں آئے اور یہیں اپنے موروثی مکان میں اقامت گزیں ہوگئے۔ عزیزؔ کا یہ مکان محلّہ فرشوری ٹولہ میں تھا جسے ان کی اولاد سے حاجی قطب الدین مرحوم (کویت والے) نے خریدا۔ آجکل اس میں راقم الحروف کی ہمشیرہ رہتی ہیں جو حاجی قطب الدین کے بڑے بیٹے صغیر احمد کو منسوب ہیں۔

ستمبر ۱۸۵۸ء کو جب سرکاری عمل داری دوبارہ ہوئی تو تراب علی نامی ایک شخص نے، جس سے کسی زمانے میں عزیزؔ کے والد نے قرض لیا تھا اور تمسک اغراقی مکانات کا لکھ دیا تھا۔ اس نے اساس الدین کو مفقود الخبر ظاہر کر کے نالش دائر کردی اور یک طرفہ ڈگری حاصل کر کے مکان، دیوان خانہ، رتھ خانہ وغیرہ کم قیمت پر نیلام کرواکر خرید لی۔ عزیزؔ اور ان کا خاندان بدایوں تھا انھیں کچھ خبر نہ ہوئی۔ البتہ املاک سہی پور وتا تار پور بچی جو کئی سال بعد مولوی اساس الدین نے فروخت کردیں۔ اب ان کا دہلی سے کچھ تعلق نہ رہا۔ (کنزالتاریخ حاشیہ، ص: ۳۵۰) اٹھارہ سو ستّاون کے بعد جب شاہجہانپور میں کلکٹری قائم ہوئی اور انگریزی سرکار کے انتظام کے تحت شاہجہانپور کو ضلع کی حیثیت دے دی گئی تو عزیزؔ ۱۸۵۹ء کے آس پاس شاہجہانپور میں وکالت کرنے لگے۔ ڈاکٹر حنیف

نقوی نے لکھا ہے:

''لیکن کچھ دنوں بعد ہی دہلی کو دوبارہ اپنا مستقر بنایا''۔

(غالب — احوال و آثار، ص:۱۷۶)

حنیف نقوی نے ماخذ کا اندراج نہیں کیا۔ لٰہذا یہ بیان محلِ نظر ہے۔ لیکن قرائن کہتے ہیں کہ دہلی میں آمد و رفت رہی ہوگی۔ چنانچہ ۱۸۶۸ء میں غالبؔ کے ایک مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں دہلی میں ان کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے۔

غالبؔ کے علمی معرکوں میں ایک معرکہ 'قاطع برہان' کا قضیہ بھی ہے۔ 'قاطع برہان' کے جواب میں جو کتابیں لکھی گئی تھیں ان میں 'قاطع القاطع' (مصنف امین الدین امین دہلوی) میں سب سے زیادہ فحش اور لچر زبان استعمال کی گئی تھی۔ چنانچہ غالبؔ نے ۲ر ستمبر ۱۸۶۷ء کو ازالہ حیثیت عرفی (تعزیراتِ ہند دفعہ ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱) کے تحت مولوی امین الدین پر مقدمہ دائر کیا۔ عزیزؔ اس مقدمے میں غالبؔ کی جانب سے وکیل تھے، یہ مقدمہ ۳ ماہ چند یوم زیرِ سماعت رہا بعد میں چند گرامی رؤسائے شہر کے دباؤ ڈالنے پر ۲۳ر مارچ ۱۸۶۸ء کو دونوں فریقین کے درمیان راضی نامہ داخلِ عدالت کرنے پر مقدمہ خارج ہوگیا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں 'ذکرِ غالب' ص: ۱۴۷) چونکہ راضی نامہ عدالت میں داخل کردیا گیا تھا لٰہذا مقدمہ نے طول نہیں پکڑا اور بایں سبب عزیزؔ بھی اپنی وکالت کے جوہر نہیں دکھا سکے۔ اس مقدمے کی پوری مسل کی نقل مولوی عبدالحق نے دستیاب کرکے اپنے تمہیدی نوٹ کے ساتھ رسالہ 'اردو' اورنگ آباد (اپریل ۱۹۴۳ء) میں شائع کردی تھی بعد میں 'احوالِ غالب' (علی گڑھ، ۱۹۵۳ء) میں اسے شامل کرلیا گیا۔

شاہجہانپور میں کامیاب وکالت کے نتیجے میں انھیں عہدہ منصفی دیا گیا۔ تقریباً دس سال تک درجۂ اول کے منصف (بمشاہرہ ۴۰۰ روپیہ) کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ وہ منصف کی حیثیت سے پیلی بھیت میں بھی مامور رہے۔ (خم خانۂ جاوید،

ج/۵، ص:۲۵۱)۔ ۵۵ سال کی عمر میں پنشن لے کر اس عہدے سے سبکدوش ہوئے (۱۸۸۳ء) اور ۶۶ برس کی عمر میں ۲۶/جمادی الثانی ۱۳۱۱ھ/ ۴/جنوری ۱۸۹۴ء کو فوت ہوئے۔ بدایوں میں اپنے قدیمی باغ میں کسی بزرگ کے مزار کے متصل مدفون ہوئے۔ (انساب شیوخ فرشوری، ص: ۱۰۴، ۱۰۵)۔ مقدمہ تجلیاتِ سخن (ص: ۳۳) میں تاریخ وفات ۱۳/جمادی الثانی ۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۳ء درج ہے، جو غلط ہے۔ راقم الحروف نے بھی 'دید و دریافت' (ص: ۴۲) میں مقدمہ تجلیاتِ سخن کی بنیاد پر ۲۵/نومبر ۱۸۹۳ء تاریخِ وفات درج کی تھی۔ اسے بھی غلط سمجھنا چاہیے۔

عزیزؔ کے خاندان کے بیشتر افراد نے دو نکاح کیے۔ چنانچہ عزیزؔ نے بھی اپنے خاندان کی اس روایت پر عمل کیا۔ چنانچہ زوجۂ اول نجابت النساء سے ایک فرزند محمد ابوالحسن پیدا ہوئے۔ زوجۂ دوم مقبول النساء سے تین بیٹے (محمد وہاب الدین، محمد وہاج الدین اور محمد ضیاء الدین) اور ایک بیٹی افضل بانو پیدا ہوئیں۔ ذیل میں عزیزؔ کے فرزندوں کا مختصر تعارف درج کیا جارہا ہے:

۱- محمد ابوالحسن صدیقی (۲/فروری ۱۸۵۲ء - ۹/فروری ۱۹۲۸ء): اس خاندان کے پہلے انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے فرد تھے۔ ۲۴/مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسۃ العلوم کا افتتاح ہوا اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے جماعت بندی ہوکر تعلیم شروع ہوگئی۔ (حیاتِ جاوید، ص: ۱۸۷) سرسیّد نے انھیں علی گڑھ بلالیا اور وہ کالج میں استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دینے لگے۔ صاحبِ 'قاموس المشاہیر' (ج/۲، ص:۱۸۱) نے مارچ ۱۸۷۵ء میں ایم۔اے۔او کالج میں ان کا ٹیچر ہونا لکھا ہے جو غلط ہے۔ ۱۸۷۸ء میں جب سرسیّد وائسرائے لارڈلٹن کی کونسل کے ممبر ہوئے تو انھوں نے سرسیّد کے پاس بطور پرائیویٹ سکریٹری اور پرسنل اسسٹنٹ کے ۴ سال کام کیا۔ ۱۸۸۲ء میں ہائی کورٹ الٰہ آباد میں مترجم مقرر ہوئے۔ مئی ۱۸۸۸ء میں نظام حیدرآباد کی طلب پر ریاست حیدرآباد میں سلسلۂ ملازمت کا آغاز کیا اور مختلف عہدوں سے ترقی کرتے ہوئے دیوانی

بلدۂ حیدرآباد کے چیف جج (ناظمِ اول) مقرر ہوئے اور اسی عہدے سے پنشن پائی۔

(قاموس المشاہیر، ج ر ۲، ص:۱۸۱)۔

ان کو فنِ عروض میں کمال حاصل تھا۔ دیوانِ حافظ کے حافظ اور صاحبِ تصانیف تھے۔ چند کتب ان سے یادگار ہیں: اعجاز القرآن (طبع اول مطبع مقنن، حیدرآباد، ۱۹۰۱ء، دوم مطبع شمسی آگرہ، ۱۹۰۷ء۔ انگریزی ترجمہ ۱۹۰۴ء میں چھپا)، تنقید لسان الغیب (نظامی پریس بدایوں، ۱۹۲۰ء)، عطر دیوانِ حافظ (سالِ اشاعت تخمیناً ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء)، تشریح عروضی دیوانِ حافظ (نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۸ء) اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن (مصنف جان ڈیون پورٹ، مطبوعہ لندن، ۱۸۷۰ء) کا سرسیّد کے ایما پر اردو ترجمہ کیا۔ ترجمہ چھپ چکا ہے۔ (حیاتِ جاوید، ص:۴۷۰)

فرخ جلالی نے اپنے مضمون ''محمد ابوالحسن صدیقی - کالج کے پہلے استاذ'' میں لکھا ہے:

> ''۱۸۷۵ء میں سرسیّد نے قدیم مراسم خاندانی کی وجہ سے ان کو (ابوالحسن صدیقی) علی گڑھ بلا لیا...ان کے والد عزیزالدین کے سرسیّد سے گہرے تعلقات تھے...ایک مرتبہ سرسیّد نے عزیزالدین کو کالج کے معائنہ کے لیے بلایا۔ مولوی عزیزالدین نے خاص طور پر معائنہ کے بعد لکھا کہ سرسیّد کی کتب مذہبی تک طلباء کی رسائی نہیں ہے''۔

(تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، یکم ستمبر ۱۹۸۲ء، ص:۲۳)

لیکن انھوں نے عزیزؔ اور ان کے خاندان سے سرسیّد کے مراسم قدیمی کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔

۲-محمد وہاب الدین احمد طالب: یہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ محکمہ نمک میں انسپکٹر تھے۔ شاعری میں اپنے والد سے اصلاح لیتے تھے۔ ویریندر پرشاد سکسینہ نے اپنے مضمون ''عزیز الدین عزیز'' (مطبوعہ 'ہماری زبان' دہلی، ۲۲ر جنوری ۱۹۶۹ء) میں انھیں رضی الدین بسملؔ کا فرزند لکھ دیا ہے۔ رضی الدین دراصل طالبؔ کے برادرِ عم تھے۔

۳-محمد وہاج الدین: محکمہ پولیس میں کورٹ انسپکٹر کے عہدے پر مامور رہے۔

۴- محمد ضیاء الدین: عزیزؔ کے سب سے چھوٹے فرزند تھے جو ججی عدالتوں میں ناظر رہے۔ ان کے بیٹے قمرالدین احمد قمرؔ (ف ۱۹۸۰ء) مصنف بزم اکبر (علی گڑھ، ۱۹۴۴ء) محفل عزیز (حیدرآباد، ۱۹۵۱ء) علمی حلقوں میں جانے جاتے ہیں۔

عزیزؔ کے تلامذہ میں صرف ان کے بیٹے وہاب الدین طالبؔ کا نام نظر سے گزار۔ ''تاریخ شعرائے روہیل کھنڈ'' (کراچی، ۱۹۹۹ء) میں عزیزؔ کے سب سے چھوٹے بیٹے محمد ضیاء الدین ضیاءؔ کو بھی ان کا شاگرد لکھا گیا ہے۔ (ص:۶۷۵) لیکن ضیاءؔ کے شاعر ہونے اور ان کے تلمذ کی صحت کے بارے میں کچھ لکھنا مشکل ہے۔ ضیاءؔ کے نمونۂ شاعری میں صرف ایک تاریخی قطعہ ملتا ہے جو 'تذکرۃ الواصلین' (رضی الدین بسمل، طبع اول لکھنؤ، ۱۹۰۱ء) میں شامل ہے۔

ویریندر پرشاد سکسینہ نے رضی الدین بسملؔ کو بھی عزیزؔ کا شاگرد لکھا ہے۔ ('ہماری زبان' حوالہ سابق) جو غلط ہے۔ بسملؔ ناطقؔ بدایونی اور مذاقؔ بدایونی کے شاگرد تھے (تذکرہ بہار بوستانِ شعراء، ص: ۲۱، ۲۲)۔

عزیزؔ کے نام 'عودِ ہندی' اور 'اردوئے معلیٰ' میں غالبؔ کا صرف ایک خط ملتا ہے۔ اس خط کے مضمون سے متعلق بعض امور پر ''غالب کے مکتوب الیہ'' عنوان کے تحت گفتگو کی جائے گی۔

عزیزؔ کو جب شاعری کا شوق دامن گیر ہوا تو وہ مرزا غالبؔ کے شاگرد ہوئے (قبل ۱۸۵۷ء)۔ غالبؔ کے مشورے سے عزیزؔ تخلص بدل کر صادقؔ کیا۔ دیوان کا پتا نہیں چلتا۔ ان کے پوتے قمرالدین احمد قمرؔ (ف ۱۹۸۰ء) نے ان کا کچھ کلام جمع کیا تھا جس کے مسودے پر ''انتخابِ عزیز'' لکھا تھا۔ راقم الحروف نے کم سنی میں اسے دیکھا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے دوسرے مسودات کے ساتھ یہ بھی تلف ہو گیا۔

(دید و دریافت، ص: ۱۵۸)

تذکروں میں عزیزؔ کا چندے ذکر خم خانۂ جاوید، یادگارِ ضیغم، سخن شعرا، مقدمہ تجلیاتِ سخن، گلستانِ سخن اور تذکرہ شعرائے بدایوں میں ملتا ہے۔ ان تذکروں کی مدد سے مالک

رام نے عزیزؔ کے ۷ شعر طبعِ اول میں درج کیے تھے۔ طبعِ دوم میں یہ تعداد ۹ ہوگئی۔ ایک شعر کا اضافہ راقم الحروف نے اپنی کتاب 'دید و دریافت' میں کیا۔ راقم الحروف کو جب یہ معلوم ہوا کہ عزیزؔ کا کلام 'اودھ اخبار' لکھنؤ اور 'گلدستۂ سخن' آگرہ میں اکثر و بیشتر شائع ہوتا تھا تو اس کی تلاش شروع کردی۔ حسنِ اتفاق حکیم محمد حسین خاں شفاؔ رامپوری نے 'گلدستۂ سخن' کے متعدد شماروں کی رامپور میں موجودگی کا پتا دیا۔ چنانچہ ان شماروں سے اخذ کر کے ان کی دو اردو غزلیں پیش کی جارہی ہیں۔ ایک شمارے میں ان کی ۱۳ اشعار پر مشتمل فارسی غزل بھی نظر سے گزری، جس کے چند شعر درج کیے جارہے ہیں۔ ۹ اشعار کے علاوہ اس طور ۲۸ اردو اشعار کا اضافہ ہورہا ہے۔ یہ غزلیں چونکہ ہم طرح ہیں اور ۱۸۸۳ء کے نصفِ اول میں کہی گئی ہیں لہٰذا غالبؔ کی اصلاح سے بے نیاز ہیں۔ فارسی و اردو غزلیات میں تصنع و آورد ہے۔ روایتی مضامین ہیں۔ بلند خیالی میں ذکاوت نہیں ہے اور نہ شوخیِ گفتار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کلام، غالبؔ کے رنگِ سخن کی نفی کرتا نظر آتا ہے۔ ان غزلیات میں طرزِ لکھنؤ کے اترے ہوئے رنگ کا عنصر پایا جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہ حیثیت شاعر مقبول نہ ہوسکے۔ نمونۂ کلام:

دل ہے مقام مہر شہِ بوتراب کا ہوتا ہے روز اس میں گزر آفتاب کا

قلزم نمونہ ہے مری چشم پر آب کا سیماب پارہ ہے دل پر اضطراب کا

کس کی نگاہ مست کا زخمی ہوا ہے دل جاری بجائے خوں ہے جو، چشمہ شراب کا

مانا یہ خضر! آبِ بقا سے ہے زندگی وہ لیکے کیا کرے جو ہو پیاسا شراب کا

کوثر میں جام دیتے ہیں پرہیزگار کو یاں مل رہا ہے سب کو پیالہ شراب کا

فرہاد تلخیِ غم شیریں میں مرگیا کم ظرف اٹھا سکا نہ نشہ اس شراب کا

محشر بپا ہی ہوتے ہیں عشاق، روزِ قتل قاتل کے روز کوچہ میں دن ہے حساب کا

ساقی وہ مے دے جس سے رہوں مست و بیخبر تا حشر میں، خدا نہ ہو پرساں حساب کا

بس بے قرار دید ہوں، گو جائے رشک ہے تو ہی صبا اٹھا کہیں گوشہ نقاب کا

امیدوار بخشش رب ہیں گناہگار — زاہد تو معتقد ہے، عذاب و ثواب کا

تربت پہ دل جلوں کے چڑھانا ضرور ہے — قندیل شمع کی، کوئی دونا کباب کا

اس نے نگاہ قہر سے دیکھا جو سوئے چرخ — دہشت سے رنگ زرد ہوا آفتاب کا

ممکن نہیں کہ چرخ مقابل ہو، آہ کے — ٹھہرے ہوا کے سامنے کیا دم حباب کا

لیلیٰ، تری گلی میں تماشا ہے، قیس کا — تو بھی اٹھا کے دیکھ تو گوشہ نقاب کا

حیواں کو، خضر میکدہ سے کیا مناسبت — ظلمات کا گھر ہے، یہ گھر آفتاب

پروانہ کے فرار پہ روشن ہو نخل شمع — ہو قبر عندلیب پہ بوٹا گلاب کا

غمزہ کی کچھ خطا ہے نہ عشوہ کا کچھ قصور — ہے سب قصور اس دل خانہ خراب کا

(گلدستۂ سخن، آگرہ، جولائی ۱۸۸۳ء، ص: ۵۳)

مرگ کو چارۂ مایوسی و حرماں سمجھا — صدمہ ہجر کے سہنے سے میں آساں سمجھا

اللہ اللہ رے، کیا حوصلۂ دل ہے کہ وہ — جو بلا عشق میں آئے اسے آساں سمجھا

ہائے کچھ شوق شہادت میں نہ سوجھا مجھ کو — جو کہ قاتل تھا، اسے درد کا درماں سمجھا

ہاتھ سے اپنے قضا تھی، ترے دیوانے کی — رشتۂ جاں کو جنوں تار گریباں سمجھا

شوق میں مجھ کو خبر کچھ حق و باطل کی نہیں — نور جو سامنے آیا، اسے جاناں سمجھا

بخیہ کرتا ہے کبھی، اور کبھی دیتا ہے دوا — چارہ گر، زخم جگر قابلِ درماں سمجھا

کس طرح اس بت کافر سے ہو اُمید وصال — اپنے دل میں جو مجھے، مردِ مسلماں سمجھا

چیر کر دل کو نکالا، جو مرے سینے سے — اپنے دل میں وہ اسے، تیر کا پیکاں سمجھا

اپنی وحشت کے مقابل میں، ترا دیوانہ — وسعت خلد کو، اک گوشۂ زنداں سمجھا

عشق کا بوجھ لیا سر پہ بنی آدم نے — کارِ دشوار کو وہ جہل سے، آساں سمجھا

کثرتِ داغ نے یہ رنگ دکھایا صادقؔ — تن کو، پروانہ مرے سرو چراغاں سمجھا

(گلدستۂ سخن، آگرہ، اپریل ۱۸۸۳ء، ص: ۱۲، ۱۳)

گزر کیسے ہو ایسے آستاں تک — تصور بھی نہیں جاتا جہاں تک

یہی گر آہ و نالہ ہے، تو صادقؔ! — رہے گا دم نہ تاثیرِ فغاں تک

وہ حکم سناتے ہیں مجھے قتل کا ہنس کر — کچھ لطف کا انداز بھی ہے، ان کی جفا میں
صادق یہ تمنا ہے کہ جب تک ہو مری زیست — معشوق رہے بغل میں، دل یادِ خدا میں
کرتے ہو بتو جو بے نیازی — کیا بندہ نواز، تم خدا ہو؟

سارے انداز ستم ختم نہ کر تو مجھ پر — کچھ تو دشمن کے لیے طرزِ جفا رہنے دے
ہے یہ تنہائی میں، مجھ سوختہ جاں کی غم خوار — شمع مرقد کو مری، بادِ صبا رہنے دے

ہماری آتشِ شوق اور بھڑکی — چلے جس وقت وہ دامن اٹھا کے

قاتل جو اپنا ہے وہی، اب سوگوار ہے — اس موت پر حیات فدا، جاں نثار ہے

لے گئی دل اک نظر میں، اس کی چشم نیم خواب — مست ہم سمجھے تھے اس کو پر بہت ہشیار ہے

بعد کشتن از خجالت قاتلِ من در نظر — سرنگو چوں تیشۂ فرہاد می آید مرا
دید چوں بیجاں مرا از قصدِ کشتن بازگشت — شرم از محرومی جلاّد می آید مرا
وحشتم پابندِ زنجیر و سلاسل نیست لیک — رحم بر تنہائیِ صیاد می آید مرا
نالہ پُردردِ صادقؔ درد کش را ہے نہ کرد — زاں ستم گر ایں ہمہ بیداد می آید مرا

(گلدستۂ سخن، آگرہ، مئی ۱۸۸۳ء، ص: ۳)

عزیزؔ کے حالات قلم بند کیے جا چکے تھے۔ ماہنامہ 'مجلّہ بدایوں' (کراچی) کی فائلوں کی ورق گردانی کے دوران عزیزؔ کی ایک اردو مثنوی کا تعارف نظر سے گزرا (مشمولہ مئی ۱۹۹۶ء)۔ سیّد مسعود نقوی (فرزندِ میر محفوظ علی بدایونی) نے مثنوی کے تعارف کے ساتھ اس کے سرورق کا عکس بھی دے دیا ہے۔ باوجود کوشش کے یہ مثنوی دستیاب نہیں ہوسکی۔ لہٰذا مذکورہ مختصر تعارف پر قناعت کرتے ہوئے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں پیش کی جاتی ہیں۔ مثنوی کا سرورق یہ ہے:

"بفضلِ حق سبحانہ تعالیٰ جل شانہٗ/ مثنوی تصنیف مولوی عزیز الدین صاحب بدایونی، موسومہ بہ/ ثمرہ الفت/ بفرمائش مولوی رضی الدین صاحب ساکن بدایوں طبع شد/ بہ مطبع نور محمدی بہ اہتمام منشی عیوض علی"۔

یہ مثنوی ۲/۱ ۹×۷ انچ سائز کے ۱۶ صفحات پر مطبع نور محمدی (واقع محلہ باڑوزئی) شاہجہانپور سے ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ سالِ اشاعت کا تعین مثنوی کے آخر میں شامل شیخ شفاعت اللہ شفاعتؔ بدایونی (ف ۱۸۷۱ء) کے تاریخی قطعے سے کیا گیا ہے۔ مثنوی کتنے اشعار پر مشتمل ہے؟ قصے کی اصل کیا ہے؟ اس سلسلے میں تعارف نگار نے کچھ نہیں لکھا۔ بہ ظاہر یہ ایک عشقیہ اور خود ساختہ قصہ معلوم ہوتا ہے۔ تعارف نگار نے متفرق مقامات سے مثنوی کے کل ۱۲ شعر نقل کیے ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں:

ہے دو بینی روشِ اہلِ ہوس　　ایک ہی قبلہ ہے عُشاق کا بس
عشقِ صادق ہے دو بینی سے نفور　　حُسن ہے غیر کی شرکت سے غیور

اے خدا خامے کو گویائی دے　　ناطقہ دے سخن آرائی دے
بلبلِ خامہ گل افشاں ہووے　　طوطیِ طبع خوش الحاں ہووے
تاکہ اک پیر کا افسانہ لکھوں　　سرگذشتِ دلِ دیوانہ لکھوں
یعنی اک شوخ پہ مرنا اس کا　　جاں سے جانا پہ گزرنا اس کا
گرچہ ہے عشق مجازی کا بیاں　　لیک دیتا ہے حقیقی کا نشاں

چاند سا چہرہ چمکتا تھا سوا　　قد سے تھی اس کے قیامت برپا
بال بکھرے ہوے جوں سنبل تھے　　اس کے رخسار، مثالِ گُل تھے
جلوہ گر، خوبی و رعنائی میں　　جامہ زیبی میں، خود آرائی میں

پڑھ رہا تھا کوئی، اس کے سرِ رہ　　غزلِ غالبؔ الفت آگاہ

بفضلہ حق سبحانہ تعالیٰ جل شانہ

مثنوی تصنیف جناب مولوی محمد عزیز الدین صاحب

ثمرۂ الفت

بہ فرمایش مولوی رضی الدین صاحب ساکن بدایون طبع شد

بمطبع نور محمدی باہتمام منشی عزیز

عکس مثنوی عزیز و صادق

(ماخذ: مجلّہ بدایوں، کراچی، مئی ۱۹۹۶ء)
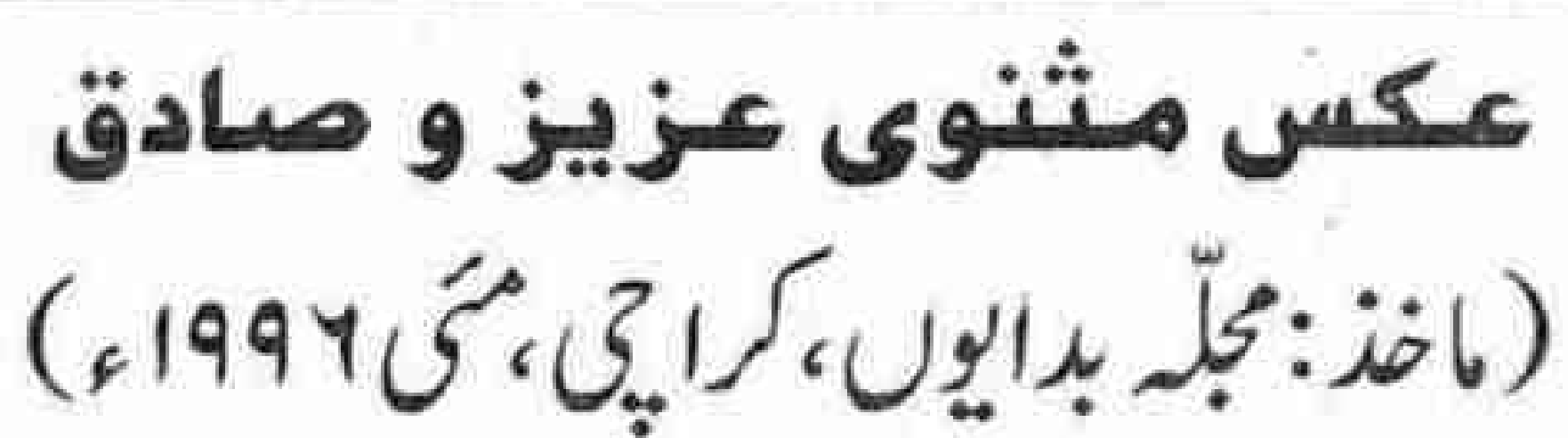
کوئی پڑھتا تھا بطور شیون غزلِ مومنؔ جنت مسکن

تعارف نگار نے ایک اہم اطلاع یہ دی کہ مثنوی میں غالبؔ کی ایک مکمل غزل (عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی) بھی شامل ہے۔ لیکن غالبؔ کی غزل کے دوسرے شعر کے بعد جو شعر درج ہوا ہے وہ متداول دواوین میں نہیں ملتا:

تو نہ قاتل ہو، کوئی اور ہی ہو تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

راقم الحروف نے دیوانِ غالب کے محقق ایڈیشن دیکھے۔ یہ شعر مجھے بھی نظر نہیں آیا۔ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے شعر کے مضمون کو فرسودہ و پامال خیال کرتے ہوئے اسے غزل سے خارج کر دیا ہوگا۔ البتہ یہ طے ہے کہ یہ شعر الحاقی نہیں ہے۔[1] غالبؔ کے تلامذہ کی جانب سے غالبؔ سے منسوب کر کے کلام مشتہر کرنے کی مثالیں نہیں

---

[1] شعر مذکور کی غالب سے نسبت کی دوسری روایت تذکرہ غوثیہ از شاہ گل حسن قادری (بار اول دہلی، جون ۱۸۸۴ء) میں ملتی ہے جو عزیز کی زیر بحث مثنوی کے تقریباً 15 سال بعد کی ہے۔ اس روایت میں غالب نے صریحاً اس شعر کی ملکیت سے انکار کیا ہے۔ لیکن شعر مذکور کو کسی استاد کا طبع زاد کہتے ہوئے اس کی تعریف بھی کی ہے۔ تذکرہ غوثیہ کی روایت حسب ذیل ہے:

ایک روز (ہم) مرزا نوشہ (غالب) کے مکان پر گئے۔ نہایت حسن اخلاق سے ملے۔ لب فرش تک آن کر لے گئے۔ تمام حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند ہے علی الخصوص یہ شعر:

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو تیرے کوچہ کی شہادت ہی سہی

کہا صاحب! یہ شعر تو میرا نہیں۔ کسی استاد ہے۔ فی الحقیقت نہایت اچھا ہے۔

(تذکرہ غوثیہ، ص: ۹۸ بحوالہ غالبیات چند عنوانات، ص: ۲۲)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہد غالب ہی میں غالب سے جو چند اشعار منسوب ہو کر مشتہر ہو گئے تھے ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے۔ مثنوی مذکور میں غالب کی جس غزل میں یہ شعر جگہ پا گیا ہے وہ قبل از ۱۸۱۶ء کی فکر کردہ ہے اور ''بیاض غالب بخط غالب'' میں شامل ہے۔ اس میں یہ شعر موجود نہیں۔

تذکرہ غوثیہ کے مصنف کے بارے میں غلط یا صحیح یہ طے پا گیا ہے کہ اس کے مصنف دراصل محمد اسماعیل میرٹھی ہیں... (تلامذہ غالب، ص: ۴۹) لیکن غالب سے متعلق اس کتاب کے بیانات کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں کوئی تحقیقی بحث میری نظر سے نہیں گزری۔

ملتیں۔ یہ بعد کے لوگوں کا کام تھا جس کو نشاں زد کر کے تحقیق اپنا فیصلہ سنا چکی ہے۔

مثنوی کے سرورق پر عزیزؔ کے تخلص اور تلمذ کا اندراج نہیں ہے۔ ممکن ہے اندر کے صفحے پر ہوا ہو۔ مولوی رضی الدین بسملؔ (ف ۱۹۲۵ء) جن کا نام سرورق پر درج ہے، عزیزؔ کے برادر زادے تھے۔ مثنوی کی اشاعت کے وقت ان کی عمر تقریباً ۲۲ سال کی ہوگی۔ اس وقت وہ وکالت کا امتحان پاس کر چکے تھے اور پوایاں تحصیل ضلع شاہجہانپور میں وکالت جمانے کے لیے کوشاں تھے۔

عزیزؔ کی مثنوی غالبؔ کی اصلاح شدہ ہے یا یہ اصلاح سے بے نیاز رہی اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ چونکہ اس کی اشاعت غالبؔ کی وفات (۲رذی قعدہ ۱۲۸۵ھ/ ۱۵رفروری ۱۸۶۹ء) کے بعد کے قریب ترین عرصے میں ہوئی (۱۲۸۶ھ) اس لیے اصلاح کے امکان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مثنوی کے اشعار بہر حال شاعر کی قادر الکلامی کا پتا دیتے ہیں۔

مدہوش، منشی سخاوت حسین:

مدہوشؔ کے خاندان کے بارے میں تفصیلات نہیں ملتیں۔ صاحبِ 'تذکرۃ الواصلین' نے مدہوشؔ کے دادا میاں جی عبدالملک انصاریؒ کے ترجمے میں لکھا ہے:

> "آپ شیخ انصاری ہیں۔ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب انصاری کی اولاد میں ہیں"۔ (ص:۲۴۵)

مدہوشؔ کے نواسے حامد سعید خاں لودی (ف ۱۹۷۳ء) نے خاندانی روایت کے بموجب ان کا نسب انصار مدینہ سے جوڑا ہے اور ان کے جدِ اعلیٰ کا بہ عہد التتمش بدایوں آنا لکھا ہے۔ (تعارف رقعاتِ مدہوش، ص:۵) لیکن صاحبِ 'مردانِ خدا' نے مدہوشؔ کے دادا کے ترجمے میں اطلاع دی ہے:

> "میاں جی عبدالملک انصاری کے جد امجد شیخ محمد علی قصبہ سنبھل، ضلع مراد آباد سے آ کر بدایوں میں سکونت پذیر ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی شیخ امان اللہ تھا"۔ (ص:۴۳۰)

ان بیانات کی روشنی میں مدہوشؔ کے خاندان کے بارے میں یہ لکھنا درست ہوگا:

مدہوشؔ نسبتاً شیخ انصاری تھے۔ مہاجرین مکہ کی مدینہ کے جن مسلمانوں نے نصرت و حمایت کی، وہ انصار کہلائے۔ مدہوشؔ کا خاندان انھی انصار مدینہ میں کسی ایک فرد کا نام لیوا تھا۔ اسی خاندان کے کوئی مردِ بزرگ بہ عہد التتمش ہندوستان آئے۔ بعد میں ان کے خاندان کے بعض افراد سنبھل، ضلع مرادآباد میں سکونت پذیر ہوگئے۔ سنبھل ہی سے شیخ محمد علی عازمِ بدایوں ہوئے۔ ان کے بیٹے شیخ امان اللہ کے گھر ایک خوش بخت بچہ پیدا ہوا جو اپنے عہد کا نامور صاحبِ نسبت بزرگ کہلایا۔ ان کا نام میاں جی عبدالملک انصاری تھا۔ (ف ۱۷/۱۷کتوبر ۱۸۴۲ء) یہ بزرگ مدہوش کے دادا تھے۔ مارہرہ کی ''درگاہِ برکاتیہ'' کے سجادہ نشین شاہ آل احمد عرف اچھے صاحب (ف ۱۸۲۰ء) کے سلسلۂ قادریہ میں مرید و خلیفہ تھے۔ بدایوں کی تاریخی مسجد 'مسجد خُرما' (مدرسہ قادریہ کی مسجد) میں امامت کرتے اور طلباء کو درس دیتے تھے۔ بعد وفات قاضی حوض سے متصل قبرستان میں مدفون ہوئے۔ مدہوش نے تمام عمر ہر سال ۱۲ / رمضان کو ان کے عرس کا اہتمام کیا۔ ایک حافظ قرآن مزار پر تلاوت کے لیے مقرر تھا۔ ہر جمعہ کو مزار پر ختم قرآن کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ یہ سارے اخراجاتِ خیر و برکت، مدہوش برداشت کرتے اور روحانی سکون محسوس کرتے۔ (تذکرۃ الواصلین، ص:۲۴۶۔ مردانِ خدا، ص:۴۳۰)۔

میاں جی عبدالملک کے تین پسر ہوئے۔ امان اللہ حسین عرف خلیفہ تلو، میاں امداد حسین، شیخ محمد عنایت حسین۔ موخرالذکر عنایت حسین مدہوشؔ کے والد ماجد تھے۔

مدہوش ۱۸۲۶ء میں اپنے آبائی مکان محلّہ چاہ میر بدایوں میں پیدا ہوئے۔ حسبِ دستور مروّجہ تعلیم عربی، فارسی، حدیث، قرآن، فقہ وغیرہ کی تحصیل کی۔ تعلیم کی مزید تفصیل اور اساتذہ کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔ تذکرۃ الواصلین (طبع اول ۱۹۰۱ء) کی تقریظ میں انھوں نے عزیز الدین عزیزؔ و صادقؔ کے بڑے بھائی حکیم محمد سعید الدین سعیدؔ و کاملؔ بدایونی (ف ۱۸۹۸ء) کو اپنا استاد لکھا ہے (ص:۲۶۹)۔ سعید الدین کاملؔ کا

منشی محمد سخاوت حسین انصاری مدہوش بدایونی

(ماخذ: رقعات مدہوش، سخاوت حسین مدہوش، بدایوں ۱۹۶۳ء)

تعارف عزیز الدین کے ترجمہ میں پیش کیا جا چکا ہے۔ 'رقعاتِ مدہوش' کے تعارف میں کامل کو عزیز کا تایا لکھا ہے (ص: ۷) جو غلط ہے۔ اُسی کتاب میں گزارش عنوان کے تحت احید الدین نظامی نے مدہوش کو افضل المطابع کے مالک چودھری محمد سعید الدین سعید[۱] (ف ۱۸۹۷ء) کا عزیز دوست اور شاگرد لکھا ہے (ص: ۳)۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے بھی اسے دہرادیا ہے۔ (غالب اور عصرِ غالب، ص: ۱۵۳)۔ دراصل احید الدین کو دونوں کے ہم نام ہونے سے التباس ہوا۔ مدہوش کا اپنا ہی بیان اس بارے میں مرجّح قرار دیا جائے گا۔

شرفائے بدایوں میں عموماً تین پیشے پسندیدہ رہے: زمینداری، طبابت اور وکالت۔ مدہوش نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بچپن اور جوانی معاشی طور پر تنگی میں بسر ہوئے۔ لیکن انھوں نے مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی جدوجہد کو جاری رکھا اور منزلِ مراد تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل انھوں نے وکالت کا امتحان پاس کرلیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ججی شاہجہانپور سے وکالت کا آغاز کیا۔ خداداد ذہانت، قابلیت اور لگن کی بدولت وہ وکالت کے پیشے میں کامیاب ہوئے اور خلق عام میں پذیرائی و مقبولیت حاصل کی۔ انہی دنوں انھوں نے انگریزی میں بھی اچھی استعداد پیدا کرلی۔ چنانچہ انگریزوں کے مترجم کی حیثیت سے بھی عدالتوں اور پبلک جلسوں میں شریک ہوتے اور بخوبی یہ خدمت انجام دیتے۔

ان دنوں بدایوں، شاہجہانپور حلقہ ججی میں شامل تھا۔ بدایوں کے وہ افراد جو قدیم روشِ زندگی اور آبائی پیشوں کو ترک کرکے انگریزی سرکار اور اس کے دفاتر سے جڑ کر

---

[۱] سعید بدایونی (۴؍ جولائی ۱۸۵۷ء - ۲۱؍ جون ۱۸۹۷ء) بدایوں کے جاگیرداروں میں اہم اور ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ علمی و ادبی سرپرستیوں کے علاوہ انہوں نے بعض علمی کام بھی کیے۔ ہفتہ وار 'سعید الاخبار' (اجراء جنوری ۱۸۸۵ء) اور 'گلدستہ سعید' جاری کیا۔ مطبع افضل المطابع قائم کرایا۔ شاعری میں مسدس سعید (لاہور ۱۸۹۱ء) ہدیہ سعید اور کرامات اولیائے حق (بدایوں ۱۸۸۵ء) یادگار چھوڑے۔ (دیکھیں شعرائے بدایوں، دربار رسول میں، ص: ۴۹ تا ۵۱)

ایک نئے دور کی شروعات کرنا چاہتے تھے، وہ شاہجہانپور کی راہ لیتے تھے۔ چنانچہ ان دنوں شاہجہانپور میں متعدد اہلِ علم موجود تھے۔ خاص بدایوں کے عزیزالدین عزیزؔ و صادقؔ، خان بہادر رضی الدین بسملؔ، عبدالحئی بیخودؔ، نظام الدین حسین نظامیؔ، شفاعت اللہ شفاعتؔ وغیرہ شاہجہانپور میں بہ سلسلۂ وکالت و ملازمت نظر آتے ہیں۔ رضی الدین بسملؔ نے مدہوشؔ کو اپنا عزیز و شفیق دوست لکھا ہے (تذکرۃ الواصلین، ص: ۳)۔ بیخودؔ بدایونی نے بھی اپنے دیوان کے دیباچے میں مدہوشؔ کا ذکر کیا ہے۔ (مرأۃ الخیال، ص: ۱۰)

مدہوشؔ چند برس بعد میونسپل بورڈ شاہجہانپور کے نائب صدر منتخب ہو گئے۔ حکام ضلع اور عوام میں مقبولیت کے سبب وہ بہت جلد آنریری مجسٹریٹ بھی نامزد کر دیے گئے۔ انھوں نے اپنی کارگزاری، قابلیت اور ثابت قدمی و اولوالعزمی کے سبب سرکاری اعزاز و وقار بھی حاصل کیا اور دنیاوی مال و متاع بھی۔ سرکار انگریزی نے قومی و ملکی خدمات کے صلے میں ان کو 'خان بہادر' کے خطاب سے سرفراز کیا۔

مدہوشؔ نے اپنے آبائی مکان سے متصل ایک بڑی کوٹھی 'سخاوت منزل' تعمیر کرائی۔ بارِ دگر ایک اور کوٹھی 'نیاز منزل' کے نام سے تعمیر کرائی جو اپنی بیٹی نیاز رسول کو جہیز میں دی۔ مدہوشؔ کی زندگی میں 'سخاوت منزل' اربابِ علم و ادب کی آماجگاہ تھی۔ شعر و ادب کی نشستیں منعقد ہوتیں، جلسے اور احباب کی خاطر داریاں ہوتیں، محفل سماع کا اہتمام ہوتا مگر آج:

سیاہی طاق کی بتلا رہی ہے
کہ اس گھر میں اُجالا رہ چکا ہے

مدہوشؔ نے ۱۹۰۱ء میں انتقال کیا (تاریخ وفات کا علم ان کے اعزا کو بھی نہیں) بدایوں میں اپنے خاندانی قبرستان پٹی نیاز رسول متصل قاضی حوض میں اپنے دادا اور والد کے مزار کے قریب مدفون ہوئے۔

مدہوشؔ نے تین شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکا (اطہر حسین عرف میاں جان) پیدا ہوا تھا جو عین عالمِ جوانی میں فوت ہو گیا۔ دوسری بیوی (کنیز فاطمہ) سے

ایک لڑکی (نیاز رسول) پیدا ہوئی۔ زوجۂ سوم سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

مدہوشؔ کا نسلی سلسلہ نیاز رسول کی اولاد سے جاری رہا۔ نیاز رسول کا پہلا نکاح مدہوشؔ نے اپنے حقیقی بھانجے منشی آل حسن سے کیا۔ چند ہی روز میں آل حسن فوت ہو گئے اور نیاز رسول نے بیوگی کا جامہ پہن لیا۔ ۱۸۹۴ء میں اس لڑکی کا عقدِ ثانی شوکت علی خاں فانیؔ بدایونی (ف ۱۹۴۱ء) کے چچازاد بھائی عبدالحمید خاں لودی سے کیا، جہیز کی صورت میں ایک کوٹھی (نیاز منزل) دی جس میں شادی کے بعد یہ جوڑا بس گیا۔ عبدالحمید خاں شادی کے وقت تحصیلدار تھے بعد میں ترقی کر کے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ ۱۹۲۴ء میں بہ عمر ۴۷ سال وفات پائی۔ ان کی اولاد میں چار بیٹے حامد سعید خاں لودی، عابد سعید خاں لودی، میجر زاہد سعید خاں لودی، کرنل لیاقت سعید خاں لودی اور ایک بیٹی امتیاز رسول پیدا ہوئی۔ ان لوگوں کی اولاد میں کچھ لوگ محلّہ چاہ میر بدایوں اور بعض کراچی میں مقیم ہیں۔

عابد سعید خاں فناؔ لودی (۱۹۰۵ء-۱۹۷۲ء) شاعر تھے۔ فانیؔ بدایونی (ف ۱۹۴۱ء) جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی (ف ۱۹۶۷ء) اور مجتہد الدین عیشؔ بدایونی (ف ۱۹۵۵ء) سے مشورۂ سخن کیا۔ دیوان، رنگا رنگ (بدایوں ۱۹۵۹ء) چھپ چکا ہے۔ تفصیل کے لیے راقم الحروف کا مضمون 'فنا لودی' (مشمولہ 'دید و دریافت' ص: ۱۶۹ تا ۱۷۷) ملاحظہ فرمائیں۔

مدہوشؔ کا اپنے دور کی دو نابغہ روزگار شخصیات (سرسیّد احمد خاں اور مرزا غالبؔ) سے ذہنی و عملی وابستگی کا ثبوت ملتا ہے۔ سرسیّد سے ان کی ملاقات ۱۸۶۴ء میں ہوئی۔ بعد میں خط کتابت کا سلسلہ جاری ہوا۔ مدہوشؔ سرسیّد اور علی گڑھ تحریک کے دامے، درمے، قدمے، سخنے سرگرم موید و معاون رہے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (قیام ۱۸۸۶ء، جو ۱۸۸۹ء تک ایجوکیشنل کانگریس کہلاتی تھی، حیاتِ شبلی، ص: ۱۶۲) کے بنیاد گزاروں میں ان کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے حامد سعید خاں لودی کے اس جملے: ''وہ اُن مٹھی بھر لوگوں میں تھے جنھوں نے کانگریس کی بنیاد ڈالی'' (تعارف رقعات مدہوش، ص: ۱۱) پر حاشیہ میں یہ ریمارک دیا ہے:

"کانگریس کی بنیاد ڈالنا بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ خان بہادر سخاوت
حسین شروع سے سر سیّد احمد خاں تحریک کے حامی تھے۔ آل انڈیا
ایجوکیشنل کانفرنس کے سرگرم کارکن تھے جو کانگریس کے توڑ پر ۱۸۸۶ء
میں قائم ہوئی تھی"۔ (غالب اور عصرِ غالب، ص:۱۴۸)

یہاں ڈاکٹر قادری 'کانگریس' سے 'انڈین نیشنل کانگریس' سمجھے ہیں۔ اپنی کتاب 'دید و دریافت' (ص:۴۸) میں، میں نے بھی یہی درج کیا تھا۔ دراصل سر سیّد نے اس کانفرنس کا نام اس کے قیام ۲۷/دسمبر ۱۸۸۶ء کے وقت 'محمڈن ایجوکیشنل کانگریس' رکھا تھا، بعد میں ایک ترمیمی تجویز کے تحت ۱۸۹۰ء میں اس کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ہوگیا۔ ۱۸۹۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس اور ۱۹۲۳ء میں مسلم اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس رکھا گیا اور آخر میں اس کا نام آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس رائج ہوا۔ (دیکھیے: سر سیّد کی تعلیمی تحریک، ص:۲۹۔ ہندوستانی مسلمان، ج/۱، ص:۳۶)

سر سیّد کی وفات کے بعد بھی مدہوش کانفرنس کے اجلاسوں میں شریک ہوتے رہے اور اس کی ترقی و فروغ کے لیے کام کرتے رہے۔ کانفرنس کے چودھویں اجلاس منعقدہ ۲۹/دسمبر ۱۹۰۰ء میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"چونکہ سر سیّد احمد خاں کو میں نے دیکھا ہے، اس لیے میں کچھ
کہنے کو کھڑا ہوا ہوں۔ ۱۸۶۴ء سے میری اور سر سیّد احمد خاں کی
ملاقات تھی، میرے خطوط کے جواب میں وہ اکثر مرحبا اور جزاک اللہ
لکھا کرتے تھے..... باقی میں تو سیّد صاحب کا معتقد مثل ان لوگوں کے
ہوں جیسے فتحِ مکہ سے قبل کے مسلمان تھے"۔

(رپورٹ محمڈن اورینٹل کانفرنس، اجلاس رامپور، ص:۲۴۰ بحوالہ غالب اور عصرِ غالب، ص:۱۴۹)

'تہذیب الاخلاق' کے اجرا، (۲۴/دسمبر ۱۸۷۰ء) کے بعد مسلمانوں میں تعلیم کی ترقی پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کرنے کے لیے سر سیّد نے بنارس میں ایک کمیٹی 'کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان' قائم کی۔ دسمبر ۱۸۷۱ء میں سر سیّد نے اردو و انگریزی میں

ایک اشتہار بہ عنوان ''التماس بخدمت اہلِ اسلام و حکام ہند درباب ترقی تعلیم مسلمانانِ ہند'' چھپوا کر جاری کیا۔ اس سلسلے میں ملک کے طول و عرض سے انھیں ۳۲ مضامین موصول ہوئے۔ سرسیّد نے ان مضامین سے خلاصہ کر کے چند نتائج قلم بند کیے، ان نتائج کی روشنی میں ایک رپورٹ اردو و انگریزی میں تیار کی۔ اس رپورٹ کی ایک ایک جلد حکومت ہند اور تمام صوبائی حکومتوں کو بھیجی گئی تھی (حیاتِ جاوید، ص:۱۶۹ تا ۱۷۲) مدہوشؔ نے بھی اسی سلسلے میں ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ سرسیّد نے مدہوشؔ کے مضمون پر دس صفحات کا نوٹ لکھا تھا (غالب اور عصرِ غالب، ص: ۱۵۳)۔ یہ مضمون موصول ہونے والے ان ۳۲ مضامین میں سے ایک تھا جن کی بنیاد پر سرسیّد نے رپورٹ تیار کی۔

جب ندوۃ العلماء کے قیام کی تحریک نے زور پکڑا تو مدہوشؔ اس تحریک میں بھی دام و درم اور قدم وسخن سے شامل ہوگئے۔ ۱۹ر فروری ۱۸۹۹ء کو شاہجہانپور میں ایک جماعت 'معین الندوہ' قائم ہوئی، جس کا مقصد شاہجہانپور میں ندوہ کا سالانہ اجلاس کرنا تھا۔ مدہوشؔ اس جماعت کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ مدہوشؔ اس وقت شاہجہانپور میں آنریری مجسٹریٹ تھے۔ اجلاس منعقد ہوا اور اس کی روئیداد ''روئیداد اجلاس ششم ندوۃ العلماء'' (محبوب المطابع کانپور، ۱۸۹۹ء) کے نام سے شائع ہوئی۔

مدہوشؔ نے تعلیم کے فروغ کے لیے ہر ممکن جدوجہد کی۔ اپنی کمائی کا ایک بڑا حصہ قومی تعلیم اور قومی ترقیاتی منصوبوں پر خرچ کیا۔ انھوں نے قانونی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو بھی دو سال دس روپے ماہوار وظیفہ دینے کا اعلان کیا (رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، ص:۱۰۸ بحوالہ 'غالب اور عصرِ غالب' ص:۱۴۹)۔ محسن الملک (ف ۱۹۰۷ء) کے دو خط بنام مدہوشؔ (مطبوعہ 'ہماری زبان' دہلی، یکم مئی ۱۹۶۳ء) سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کانفرنس کے ذمہ داروں کی نظر میں ان کا بھی ایک مرتبہ تھا، وہ ان کے اخلاص کے قدردان تھے۔

حامد سعید خاں نے لکھا ہے: ''ہندو مسلم اتحاد بورڈ اور تعلیم کے صدر رہے''

(تعارف رقعاتِ مدہوشؔ، ص:۱۰)۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اس جملے پر یہ ریمارک دیا ہے: ''اس زمانے میں ہندو مسلم اتحاد بورڈ کا وجود سمجھ میں نہیں آیا''۔ (غالب اور عصرِ غالب، ص:۱۴۸) میں نے اس جملے کو سمجھنے کی کوشش کی، کسی حد تک مجھے کامیابی ملی۔ بات دراصل یہ ہے کہ بدایوں میں ۱۸۸۵ء میں عشرۂ محرم اور دسہرے کی تاریخوں کے آس پاس پڑنے، طے شدہ 'حسینی گلی' سے جلوس نکلنے کے سلسلے میں مقامی ہندو و مسلمانوں کے بیچ نزاع پیدا ہوگیا تھا جو تقریباً دو برس چلا۔ یہ مسئلہ ایک ایسا رخ اختیار کرگیا کہ مقامی سطح پر حکام سے نپٹ نہ پانے کے سبب کمشنر بہادر اور گورنر بہادر تک پہنچا۔ ۱۸۸۷ء یا اس کے بعد تقریباً دو سال میں یہ مسئلہ حل ہوا۔ اس نزاع کو ابتدا میں ضلع حکام نے رؤسائے شہر کی ایک جماعت کے ذریعے ہی حل کرانے کی کوشش کی۔ میرا خیال ہے بورڈ سے تعارف نگار کی مراد رؤسائے بدایوں کی یہی جماعت رہی ہوگی، جس میں خان بہادر رضی الدین بسملؔ، چودھری اصغر علی رئیس، شیخ انتظام الدین رئیس، لالہ گنگا رام بقال وغیرہ شامل تھے (کنز التاریخ، ص:۳۶۶ تا ۳۸۱)۔ اس کے علاوہ آریہ سماجیوں، عیسائیوں سے تحریری و تقریری مناظروں نے بھی فضا کو مکدر کردیا تھا۔ شاہجہانپور اس قسم کے مباحثوں کے لیے مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ ۸رمئی ۱۸۷۶ء کو شاہجہانپور میں جو 'میلہ خدا شناسی' منعقد ہوا تھا جس میں اس دور کے مقتدر علماء نے شرکت کی تھی، ممکن ہے یہ میلہ ہندو مسلم منافرت میں اضافے کا موجب بنا ہو اور مدہوشؔ کی کوششیں اسی منافرت کو زائل کرنے سے متعلق ہوں۔

مدہوشؔ کا غالبؔ سے تعلق اور شاگردی کے متعلق بھی تفصیلات نہیں ملتیں۔ ایسا قیاس کیا جاسکتا ہے کہ عزیز الدین صادق کے توسط سے وہ غالبؔ کے شاگرد ہوئے ہوں۔

مدہوشؔ غالبؔ سے کس درجہ تعلق رکھتے تھے اور ان کے لیے کس حد تک رطب اللسان تھے اس کا کچھ اندازہ مدہوشؔ کے ایک رقعے سے ہوتا ہے جو مدہوشؔ نے اپنے کسی واقف کار کو لکھا، جس میں واقف کار کی جانب سے بھیجی گئیں غالبؔ کی غزلہائے اردو، قصیدۂ

فارسی اور پنج آہنگ کے موصول ہونے کی اطلاع دی گئی ہے۔ اسی خط یا رقعے میں مدہوشؔ اپنے مکتوب الیہ سے ''رقعاتِ غالب'' کی نقول جلد از جلد بھیجنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ خط کا مضمون ظاہر کرتا ہے کہ اُس کا مکتوب الیہ غالبؔ اور مدہوشؔ دونوں کا متعارف ہے۔ اس کا امکان ہے کہ یہ مکتوب الیہ عزیز الدین صادقؔ ہی ہوں۔ خط کا متن حسبِ ذیل ہے:

''مہربان فصیح زبان والیِ ملک نظم ونثر۔

شعر:

بیان شوق چہ حاجت کہ سوزِ آتش دل

تواں شناخت بسوزے کہ در سخن باشد

نامۂ محبت نگار بہ عین انتظار مع غزل ہائے اردو وقصیدہ فارسی و پنج آہنگ، خوبیش از مشرق تا بہ مغرب رسیدہ پرتو افروز وصول آورد تارک تفاخر برفرق فرقدان رسانیدہ بے تکلف می نگارم کہ در ریختہ ناسخ را نسخ ساختہ سخن آتش در آتش انداختہ ولذت شعر ذوق را بے ذوق نمودہ۔ خوشا قسمت خاقانی و انوری و عرفی کہ در زماں حال موجود نیستند۔ اگر بودے مقابلہ نظم قصیدہ ربودے درو بردے نثر نامہ پرنور سہ نثر ظہوری بے ظہور اینگہ کلمہ چند بطور توصیف بلکہ مرزا صاحب اسد اللہ غالب از زبان بندہ می گویند۔ مثنوی:[1]

طرز اندیشہ آفریدہ اوست در تن لفظ جاں دمیدہ اوست

پشت معنی قوی ز پہلویش خامہ را فربہی ز بازوبش

نقول رقعات او زودتر مرزا صاحب عنایت فرمائید۔ و یاد بندہ فراخور خاطر دارند''

ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اس خط کا مکتوب الیہ مرزا غالبؔ کو قرار دیا ہے (غالب

---

[1] یہ دونوں شعر غالبؔ کی مثنوی ''باد مخالف'' کے ہیں۔

اور عصرِ غالب، ص:۱۵۱) جو درست نہیں۔ خط کے متن کی یہ عبارت ''اینگہ کلمہ چند بطور توصیف بلکہ مرزا صاحب اسداللہ غالب از زبان بندہ می گویند'' مکتوب الیہ کو مخاطب کر کے نہیں لکھی جا سکتی۔ اس دور کے رقعات میں اگر اس طرح کا رواج رہا ہو تو میرے علم میں نہیں۔

مدہوشؔ کا منظوم کلام نہیں ملتا۔ نثر میں ان کی حسبِ ذیل تحریریں یادگار ہیں:

رقعاتِ مدہوش مسمیٰ بہ شرابِ الکوثر (۱۲۶۰ھ):

خطوط و رقعات کا یہ مجموعہ مدہوشؔ نے اپنے دوست چودھری محمد سعید الدین سعیدؔ (ف ۱۸۹۷ء) رئیس اعظم کھیڑا بزرگ بدایوں کی فرمائش پر ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء میں مرتب کیا تھا۔ مگر اس میں خطوط اس کے بعد کے بھی ہیں۔ اس کی اشاعت جمادی الآخر ۱۲۹۶ھ/ مئی ۱۸۷۹ء میں مطبع افضل المطابع و سعید الاخبار، بدایوں سے افضل علی ضو (ف ۱۹۲۰ء) کے اہتمام میں ہوئی۔ اس کا پہلا ایڈیشن راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزرا۔ طبع دومؔ نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۶۳ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ طبع دوم کے شروع میں مدہوشؔ کے نواسے حامد سعید خاں لودی (جو اُس وقت ایگریکلچر مارکیٹنگ اڈوائزر اقوامِ متحدہ کی حیثیت سے تہران میں مقیم تھے) نے تعارف بہ زبانِ اردو و فارسی لکھا (ص:۴ تا ۳۴)۔ گزارش عنوان سے احید الدین نظامی نے ''عرضِ ناشر'' لکھا (ص:۳)

طبع دوم کتابی سائز کے ۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۴۶ فارسی رقعات (ص:۳۵ تا ۶۳) اور ۱۳ اردو رقعات (ص:۶۵ تا ۷۰) ہیں۔ اردو رقعات کو ''گلدستۂ مضامینِ اردو'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ آخری ورق پر مدہوشؔ کے نام دو خط ہیں۔ ایک خط مرزا غالبؔ کا ہے (ص:۷۱) اور دوسرا خط محسن الملک کا ہے (ص:۷۲)۔ غالبؔ کا خط 'خطوطِ غالب' کے مجموعوں میں شامل کر لیا گیا ہے، اس خط پر اگلے باب میں گفتگو کی جائے گی۔

رقعاتِ مدہوش کا پہلا ایڈیشن نایاب ہے اور دوسرا کمیاب۔ مالک رام کو 'تلامذۂ

غالب' (طبع دوم) کی ترتیب کے دوران وہ باوجود کوشش کے دستیاب نہیں ہوا۔ اشاعت کے آخری مرحلے میں وہ ملا بھی تو ناقص تھا۔

یہ مجموعہ، مدہوشؔ کی ایک یادگار بن کر رہ گیا۔ ابھی تک اس کا تعارف و جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ اس میں جو رقعات شامل ہیں بادی النظر میں وہ ایسے خطوط معلوم ہوتے ہیں جو انشاء کی صورت میں لکھے جاتے ہیں۔ لیکن رقعات کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اصل خطوط کی نقول ہیں گو کہ اشاعت کے دوران ان کے مکتوب الیہ کے نام اور تاریخوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔

حالات سررشتہ تعلیم:

اس رسالہ کا تعارف ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے فہرست مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ از نصیرالدین ہاشمی (حیدرآباد دکن، ۱۹۵۷ء) کے حوالے سے کرادیا ہے۔ ڈاکٹر قادری لکھتے ہیں:

> "اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ مرحوم میں موجود ہے۔ اس کا سائز (۱۳×۸) ہے۔ اس میں (۱۰۶) صفحات ہیں۔ ہر صفحے پر (۲۱) سطریں ہیں۔ کاغذ ولایتی ہے۔ خط نستعلیق ہے۔ کتابت ۱۳۰۰ھ میں ہوئی ہے"۔ (غالب اور عصرِ غالب، ص: ۱۵۳)

۱۳۰۰ ہجری برابر ۸۳-۱۸۸۲ عیسوی کے ہے۔ اس رسالے کا سالِ تصنیف دسمبر ۱۸۷۱ء یا اوائل ۱۸۷۲ء ہے۔ اس کے لکھنے کا پس منظر گذشتہ سطور میں درج کیا جاچکا ہے۔ یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔

تقریظ تذکرۃ الواصلین:

تذکرۃ الواصلین اولیائے بدایوں کا تذکرہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن مطبع رائے صاحب گلاب سنگھ اینڈ سنز پریس لکھنؤ سے قیاساً ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا تھا۔ مدہوشؔ نے اس پر اردو نثر میں تقریظ لکھی۔ لیکن اس تذکرے کے دوسرے ایڈیشن (۱۹۴۵ء) میں

اسے شامل نہیں کیا گیا۔ ''رقعاتِ مدہوش'' کے تعارف میں یہ تقریظ نقل ہوئی ہے (ص:۷ تا ۱۰) لیکن متن میں جا بجا لفظ وحروف بدل گئے ہیں۔ راقم الحروف کو چند سال پیشتر تذکرۃ الواصلین کا پہلا ایڈیشن بدایوں کے ایک بزرگ کی عنایت سے دیکھنے کو مل گیا تھا۔ اس ایڈیشن کی مدد سے میں نے ''رقعاتِ مدہوش'' کے اپنے ذاتی نسخے کا متن درست کرلیا ہے۔

مدہوشؔ کا اردو و فارسی کلام کا نمونہ باوجود کوشش کے دستیاب نہیں ہوسکا۔ صاحبِ ''تاریخ شعرائے روہیل کھنڈ'' (ج ۱، ص:۱۵۱) نے ان کے چار شعر درج ترجمہ کیے ہیں۔ یہ کتاب چونکہ تاریخ، تذکرہ اور تحقیق کے مروّجہ معیار پر پوری نہیں اترتی لہٰذا ان اشعار کا مدہوشؔ سے نسبت دے کر درج کرنا درست نہیں ہوگا۔

فداؔ (جمالی)، حکیم سیّد احمد حسن:

یہ نقوی سیّد تھے، یعنی ان کا نسبی سلسلہ مختلف واسطوں سے حضرت امام علی نقی رحمۃ اللہ علیہ سے ہوتا ہوا امام حسین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ یہ خاندان عہد سلاطین اسلام دہلی سے دربارِ شاہی میں معزز و محترم رہا۔ ۶۷۸ھ/ ۱۲۷۹ء میں حضرت خواجہ سیّد محمد خطیرؒ، سلطان غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ء-۱۲۸۷ء) کے ولی عہد شہزادہ محمد کے اتالیق اور معتمد خاص تھے (حیٰوۃ العلماء، ص:۱۱)۔ انہی خواجہ سیّد محمد خطیر کی ساتویں پشت میں خواجہ سیّد محمد اسماعیل نامی ایک بزرگ ۱۴۹۲ء میں سلطان سکندر لودی کے عہدِ حکومت (۱۴۸۹ء-۱۵۱۷ء) میں سہسوان میں عہدۂ قضا پر مامور ہوئے۔ قضا و اِفتا کی خدمات مفوّضہ اور جاگیرات و معافیات موروثی کے حقوق عطا ہونے کے سبب وہ اور ان کے اہلِ خانہ سہسوان میں متوطن ہوگئے۔ ان کے بیٹے قاضی محمد عبدالشکور شہید (ف ۱۵۴۰ء) نے بھی تیس سال قضات کے فرائض انجام دیے۔ سہسوان میں سادات کی نسل قاضی عبدالشکور کے پانچ بیٹوں (قاضی محمد صالح، مفتی محمد فاضل، خواجہ صدرالدین محمد حاکم، مولانا محمد قاسم، محمد ہاشم) کے ناموں کی نسبت سے صالحی، فاضلی، حاکمی، قاسمی اور ہاشمی کہلائی۔

فداؔ قاضی محمد صالح کی اولاد میں تھے لہٰذا خود کو انھوں نے صالحی لکھا۔ ان کا نسب یہ ہے: احمد حسن (فدا) بن محمد حسن صالحی بن قاضی فضل امام بن احسن اللہ بن فیض اللہ بن سلطان اللہ بن محمد صالح۔

صاحبِ 'تلامذۂ غالب' اور صاحبِ 'سخنورانِ گجرات' دونوں فداؔ کی تاریخِ پیدائش کے سلسلے میں خاموش ہیں البتہ ڈاکٹر حنیف نقوی نے صاحبِ 'حیوٰۃ العلماء' کی بیان کردہ سالِ فات (۱۳۱۰ھ) اور عمر (۶۵ برس) کو معتبر مانتے ہوئے سالِ ولادت تخمیناً ۱۲۴۵ھ/ ۳۰-۱۸۲۹ء طے کیا ہے (غالب: احوال و آثار، ص:۱۷۸)۔

فداؔ نے ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی۔ دہلی جا کر علومِ متداولہ کی تکمیل کی۔ بعد تکمیلِ تعلیم ریاست بڑودہ پہنچے، وہاں نامور طبیب حکیم ہاشم علی خاں موہانی سے طب میں دستگاہ بہم پہنچائی۔ تکمیلِ طب کے بعد وہیں ذریعۂ معاش کے طور پر مطب قائم کیا۔ دہلی سے ریاست بڑودہ منتقل ہونے کا سبب مالک رام نے 'حیوٰۃ العلماء' کی بنیاد پر یہ لکھا ہے:

> ''ان کے خاندان کے بعض اصحاب کا تعلق ریاست بڑودہ سے تھا انھیں کی ترغیب پر احمد حسن فداؔ نے بڑودہ کی راہ لی''۔
>
> (تلامذۂ غالب، ص:۴۳۸)

یہ بیان ڈاکٹر حنیف نقوی کی تحقیق کے مطابق خلافِ واقعہ ہے (غالب: احوال و آثار، ص:۱۷۹)۔ ان کے خیال میں نقوی سادات کے شجرۂ نسب ''خزینۃ الانساب'' کے مطابق فداؔ کی والدہ امیر النساء بڑودہ کی رہنے والی تھیں، وہ سیّد باسط علی کی صاحب زادی تھیں جو سادات بارہہ میں سے تھے (ایضاً، ص:۲۱۸)۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ فداؔ کے والد پہلے سے بڑودہ میں متوطن ہوں اور ریاست بڑودہ کے متوسل بھی۔ یا محض ننہالی رشتے کے تعلق سے فداؔ نے بڑودہ کی راہ لی ہو۔

فداؔ، حکیم حاذق، سیر چشم، باکمال عالم تھے۔ کتب کا کافی ذخیرہ تھا۔ ریاست کے عمائدین میں مقبول تھے۔ صاحبِ 'حیوٰۃ العلماء' نے ان کی مہمان نوازی، اربابِ فضل و کمال اور اعزہ و اقربا کے ساتھ سلوک و تعاون کو سراہا ہے (ص:۱۷)۔

نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۸۹۰ء) کے برادرِ کلاں سیّد احمد حسن عرشی (ف ۱۸۶۰ء) سے مراسم تھے۔ سیّد احمد حسن عرشی کی والدہ بدایوں کے عثمانی خاندان کے بزرگ مفتی محمد عوض ابن مفتی درویش محمد کی بیٹی تھیں۔ صاحبِ 'اکمل التاریخ' کی اطلاع کے بموجب درسیاتِ مروّجہ کی تکمیل عرشی نے بدایوں میں رہ کر کی۔ یہاں ان کے استاد مولانا فیض احمد رسوؔا (ف ۱۸۵۸ء) مجاہدِ آزادی تھے (اکمل التاریخ، ج ر ۱، ص: ۶۲)۔ ممکن ہے بدایوں سے خاندانی نسبت کے سبب فدؔا سے تعلق قائم ہوگیا ہو۔ ۱۸۶۰ء میں جب عرشی بہ ارادۂ حج روانہ ہوکر بڑودہ میں مولانا غلام حسنین قنوجی کے یہاں مقیم ہوئے (تلاشِ غالب، ص: ۲۹۱، صاحبِ 'حیوٰۃ العلماء' نے عرشی کو بڑودہ میں فدؔا کا مہمان لکھا ہے، ص: ۱۷) تو وہاں شدید بیمار ہوگئے۔ فدؔا نے بحیثیت طبیب ان کا علاج کیا اور اپنے استاد حکیم ہاشم علی خاں سے بھی ان کی بیماری کے سلسلے میں مشورے لیتے رہے۔ لیکن عرشی جانبر نہیں ہوسکے۔ بالآخر ۲۳ ر نومبر ۱۸۶۰ء کو وہ جاں بحق ہوگئے۔ نواب صدیق حسن خاں کو جب اس کی اطلاع پہنچی تو انھوں نے فدؔا کا شکریہ ادا کیا۔ اپنی کتب انھیں تحفے میں بھیجیں اور جب اپنی کتاب 'اتحاف النبلا' میں انھوں نے اپنے بھائی عرشی کا ترجمہ لکھا تو فدؔا کا بھی ذکر کیا۔ (تلامذۂ غالب، طبع دوم، ص: ۴۴۰)

فدؔا، عرشی کے توسط سے ستمبر ۱۸۶۰ء میں غالبؔ کے شاگرد ہوئے۔ جیسا کہ غالبؔ کے خط مورخہ ۲۱ ر ستمبر ۱۸۶۰ء بنام احمد حسن قنوجی (عرشی) سے ظاہر ہے:

> "تمھاری نثر کی طرز پسند، تمھاری خواہش مقبول۔ جناب حکیم سیّد احمد حسن صاحب کی خدمت گزاری منظور.... بہرحال حکیم صاحب کو میرا اسلام کہیے اور کہیے کہ آپ بے تکلف اپنا کلام بھیج دیا کریں۔ یہاں سے بعد حک و اصلاح خدمت میں پہنچ جایا کرے گا"۔
>
> (غالب کے خطوط، ج ر ۲، ص: ۲۸۶)

صاحبِ 'حیوٰۃ العلماء' (ص: ۱۷) اور صاحبِ 'تلامذۂ غالب' (ص: ۴۳۸) نے ان کو دہلی میں طالب علمی کے دوران غالبؔ کا شاگرد ہونا لکھا ہے جو مذکورہ صدر حوالے کی

موجودگی میں درست نہیں۔ مالک رام نے یہ بھی لکھا ہے:

"(بعد تعلیم) دہلی سے وطن واپس چلے جانے کے بعد ان کی استاد سے خط و کتابت رہی، ان کے نام چند خطوط 'اردوئے معلیٰ' میں شامل ہیں"۔ (تلامذۂ غالب، ص:۴۳۸)

احمد حسن فداؔ کے نام اب تک جو قدیم ترین غالبؔ کا مکتوب دستیاب ہوا ہے وہ ۱۹/ ذالحجہ ۱۲۷۷ھ/ ۲۸/ جون ۱۸۶۱ء کا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ غالبؔ سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی تلمذ قائم ہونے (یعنی ستمبر ۱۸۶۰ء) کے بعد جاری ہوا۔ ان دنوں فداؔ بڑودہ میں متوطن تھے اور ایک معالج کے طور پر وہاں کے عمائدین میں اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ دراصل مالک رام نے 'حیوٰۃ العلماء' کے بیانات پر حصر کیا۔ غالبؔ کے خطوط کو سامنے رکھ کر استاد اور شاگرد کے مابین روابط و تعلق کو جاننے کی کوشش نہیں کی۔

فداؔ، سیّد جمال الدین حسین خاںؒ (ف ۱۸۶۱ء) سے بیعت تھے۔ پیر کے نام کی نسبت سے جمالیؔ تخلص بھی اختیار کیا۔ لیکن اس کا استعمال شاذ ہے۔ ۱۸۸۰ء میں انھوں نے حج بیت اللہ کا فریضہ ادا کیا۔ دین و دنیا دونوں اعتبار سے باعمل زندگی گزار کر ۶۵ برس کی عمر میں ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۳ء میں بڑودہ میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ مقامِ مدفن کا علم نہیں۔ مالک رام نے لکھا ہے:

"گمان بدرجۂ یقین ہے کہ وہ تکیہ ماتریہ، بڑودہ کے قبرستان ہی میں دفن ہوئے تھے، لیکن مرورِ زمانہ کے باعث قبر کا نشان مٹ چکا ہے"۔ (تلامذۂ غالب، ص:۴۴۰)

داغؔ دہلوی نے تاریخ کہی:

"حکیم و طبیب و سخن آفریں — عدم کو گیا تھا جو اصلی وطن
سر آہ سے داغ تاریخ لکھ — بنی تربت سیّد احمد حسن
(۱+) ۱+۱۳۰۹=۱۳۱۰ھ"

فداؔ کی باقیات میں مالک رام نے صرف ان کے ایک بیٹے سیّد محمود حسین افسرؔ (جنھیں بڑا بیٹا لکھا ہے) کا ذکر کیا ہے۔ ان کے خاندانی شجرے 'خزینۃ الانساب' (ص:۱۰۷) کے بموجب ان کے پانچ بیٹے تھے: الطاف حسین، اعجاز حسین، مشتاق حسین، ظہور حسین، محمود حسین افسرؔ۔ موخرالذکر نے بڑودہ میں والد کی طرح طبابت کی، بہ حیثیت طبیب اور شاعر وہاں نام کمایا۔ ابتدا میں جلالؔ لکھنوی (ف ۱۹۰۹ء) سے اصلاح لی بعد میں مرزا ذاکر حسین یاسؔ (ف ۱۹۰۷ء) کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ مالک رام نے لکھا ہے کہ دیوان چھپ چکا ہے (مدراس، ۱۹۸۳ء)۔ افسرؔ نے ۲۴ردسمبر ۱۹۴۸ء کو انتقال کیا۔ قبرستان ماتریہ، بڑودہ ہی میں اپنے والد کے جوار میں مدفون ہوئے (تلامذۂ غالب، ص:۴۴۲)۔

فداؔ بہت پُرگو تھے۔ ایک دیوان مرتّب کیا تھا (مکتوب غالب، محررہ ۲۵ردسمبر ۱۸۶۶ء) جو ۱۹۲۷ء کے سیلاب میں ان کے دوسرے اثاث البیت کے ساتھ ضائع ہوگیا۔ بعد میں ان کے پڑپوتے سیّد واجد حسین نے مختلف بیاضوں اور گلدستوں سے ان کا کلام جمع کرکے ایک دیوان کی شکل دی جو 'دیوانِ فدا' کے نام سے ڈاکٹر سیّد وحید اشرف کی ترتیب و مقدمہ کے ساتھ ۱۹۷۹ء میں ساؤتھ انڈیا اردو اکیڈمی، تامل ناڈو، مدراس کی جانب سے عثمانی پریس مدراس سے چھپ کر شائع ہوا۔ اس دیوان میں حمد، نعت، منقبت، غزل، مثنوی، قصیدہ، خمسہ، قطعات وغیرہ سبھی کو یکجا کردیا گیا ہے۔ اس مجموعے پر مالک رام کا پیش لفظ ہے اور ڈاکٹر سیّد وحید اشرف نے مقدمہ لکھا ہے۔ پیش لفظ میں انھوں نے ان بیانات کا اعادہ کیا جن کی تصحیح یا تردید ہم گذشتہ سطور میں کرچکے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد وحید اشرف نے فداؔ کا، سورت میں قیام اور یہیں غالبؔ سے ملاقات ہونا اور سورت ہی میں غالبؔ سے تلمذ کا شرف حاصل ہونا لکھا ہے (ص:۵۴)۔ مالک رام اور سیّد وحید اشرف کے بیانات کی تردید حنیف نقوی نے اپنے تبصرے میں کردی ہے (غالب: احوال وآثار، ص:۱۷۹)۔ نمونۂ کلام:

ہو سکے تو کیجیے ڈھب آخری دیدار کا　　لب تک آپہنچا ہے دم اس ناتوان و زار کا
ہم ہی کچھ مرتے نہیں ہیں آپ کی اس چال پر　　اک جہاں پامال ہے اس ناز کی رفتار کا
عاشقوں کا کوچہ قاتل میں ہے یہ اِزدحام　　روز بہر امتحاں ہوتا ہے خوں دو چار کا

آٹھوں پہر حبیب ہے دل میں بسا ہوا　　کعبے سے بڑھ کے رتبہ ہے دل کے مکان کا

ہوش اڑے، کالے ڈسے خنجر پھرے بس دیکھ کر
چشم میگوں، زلف پیچاں، ابروے خم دار آج

چھپائے سے نہیں چھپتی محبت　　جو ہو دل میں، وہ آتا ہے زباں پر

ہنس کر، نہیں کہنا، نہیں انکار کا انداز　　سچ یہ ہے کہ ہے صاف یہ اقرار کا انداز
مُردوں کو جِلائے وہ، یہ زندوں کو کرے قتل　　گفتار کا وہ ڈھنگ یہ رفتار کا انداز
شیدا ہے کوئی رخ پہ، کوئی شیفتۂ زلف　　یکساں ہے یہاں کافر و دیندار کا انداز
بیداری شب آپ کی آنکھوں سے عیاں ہے　　چھپتا ہے کہیں دیدۂ بیدار کا انداز

پاؤں لے آئے مجھے وادیِ پُرخار کے پاس　　سر میں سودا ہے کہ چلیے اسی دیوار کے پاس

نہ وہ ادا، نہ وہ غمزہ، نہ وہ کرشمہ ہے　　نظر وہ کیا ہوئی، اور وہ کہاں گیا اخلاص

توسنِ عمرِ رواں گو کس قدر چالاک ہے　　پر نہ اس سے بھی ہوا طے یہ بیابان فراق
آہِ سرد و اشکِ گرم و رنگِ زرد و چشمِ تر　　رفتہ رفتہ کیا بہم پہنچے ہیں سامانِ فراق

دشت گردی، چاک دامانی و ترک نام و ننگ　　کام وہ ہم سے ہوئے ہیں، جو کہ تھے شایانِ عشق

یہاں ہیں لینے کی دل کے، نئی نئی رسمیں
مسافر آئے نہ، یارب! کوئی بنارس میں

وہ قوسِ ابر و تیرِ نگہ سے کستے ہیں
کسی کا دل نہ الٰہی! کسی کے ہو بس میں

ندیم! بوسہ پیاپے نہ لیجیے کیوں کر
کہ جوش، شوق کا ہوتا ہے ان کی نس نس میں

اثر جو خاکِ درِ دل رُبا میں پایا ہے
وہ بات پائی ہے اکسیر میں، نہ پارس میں

ثنائے ابر و مژگانِ یار کیا کیجیے!
زیادہ تیر و کماں سے ہے زور میں، کس میں

وہ یاد آتا ہے، اس کا بچشم نم کہنا
سفر سے جلد پھر آنے کی کھائیے قسمیں

دکھائیں جا کے بتانِ دکن کو اب کیا منہ
جو نقدِ دل تھا، فدا! لٹ گیا بنارس میں

مرتا ہوں ریل روڈ میں جلد آؤ دیکھ لو
بھیجی ہے یہ خبر اسے ٹیلی گراف میں

عشق سے جس کا دل گداز نہیں
درِ عرفاں بھی اس پہ باز نہیں

کیوں وہ تنہائی میں نہیں ملتے
ہائے کیا کوئی پاکباز نہیں

فدا! چشمِ بصیرت، ہو تو دیکھو ہر جگہ اس کو
کہاں کا لائے ہو جھگڑا! یہ مسجد ہے، یہ بتخانہ

تمھارے غم میں آخر دھج بنا ہم نے فقیرانہ
اٹھایا شہر سے بستر، بسایا جا کے ویرانہ

کہا رو رو کے میں نے شب جو اپنے غم کا افسانہ
تجاہل دیکھیے، کہتے ہیں، تو کس کا ہے دیوانہ

لپٹ جاتا ہے فرطِ شوق سے کیا بے حجابانہ
فدا ہم دیکھ کر جلتے ہیں وصلِ شمع و پروانہ

ہمیں دونوں جہاں میں ایک خواہش ہے فقط تیری
نہ غم دوزخ کا رکھتے ہیں، نہ ہم کو شوقِ جنت ہے

نہ نکلے فرق اصل و نقل کا اس میں، یہ کیا ممکن
یہاں جنت کا سنتے ہیں، ترے گھر کی سی صورت ہے

مائلؔ، میر عالم علی خاں:

یہ سہسوان کے نقوی سادات کی شاخ صالحی کے نام لیوا تھے۔ اُن کے دادا کا نام عطامحی الدین صالحی تھا، جن کے خلف اکبر سیّد مودود بخش صالحی تھے جو رسالدار میر مودود بخش کے نام سے مشہور تھے۔ میر مودود بخش نے سہسوان کو خیرآباد کہہ کر بڑودہ کو مستقل جائے قیام بنالیا تھا۔ انگریز سرکار کے بہی خواہ تھے لہٰذا 'خان' کا خطاب حاصل کیا۔ چنانچہ اس خاندان کے افراد بجائے صالحی کے اپنے نام کے ساتھ 'خان' لکھنے لگے۔

میر مودود بخش کے تین فرزند تھے۔ میر عالم علی، میر بنیاد علی اور خان بہادر میر مظہر علی۔ اول الذکر غالبؔ کے شاگرد تھے۔

مائلؔ کی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی تھی، لیکن خاندانی اثرات کے تحت انھوں نے جدید علوم پر واجب استعداد حاصل کرلی تھی۔ صاحبِ 'سخنورانِ گجرات' نے لکھا ہے:

> ''موصوف حسن صورت اور حسن سیرت کے اعتبار سے شہرت رکھتے تھے۔ لوگ دور دور سے ان کے دیدار اور شرف ملاقات کے لیے آتے تھے''۔ (سخنورانِ گجرات، ص:۲۲۵)

میر ابراہیم علی خاں وفاؔ کے عزیزوں میں تھے۔ مائلؔ کے برادرِ خورد میر بنیاد علی کو نواب موصوف کی بہن کلثوم النساء منسوب تھیں۔ نواب موصوف (یعنی وفاؔ) ان کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ انہی کی عنایت سے ریاست میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ غالبؔ کے جو خطوط وفاؔ کے نام ہیں ان میں مائلؔ کا ذکر ملتا ہے۔

ایک خط مکتوبہ ۲/اکتوبر ۱۸۶۶ء میں غالبؔ لکھتے ہیں:

> ''دو تین دن ہوئے کہ قبلہ و کعبہ میر عالم علی خاں کا خط آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ آزردہ تخلص کی دو غزلیں اصلاحی پہنچیں...''

خط کے اس اقتباس سے میر عالم علی خاں مائلؔ سے غالبؔ کی مکاتبت کا ثبوت ملتا ہے۔ صاحبِ 'سخنورانِ گجرات' نے لکھا ہے کہ ان کے نام مرزا کے کئی خطوط ہیں (ص:۲۲۵) یہ غلط ہے۔ مائلؔ کے نام مرزا کا کوئی خط ہنوز دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔ اسی

طرح انھوں نے مائلؔ کے سب سے چھوٹے بھائی میر مظہر علی (ف ۱۹۳۰ء) کو مائلؔ کا بیٹا لکھ دیا ہے (ص: ۲۲۵)۔ میر مظہر علی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مظہر علی کے بیٹے میر اظہر علی اظہرؔ سہسوانی (ف ۱۹۳۸ء) صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ امیرؔ مینائی (ف ۱۹۰۰ء) سے تلمذ تھا۔ آج کل اس خاندان کی اولاد سہسوان میں سکونت پذیر ہے۔

مائلؔ بھی حکیم سیّد احمد حسن فداؔ کے توسط سے جنوری ۱۸۶۶ء کے آس پاس غالبؔ کے شاگرد ہوئے۔ مائلؔ اور وفا دونوں ایک ساتھ یا آگے پیچھے غالبؔ کے شاگرد ہوئے (خط مورخہ ۱۷؍جنوری ۱۸۶۶ء بنام سیّد احمد حسن)۔ ایک اور خط میں غالبؔ نے ان تینوں ہم خاندان اور ہم وطن تلامذہ کو مخاطب کر کے لکھا ہے:

> ''آپ پر (سیّد احمد حسن) اور میر ابراہیم علی خاں اور میر عالم علی خاں پر میری جاں نثار ہے۔ مضٰی مامضٰی۔ اب ایک ایک غزل آپ تینوں صاحب بھیج دیا کیجیے۔ اسی طرح میں فرداً فرداً بعد اصلاح بھیج دیا کروں گا''۔
>
> (خط مکتوبہ ۲؍جون ۱۸۶۶ء، غالب کے خطوط، ج ۳، ص: ۱۰۳۳)

مائلؔ کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ تاریخ پیدائش و وفات کا بھی علم نہیں۔ صاحبِ 'سخنورانِ گجرات' نے لکھا ہے کہ مائلؔ نے عین عالمِ شباب میں ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء میں انتقال کیا (ص: ۲۲۵)۔ لیکن حنیف نقوی نے مرزا قربان علی بیگ سالکؔ (ف ۱۸۸۰ء) کے ایک قطعہ تاریخ کی مدد سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مائلؔ ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء تک بقید حیات تھے اور ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء میں تذکرہ طور کلیم اور بزمِ سخن کی تالیف و تکمیل سے قبل ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس طور مائلؔ کا انتقال ۱۸۷۷ء سے ۱۸۸۰ء کی درمیانی مدت میں ہوا (غالب: احوال و آثار، ص: ۱۸۲)۔ حنیف نقوی نے اپنے خاندان کی ایک بزرگ خاتون کی یہ روایت نقل کی ہے کہ مائلؔ سہسوان ہی میں گھوڑے کی پشت سے گر کر فوت ہوئے تھے (ایضاً، ص: ۱۸۲ء)۔ ظاہر ہے جب سہسوان میں وہ فوت ہوئے تو ان کی قبر بھی سہسوان کے کسی قبرستان میں ہوگی۔ لیکن سرِ دست قبر اور جائے مدفن سے اہلِ قلم ناواقف ہیں۔

مائلؔ کا چندے ذکر 'طور کلیم' (مرتبہ نورالحسن خاں کلیم) اور 'بزمِ سخن' (مرتبہ علی حسن

خاں سلیم) میں ملتا ہے۔ کلام کمیاب ہے۔ 'تلامذۂ غالب' (طبع اول) میں صرف ۳ شعر نقل ہوئے۔ 'سخنورانِ گجرات' میں مزید ۵ شعروں کا اضافہ ہوا اور ۸ شعر نقل ہوئے۔ 'غالب: احوال و آثار' میں غزل کے ۵ نئے شعر اور دو تاریخی قطعات کا اضافہ ہوا۔ اس طور اب تک کل ۱۷ اشعار دستیاب ہوسکے۔ 'تلامذۂ غالب' طبع دوم میں ان ۱۷ اشعار کو درج ترجمہ کرلیا گیا ہے۔ لیکن ترجمہ میں شامل اشعار کی تعداد ۱۸ ہے۔ دراصل ۹ اشعار کی غزل کا مطلع مکرر نقل ہوگیا ہے۔ قطعاتِ تاریخ کو چھوڑ کر غزل کے کل ۱۳ اشعار نقل کیے جارہے ہیں:

منہ رکھ کے میرے منہ پہ، وہ کہتے ہیں پیار سے
مائلؔ ہے اب بھی جی میں ترے کچھ ہوس رہی

گل پوش بعد مرگ ہمارا مزار ہے — کیا لطف ہے کہ عین خزاں میں بہار ہے
پستان انار، رشکِ گل تر عذار ہے — پھولا پھلا ہوا چمنِ حسنِ یار ہے
اتنا غرور حسن دو روزہ یہ کس لیے — غافل! عروج نشہ کو آخر خمار ہے
چھاتی سے کیوں لگائے نہ رکھوں میں روز و شب — ناسور سینہ دل کا مرے یادگار ہے
کیفیتیں نئی ہیں خراباتِ دہر کی — جو ہوش میں نہیں ہے، وہی ہوشیار ہے
ظالم، کدورتوں کی تری انتہا ہے کچھ — ہم خاک ہوگئے، ترے دل میں غبار ہے
انکارِ بادہ ساقی سے، ناصح نہ ہوسکا — معذور ہوں کہ طبعِ مروّت شعار ہے
کیوں کر اٹھا سکے وہ مسی کی دھڑی کا بار — اپنا ہی رنگ جس لبِ نازک پہ بار ہے
حیلہ سے منہدی ملنے کے ہاتھ اس کے چھو لیے — مائلؔ بھی اپنے فن کا بڑا دستکار ہے

خطا ثابت کریں گے اپنی ہم، اور ان کو چھیڑیں گے
سنا ہے، ان کو غصّے میں چمٹ جانے کی عادت ہے

دلِ مائلؔ کی چندے آپ کو لازم رعایت ہے — یہ میرا ناز پرور، نو گرفتارِ مصیبت ہے

کہتے ہیں وہ مدام کہ ہیں تابع رضا — مائلؔ ہے جی میں آج انھیں آزمائیے

میر ابراھیم علی خان وفا سھسوانی

(ماخذ: تلامذہ غالب، مالک رام، دہلی ۱۹۸۷)

وفاؔ (طالبؔ)، میر ابراہیم علی خاں:

یہ بھی سہسوان کے نقوی سادات میں تھے۔ ان کے جدِ اعلیٰ میر سرفراز علی خاں اٹھارہویں صدی کے اواخر میں نقلِ مکان کر کے بڑودہ چلے گئے تھے۔ وہاں مہاراجہ گووند راؤ گائیکواڑ کے دربار میں رسائی ہوئی۔ بہت جلد فوجی لیاقت، ذاتی ذہانت اور قابلیت کے سبب مہاراجہ کے قریب ہوگئے۔ مہاراجہ نے ان کی کارکردگی سے خوش ہوکر انھیں کاٹھیاواڑ میں کھانڈیا اور دراوڑی جاگیر دوامی عطا کی۔ انھوں نے کئی بار ایسٹ انڈیا کمپنی اور سرکار گائیکواڑ کے درمیان سفارتی خدمات بھی انجام دیں۔

میر سرفراز علی خاں کے تین فرزند میر اکبر علی، میر جعفر علی اور میر باقر علی تھے۔ میر اکبر علی اپنے والد کی وفات کے بعد سلحہ دار سردار نامزد کیے گئے۔ میر ابراہیم علی خاں انہی کے فرزند تھے۔

میر سرفراز علی کے دو بیٹے میر اکبر علی اور میر جعفر علی کو نواب سورت افضل الدولہ کی بیٹیاں منسوب تھیں۔ اکبر علی کی زوجہ کا انتقال نواب سورت کی زندگی ہی میں ہوگیا تھا۔ اس کے بعد وہ بڑودہ چلے آئے اور دوسری شادی کی۔ وفاؔ زوجۂ ثانی کے بطن سے ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء میں بڑودہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تاریخی نام سیّد غلام حسن (۱۲۶۳ھ) تھا (دیوانِ فدا، ص: ۳۸)۔ صاحبِ 'سخنورانِ گجرات' نے ۱۸۳۵ء تا ۱۸۴۰ء کی درمیانی مدت میں ان کا پیدا ہونا لکھا ہے (ص: ۲۲۳) جو غلط ہے۔

وفاؔ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد سورت میں اپنے چچا نواب میر جعفر علی خاں سہسوانی (ف ۱۸۶۳ء) کے پاس رہے۔ میر جعفر علی خاں کی چھوٹی بیٹی نواب غلام بابا خاں کو منسوب تھی۔ غلام بابا خاں (جو غالبؔ کے مکتوب الیہ ہیں) کے نام غالبؔ کا پہلا خط ۶ رستمبر ۱۸۶۳ء کا ہے جس میں ان کے خسر نواب میر جعفر علی خاں کی تعزیت کرتے ہوئے ایک تاریخی قطعہ بھی ارسال کیا ہے۔

(خط نمبر ۱، غالبؔ کے خطوط، ج ر ۳، ص: ۱۰۵)

جعفر علی خاں، سورت کے نواب افضل الدولہ کے داماد تھے۔ نواب کی وفات کے بعد ان کے جانشیں ہوئے۔ یہاں وفاؔ نے منشی لطف اللہ فریدی سے عربی و فارسی اور انگریزی تعلیم کی تحصیل کی۔ تعلیم کی تکمیل سورت ہی میں ہوئی۔ ۱۸۶۰ء میں والد کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے اور سلح داری کا عہدہ ان کو منتقل کر دیا گیا۔

وفاؔ بڑودہ میں عہدہ و منصب کے لحاظ سے بھی سرفراز تھے اور اپنے خاندانی علم وفضل کے سبب بھی۔ سرکار انگریزی نے بھی ان کے بزرگوں کو خانی کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔ ۲۸؍نومبر ۱۸۸۱ء کو انھیں بھی سی آئی ای کے اعزاز سے سرفراز کیا۔ سیّد احمد حسن فداؔ نے تاریخ کہی۔ مادۂ تاریخ سے متعلق دو شعر درج کیے جاتے ہیں:

فکر تاریخ کی ہوئی جو فداؔ ہاتف غیب نے یہ فرمایا

پائے محمود چوم لے اور لکھ آج تمغاے قیصری آیا

(+۴) ۱۸۷۷ء=۱۸۸۱ء

بڑودہ کے منشی غلام قادر کی صاجزادی وفاؔ سے منسوب تھیں، جن سے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تولد ہوئیں۔ میر احتشام علی، میر یوسف علی، میر ناصر علی اور میر محمود علی۔ اول الذکر (میر احتشام علی خاں) شاعر بھی تھے، جادو تخلص تھا۔ ابتدا میں ظہیرؔ دہلوی سے، بعد میں نجم الدین احمد ثاقبؔ بدایونی (ف ۱۹۴۵ء) سے اصلاح لی۔ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ پیدائش ۱۸۶۸ء میں ہوئی تھی۔ مئی ۱۹۰۷ء میں انتقال کیا۔ غالبؔ نے ان کی پیدائش پر ایک قطعہ و رباعی کہی تھی جو آئندہ اوراق میں مکتوبات کے تحت درج ہوگی۔ غالبؔ نے ان کا تاریخی نام 'ارشاد حسین خاں' (۱۲۸۵ھ) تجویز کیا تھا لیکن خاندان میں 'علی' کے لاحقے سے نام چلے آرہے تھے لہٰذا 'احتشام علی' نام تجویز ہوا۔

مولف 'خم خانۂ جاوید' نے ثاقبؔ بدایونی کے تلامذہ میں وفاؔ کے تیسرے بیٹے میر ناصر علی ناصرؔ کا بھی ذکر کیا ہے، لہٰذا ان کا شاعر ہونا بھی یقینی ہے۔ (ج ۲، ص: ۱۷۲)

وفاؔ کی طبیعت مذہب وتصوف کی طرف مائل تھی۔ احمد آباد کے ایک صوفی شیخ محمود

میاں چشتی کے مرید تھے۔ ہر ماہ اپنے درِ دولت پر محفلِ میلاد منعقد کرتے تھے۔ سیّد ظہیرالدین مدنی نے ان کا سراپا اِن الفاظ میں کھینچا ہے:

"وفاؔ خوش رو اور وضع دار شخص تھے۔ قد میانہ، بدن چھریرا اور رنگ صاف تھا۔ داڑھی بہت خوبصورتی کے ساتھ ترشواتے تھے۔ سر پر بڑودوی پگڑی، انگرکھا اور آڑا پاجامہ پہنتے تھے۔ آنجہانی مہیش پرشاد بنارس والوں کے پاس بھی ان کی تصویر تھی۔ میر صاحب بہت خوش گلو تھے۔ ہر ماہ اپنے دولت کدے پر مجلسِ میلاد منعقد کرتے اور خود قصائد میلاد پڑھتے۔ آواز میں درد تھا۔ جب موصوف پڑھتے تو مجلس میں سکتہ کا عالم ہوجاتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا شہرہ لکھنؤ تک پہنچا تھا اور عالم پیا نے انھیں بلاکر سنا اور خوب داد دی تھی، مگر ۱۸۵۷ء میں تو عالم پیا کا کھیل ختم ہو چکا تھا، ممکن ہے مٹیابرج میں انھیں طلب کیا گیا ہو"۔

(سخنورانِ گجرات، ص: ۲۲۳)

صاحبِ 'سخنورانِ گجرات' (۲۲۴:) اور صاحبِ 'تلامذہ غالب' (طبع اول، ص:۲۹۶) دونوں نے ان کا سالِ وفات ۱۸۸۵ء لکھا ہے۔ لیکن 'زبانِ داغ' (مرتبہ رفیق مارہروی، لکھنؤ سنہ ندارد، ص: ۱۱۴) میں وفاؔ کے نام داغؔ دہلوی کا ایک خط مکتوبہ ۱۰/اپریل ۱۸۸۷ء ملتا ہے۔ یہ ایک مستحکم شہادت ہے، اس امر کی کہ وفاؔ اپریل ۱۸۸۷ء تک بقیدِ حیات تھے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے وفاؔ کی اولاد کی شادیوں کے دعوت ناموں اور اپنے نانا منشی شاکر حسین نکہتؔ سہسوانی (ف ۱۹۵۲ء) سے وفاؔ کی مراسلت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ۱۵/اگست ۱۸۸۸ء تک وفاؔ کا بقیدِ حیات ہونا درست قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں اگست ۱۸۸۸ء کا عرصہ مرض الموت کا تھا جس کے بعد ان کے نانا سے مراسلت بند ہوگئی۔ اس طرح ان کا سالِ وفات ۱۸۸۸ء قرار دینا قرینِ صحت ہوگا۔ مالک رام نے 'تلامذۂ غالب' طبعِ دوم میں حنیف نقوی کے بیان کو درست پاتے ہوئے اگست ۱۸۸۸ء کے بعد ہی وفاؔ کا فوت ہونا لکھا ہے (ص:۷ ۵۴)۔

وفاؔ، غالبؔ کے چہیتے شاگردوں میں تھے۔ سلسلۂ شاگردی ۱۸۶۶ء میں بتوسط حکیم احمد حسن فداؔ قائم ہوا تھا، جیسا کہ غالبؔ کے ایک مکتوب بنام احمد حسن، محررہ ۱۷رجنوری ۱۸۶۶ء سے پتا چلتا ہے۔ غالبؔ لکھتے ہیں:

"آپ کا حکم بے تکلف مانوں گا۔ جناب ابراہیم علی خاں اور حضرت میر عالم علی خاں صاحب کی خدمت گزاری کو اپنا فخر و شرف جانوں گا"۔ (غالب کے خطوط، ج ر ۳، ص: ۱۰۳۲)

'اردوئے معلیٰ' میں وفاؔ کے نام غالبؔ کے چند خطوط ہیں، جن پر آئندہ سطور میں گفتگو کی جائے گی۔ وفاؔ کے دیوان کا ذکر کہیں نظر سے نہیں گزرا۔

مالک رام نے 'تلامذۂ غالب' طبعِ اول میں آٹھ شعر اور طبعِ دوم میں پندرہ اشعار کا اندراج کیا۔ ظہیر الدین مدنی نے ۴ اشعار کا مزید اضافہ کیا اس طور غزل کے ۱۹ اشعار ہی دستیاب ہو سکے:

بہت دم بھی دیے، کیں التجائیں، پر نہ آئے وہ ۔۔۔ وفاؔ ہم کو نہایت ناز تھا، جادو بیانی پر

ارمان کچھ اِرم کے نہ باغِ جناں کے ہیں ۔۔۔ ہم تو نثار سیّدِ کون و مکاں کے ہیں
تیر نگاہِ یار کا آماجگاہ ہوا ۔۔۔ یہ حوصلے ہمارے دلِ ناتواں کے ہیں
کہتے ہیں آسماں پہ ملائک بھی الحفیظ ۔۔۔ شعلے بلند یہ مری آہ و فغاں کے ہیں
بس ہے، بسر ہو عمر دو روزہ جو چین سے ۔۔۔ ارمان کس کو زندگیِ جاوداں کے ہیں
کیا غم جو ہو وسیلۂ محمود حشر میں ۔۔۔ طالبؔ! مرید آپ تو قطب زماں کے ہیں

کب لبوں پر مرے، نالے نہیں، فریاد نہیں ۔۔۔ کب تری وعدہ فراموشی مجھے یاد نہیں
شاد ہوں، سینے میں جب سے دلِ ناشاد نہیں ۔۔۔ اب وہ شیون نہیں، وہ نالہ و فریاد نہیں
ہے مرے قتل کو اک جنبشِ ابرو کافی ۔۔۔ تیغ کیوں باندھتے ہو تم کوئی جلاد نہیں
کھینچ لیں گے تری تصویر تصوّر میں ہم ۔۔۔ کیا ہوا دہر میں، مانی نہیں، بہزاد نہیں

رنجِ عشاق سے کب چین ہے معشوقوں کو　　صید کی فکر میں صیاد بھی آزاد نہیں
چھیڑنے کو یہ جفا اس کی، وفاؔ ہے، ورنہ　　طبع اس شوخ کی کچھ مائل بیداد نہیں

وہاں نہ جانے کا لیتے ہو وعدہ مجھ سے ولے　　زباں سے لاکھ کہوں، دل پر اختیار نہیں
نہ دو دِل اُس گل رعنا کو، اے وفاؔ! دیکھو　　گلوں کے حسنِ دو روزہ کا اعتبار نہیں

بجا لاؤ وفاؔ! شکر خدا، ہو صاحبِ قسمت　　کیا استاد اپنا تم نے غالبؔ سے سخنداں کو

کبھی یاد آتا ہے ہٹنا ترا شرما کے جانانہ　　کبھی ہنس کر چمٹ جانا وہ تیرا بے حجابانہ
بت میکش تری بانکی ادا پھرتی ہے نظروں میں　　کبھی زلفوں کا بل کھانا، کبھی وہ چال مستانہ
ہوئی آخر تمھارے ہجر میں یہ جوششِ وحشت　　اجاڑا ہم نے بستی کو، بسایا جا کے ویرانہ
بیانِ دردِ فرقت کر کے، تم احساں جتاتے ہو　　کہانی آپ کی سُن لی، مرا اب سنیے افسانہ

منشی آغا علی سہسوانی:

غالبؔ کے تلامذہ میں ان کے نام کا اضافہ تاریخِ سہسوان (قلمی) کے حوالے سے ڈاکٹر حنیف نقوی نے کیا۔ تاریخِ سہسوان (از قلم سیّد اعجاز احمد معجزؔ سہسوانی، مملوکہ ڈاکٹر حنیف نقوی) میں یہ تذکرہ استادانِ فارسی ان کے نام کے ساتھ تلمیذ غالب لکھا ہے۔ 'تلامذۂ غالب (طبع دوم) میں مالک رام نے منشی آغا علی کے نام کا اضافہ ڈاکٹر حنیف نقوی کے مضمون کے حوالے سے کیا لیکن اس پر معجزؔ تخلص کا اضافہ کر دیا۔ معجزؔ تخلص دراصل تاریخِ سہسوان کے مصنف کا ہے۔ مالک رام کو تسامح ہوا۔ ابھی تک منشی آغا علی کے تخلص کا علم نہیں ہوسکا۔ ڈاکٹر نقوی نے ان کے بارے میں مختلف ماخذ اور بزرگوں کی یادداشت کے حوالے سے جو معلومات درج کی ہیں وہ سطورِ ذیل میں درج کی جاتی ہیں:
منشی آغا علی، عباسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ساداتِ سہسوان سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ سیّد آل حسن امروہوی نے 'نخبۃ التواریخ' (عمدۃ المطابع امروہہ، ۱۸۸۰ء،

ص:۳۹) میں انھیں ساداتِ مودودی میں شامل کرلیا ہے جو درست نہیں۔ ان کے دادا حضرت غلام علی شاہ عباسی یا ان کے والد، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں سنڈوڑہ سے ترکِ وطن کرکے سہسوان میں آباد ہوگئے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ صاحبِ حیثیت رہے ہوں گے۔ سہسوان میں غلام علی شاہ نے ایک مسجد تعمیر کرائی جو 'غلام علی شاہ کی مسجد' کے نام سے آج تک موسوم ہے۔

منشی آغا علی کے والد کا نام منشی نادر علی تھا۔ وہ ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز تھے۔ ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء میں امروہہ میں ان کی موجودگی کا پتا چلتا ہے۔ تاریخِ سہسوان میں تیرہویں صدی ہجری کے جن علما وفضلا کا تذکرہ ملتا ہے ان میں آغا علی کو بھی فارسی کا عمدہ ناظم و ناثر لکھا گیا ہے۔ (ص:۵۵)

منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کے حسبِ ذیل قطعے سے ان کا سالِ وفات ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء برآمد ہوتا ہے:

رفت چوں آغا علی از دارِ فانی یک بیک   زد رقم تسلیم محزوں بہر سالِ ماتمش
طبع بیتابی گرفت و نالہ را بگزید دل   دست افسوس آشنا شد سر بسر اندر غمش

(۸۱ + ۴۲۵، ۸۶ + ۳۴   ۴۶۴ + ۲۰۷ = ۱۲۹۷ھ)

(غالب: احوال و آثار، ص: ۱۹۴، ۲۲۰، ۲۲۱)

غالبؔ سے تلمذ کا غلط انتساب

بدایوں کے تین شعرا کے نام غلطی سے غالبؔ کے تلامذہ میں شامل کر لیے گئے۔ ان کی نشاندہی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

۱- اسیرؔ، علی احمد خاں (۱۸۵۱-۱۹۲۷ء): یہ بڑے عالم و فاضل، فارسی و اردو کے قادرالکلام شاعر تھے۔ سینٹ جانس کالج آگرہ میں عربی و فارسی کے معلم رہے۔ شاعری میں مذاقؔ بدایونی اور ان کے شاگرد امجد حسین امجدؔ بدایونی (ف ۱۹۲۰ء) سے تلمذ تھا۔ کلام مطبوعہ موجود ہے۔ علاوہ شاعری کے تصنیف و تالیف سے بھی شغف تھا۔ ضیاء القادری (ف ۱۹۷۰ء) نے اسیرؔ کے مجموعے 'منقبت خواجہ ولی ہند' (بدایوں، ۱۹۳۸ء) کے مقدمے میں ان کو غالبؔ و مومنؔ کا شاگرد لکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنے مقالے 'علی احمد خاں اسیرؔ بدایونی' (مطبوعہ 'العلم' کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۵۹ء) میں ان کے تلمذ پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے غالبؔ و مومنؔ سے ان کے تلمذ کی نفی کی ہے۔ دراصل اسیرؔ کے علم و فضل اور فارسی دانی کی شہرت کے ساتھ ہی ان کا غالبؔ سے تلمذ کا بھی غلط انتساب ہوگیا۔ اسی تعلق سے بعض روایتیں بھی مشہور ہوگئیں۔ نظامیؔ بدایونی نے بھی اپنی تالیف 'نکاتِ غالب' (طبع سوم ۱۹۵۹ء، ص: ۵۹) میں 'مرزا غالبؔ

کے انمول نکتے' عنوان کے تحت اسیرؔ کی غالبؔ سے ملاقات اور اسی ضمن میں ایک لطیفہ نقل کیا ہے جو تلمذ ہی کی طرح بے بنیاد ہے۔ یہ لطیفہ اس سے قبل کی دو اشاعتوں (۱۹۲۰ء، ۱۹۲۴ء) میں درج نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظامیؔ کی وفات (۱۹۴۷ء) کے بعد یہ لطیفہ اس تیسری اشاعت (۱۹۵۹ء) میں اضافہ کیا گیا۔ گمان بدرجۂ یقین ہے کہ یہ لطیفہ مفتی انتظام اللہ شہابی کی کتاب 'غالب کے لطیفے' (دلّی، ۱۹۴۷ء) سے اخذ کیا گیا ہے، کیوں کہ پہلے پہل یہ لطیفہ اسی کتاب کے صفحہ ۵۲ پر پیش کیا گیا تھا۔ اس کتاب کے اکثر لطائف من گھڑت ہیں۔

اسیرؔ کا کلام تذکروں اور گلدستوں میں میری نظر سے گزرا ہے۔ شعرائے بدایوں کے متعدد مجموعوں پر ان کی تقاریظ، تاریخی قطعات اور خود ان کی اکثر مطبوعات میرے زیر نظر رہی ہیں۔ ان میں کہیں بھی غالبؔ سے تلمذ کا اندراج نہیں ہے۔

نواب زکریا خاں زکیؔ کے دیوان 'دیوانِ زکی' (دہلی ۱۸۹۵ء) کے آخر میں اسیرؔ کا ایک قطعۂ تاریخ شامل ہے جس کی ردیف 'غالب' ہے۔ اس قطعے میں بھی غالبؔ سے تلمذ کا کوئی اشارہ نہیں۔ قطعہ حسبِ ذیل ہے:

صورت نگارِ معنی مثلِ زکی نہ باشد — جانِ کلیم و طالب، روح و روانِ غالب
آبِ حیات تازہ، معجز اثر کلامش — زندہ ازو بہ گیتی، نام و نشانِ غالب
نعلش بہ خویش نازد از شانِ میرزائی — دیوان او سراپا گویا زبانِ غالب
در فکرِ سالِ طبعش بودم اسیرؔ حیراں — گفتہ بگوش ہاتف طرزِ بیانِ غالب

۱۳۱۲ھ

۲- رساؔ، رکھی چند عرف رام دیال (۱۸۱۶-۱۸۸۰ء): جناب ویریندر پرشاد سکسینہ نے اپنے مضمون 'رام دیال رسا' (مشمولہ پگڈنڈی، امرتسر، جنوری ۱۹۶۱ء) میں انھیں غالبؔ کا شاگرد لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک دوسرے مضمون 'غالب کا ایک بدایونی شاگرد عزیز و صادق' ('ہماری زبان' دہلی، ۲۲ رجنوری ۱۹۶۹ء) میں بھی ان کا نام بہ زمرہ تلامذۂ غالب درج کیا ہے۔ سکسینہ صاحب کے مضمون کے حوالے سے 'تذکرہ شعرائے بدایوں' (ج ۱، ص: ۳۲۲) میں رساؔ کو شاگردِ غالبؔ لکھا گیا۔ رساؔ نے زندگی

ہی میں دیوان مرتب کرلیا تھا جو بعد از وفات ان کے بیٹے منشی گیندن لال گوہرؔ بدایونی (ف ۱۹۰۱ء) کی نگرانی میں 'دیوانِ رسا' کے نام سے مطبع قیصری، بریلی سے ۱۸۹۰ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس دیوان میں ان کا غالبؔ سے تلمذ کا اندراج نہیں ملتا۔ ۱۹۸۱ء میں راقم الحروف نے اپنی کتاب 'دید و دریافت' میں اس نسبت تلمذ کی تردید کی تھی (ص:۳۸)۔ مالک رام نے بھی 'تلامذۂ غالب' کے دونوں ایڈیشنوں میں رساؔ کا ذکر نہیں کیا۔ گذشتہ بیس سالوں میں 'غالب کے تلامذہ' سے متعلق تحریروں میں رساؔ کا بحیثیت شاگردِ غالبؔ ذکر نہیں آیا، لیکن سکسینہ صاحب رساؔ کی شاگردی غالبؔ کی نسبت پر بغیر کسی شہادت کے مصر ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں کراچی سے ان کی کتاب 'بدایوں کے اساتذۂ سخن' (کراچی، ۱۹۹۹ء) شائع ہوئی ہے۔ اس میں بھی صفحہ ۱۲ پر انھوں نے رساؔ کو غالبؔ کا شاگرد لکھا ہے جو صریحاً غلط ہے۔

۳- ضابطؔ، (چودھری) اصغر علی، رئیس کھیڑا (۱۸۴۲-۱۸۹۲ء): کلام پر کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ان کے درِ دولت پر اکثر مشاعرے ہوتے تھے جن میں بعض بیرونی اساتذۂ سخن بھی شریک ہوتے تھے۔ قیام اکثر لکھنؤ میں رہا۔ آفتاب احمد جوہرؔ بدایونی (ف ۱۹۸۱ء) نے 'میخانۂ جامی' (تذکرہ تلامذۂ جامیؔ و رونقؔ بدایونی۔ مرتّبہ عرفان زیدی، رامپور ۱۹۷۰ء) کے مقدمے میں (ص:۱۲) تلامذۂ غالب میں ان کا نام بھی شامل کرلیا تھا۔ بعد میں 'تذکرۂ شعرائے بدایوں' ج ۲/ میں انھیں مرزا غالبؔ کا دوست اور شاگرد لکھا گیا (ص:۳۳)۔ ضمیر الحسن ضمیرؔ بدایونی نے بھی اپنے مضمون 'غالبؔ کے بدایونی تلامذہ' (مجلّہ بدایوں، کراچی، اپریل ۱۹۹۴ء) میں انھیں غالبؔ کا شاگرد اور دوست لکھا (ص:۷۴)۔ ضابطؔ اپنے دور کے معروف شاعر تھے۔ ضخیم دیوان 'کلماتِ ضابط معروف بہ نغمۂ بہار' (۱۳۰۳ھ) انھوں نے اپنی زندگی ہی میں مرتّب کرلیا تھا جس کی اشاعت کا منصوبہ بن چکا تھا کہ اچانک وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ان کی وفات کے چند ماہ بعد ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ء میں یہ وکٹوریہ پریس بدایوں سے چھپ کر شائع ہوا۔ دیوان کے آخر میں متعدد تقاریظ اور تاریخی قطعات شامل ہیں۔ غالبؔ سے تلمذ کا کہیں کوئی مذکور نہیں۔

غالبؔ کے تلامذہ کے تلامذہ

غالبؔ کے شاگردوں کے بھی بدایوں میں متعدد شاگرد ہوئے۔ سطورِ ذیل میں اُن شعرائے بدایوں کے چند نام مختصر تعارف کے ساتھ درج کیے جا رہے ہیں جنھوں نے غالبؔ کے بعض نامور شاگردوں سے استفادہ کیا یا بالفاظِ دیگر خانوادۂ غالبؔ کے کسی ادیب و شاعر کے شاگرد رہے:

۱- اعجاز، (منشی) محمد عبدالعزیز سہسوانی (۱۸۳۶-۱۸۹۹ء): ان کا وطن سہسوان تھا لیکن بہ سلسلۂ ملازمت ریاست بھوپال و ریاست گوالیار میں مقیم رہے۔ بھوپال میں غالبؔ کے شاگرد مرزا محمد عباس رفعتؔ شروانی (ف ۱۸۹۷ء) سے فارسی میں مشورۂ سخن کیا۔ اردو میں نازش خیرآبادی (ف ۱۸۷۲ء)، اسیرؔ لکھنوی (ف ۱۸۸۲ء)، امیرؔ مینائی (ف ۱۹۰۰ء) سے تلمذ تھا۔ خوش نویسی میں کالکا پرشاد موجدؔ لکھنوی (ف ۱۸۶۹ء) کے شاگرد تھے۔ نام کے ساتھ 'اعجاز رقم' کا لاحقہ جڑا ہوا ہے۔

(تذکرۂ شعرائے بدایوں، ج ۱، ص: ۸۹)

۲- (مولوی) امام الدین ولد شیخ نورالدین بدایونی: عالم فاضل، تلمیذ مرزا شیفتہؔ و شاہ

عبدالعزیز محدث دہلوی و صاحب 'غیاث اللغات' مولوی غیاث الدین۔ مولف 'گلزارِ ہند' (مجموعہ رقعات مولوی امام الدین بنام مولوی احسان الکریم بہ ترتیب مولوی احسان الکریم، مطبع قیصری، بریلی، ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء)۔

(غالب اور عصرِ غالب، ص: ۱۸۳)

۳- بیخودؔ، عبدالحئی بیخود بدایونی (۱۸۵۷-۱۹۱۲ء): ۱۸۷۳ء کے آس پاس مولانا الطاف حسین حالیؔ (ف ۱۹۱۵ء) کے شاگرد ہوئے۔ حالیؔ کی مسدس مدوجزر اسلام (مطبوعہ ۱۸۷۹ء) کی اشاعت کے بعد تلمذ کا یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ (دیباچہ مرأۃ الخیال، ص: ۶)۔ بعد میں داغؔ دہلوی (ف ۱۹۰۵ء) کے شاگرد ہوکر شہرت حاصل کی دیوان مرأۃ الخیال (دہلی، ۱۹۱۰ء) کے علاوہ اور بھی چند شعری گلدستے ہیں۔

(دید و دریافت، ص: ۷۷ تا ۹۰)

۴- ذاکرؔ، محمد مجاہدالدین (۴/اپریل ۱۸۳۶-۶/جنوری ۱۹۱۶ء): محمد مصطفیٰ خاں شیفتہؔ (ف ۱۸۶۹ء) کے شاگرد تھے۔ تین ضخیم نعتیہ دیوان یادگار چھوڑے (قاموس المشاہیر ج/۱، ص: ۲۴۵)۔ مثنوی 'زہرِ عشق' کے سالِ تصنیف کے سلسلے میں ان کا ایک قطعہ بحث کا موضوع بنتا رہا ہے (مثنویاتِ شوق، ص: ۴۹ تا ۵۸)۔ بحیثیت شاعر ممتاز نہیں ہیں۔ (رک، شعرائے بدایوں- دربارِ رسول میں، ص: ۴۰ تا ۴۴)

۵- زلالیؔ، انصار حسین (۲۵/مئی ۱۸۵۷-۲۱/جولائی ۱۹۲۴ء): مولانا حالیؔ کے شاگرد تھے۔ حسرتؔ موہانی نے 'تذکرۃ الشعرا' (جزو پنجم، حصہ اول، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۱۵ء) میں تلامذۂ حالیؔ میں ان کے نام کا بھی اندراج کیا ہے۔ چند قصائد اور نظمیں مطبوعہ موجود ہیں۔ 'دیوانِ زلالی' (خطی) راقم الحروف کی ملکیت میں ہے۔

(رک، 'شعرائے بدایوں- دربارِ رسول میں، ص: ۴۵، ۴۶)

۶- صباؔ، صابر حسین سہسوانی (۱۸۳۷-۱۸۹۶ء): بہ سلسلۂ ملازمت ریاست رامپور و ریاست بھوپال میں مقیم رہے۔ فارسی میں غالبؔ کے دوست مولوی محمد نجف علی خاں نجف، خستہؔ و ملہمی صاحب دافع ہذیان (دہلی ۱۸۶۴ء) سے اردو میں ایوب

علی خاں گلشن اور شیخ علی بخش بیمار (ف ۱۸۵۴ء) سے مشورۂ سخن کیا۔ نہایت عالم و فاضل شخص تھے۔ (تذکرۂ شعرائے بدایوں، ج ۲، ص:۲۰)

۷- کاملؔ، (حکیم) محمد سعید الدین (۹ر مئی ۱۸۲۵ - ۱۱ر دسمبر ۱۸۹۸ء): نواب زین العابدین خاں عارفؔ دہلوی (ف ۱۸۵۲) سے تلمذ تھا۔ نواب محمد علی خاں والی ٹونک کے شفاخانہ کے مہتمم رہے۔ عربی و فارسی نثر و نظم کے نمونے دستیاب نہیں۔ اردو میں ایک نعتیہ قصیدے کے چند اشعار ملتے ہیں۔

(رک۔ شعرائے بدایوں - دربارِ رسول میں، ص:۶۶ تا ۶۸)

۸- ناطقؔ، نظام الدین (ف ۱۸۶۸ء): نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ دہلوی (ف ۱۸۲۷ء) کے شاگرد تھے۔ دیوان کا قلمی نسخہ نیشنل میوزیم کراچی میں موجود ہے۔ بدایوں کے قدیم گلدستوں میں ان کا کلام نظر سے گزرا ہے۔ عہد غالبؔ کے اچھے سخنور تھے۔ (رک۔ تذکرۂ شعرائے بدایوں، ج ۲، ص:۲۷۸)

۹- نظامیؔ، نظام الدین حسین (۱۸۷۲ - ۸ر جون ۱۹۴۷ء): ۱۸۹۶ء میں مثنوی صبح میلاد (بریلی، ۱۸۹۶ء) پر حالیؔ سے اصلاح لی۔ بعد میں حالیؔ ہی کے مشورے پر شاعری سے رغبت کم کردی اور نثر نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ ۱۹۰۳ء میں ہفتہ وار اخبار 'ذوالقرنین' کا اجرا کیا۔ ۱۹۰۵ء میں نظامی پریس قائم کیا۔ حالیؔ کے نظریۂ شعر و ادب کو زندگی بھر عزیز رکھا۔ ۱۹۳۵ء میں حالیؔ کے قصیدۂ غیاثیہ (۱۸۸۸ء) کو تضمین کیا اور اپنے پریس سے شائع کیا۔ ادب میں وہ حالیؔ اور سرسیّد کے متبع ہیں راقم الحروف نے ان کی ادبی خدمات پر علمی مقالہ لکھ کر پی ایچ. ڈی کی سند حاصل کی۔ (رک۔ نظامی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات، دہلی ۱۹۹۵ء)

بابِ سوم

بدایوں اور غالبؔ کے مکتوب الیہم

غالبؔ کے مکتوب الیہ

مرزا غالبؔ کے اردو مکتوب الیہم کی تعداد کم و بیش ۹۳ ہے۔ پانچ خطوط کے مکتوب الیہ نامعلوم ہیں (فہرست مشمولہ غالبؔ کے خطوط، ج ر ۴، ص: ۱۴۱۳-۱۴۱۴)۔ ان میں بعض مکتوب الیہم کے سوانحی کوائف غالبؔ اور متعلقاتِ غالبؔ پر ہزاروں صفحات رقم کیے جانے کے باوجود سیر حاصل دستیاب نہیں۔ ایسے مکتوب الیہم میں حکیم غلام نجف خاں (بدایونی) اور ان کے بیٹے حکیم ظہیرالدین خاں (بدایونی) کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو غالبؔ کے انتہائی نزدیک ہونے کے باوجود غالب شناسوں کی توجہ سے محروم رہے۔ منجملہ ان کے پانچ مکتوب الیہ (صادق، مدہوش، فداؔ، وفاؔ، زکیؔ) وہ ہیں جو شاعری میں بھی مرزا کے شاگرد تھے جن کے کوائف گذشتہ باب میں تحریر کیے جا چکے ہیں۔ بدایوں سے نسبت رکھنے والے غالبؔ کے یہ مکتوب الیہ اور ان کے نام خطوط کی تعداد حسبِ ذیل ہے:

۱- حکیم غلام نجف خاں (۲۵ خط)

۲- حکیم ظہیرالدین احمد خاں (۲ خط)

۳- عزیزالدین عزیز و صادق (۱ خط)

۴- سخاوت حسین مدہوشؔ (۱ خط)

۵- حکیم احمد حسن مودودی فداؔ (۱۱ خط)

۶- نواب میر ابراہیم علی خاں وفاؔ (۵ خط)

۷- نواب سیّد محمد زکریا خاں زکیؔ (۱ خط)

۸- قطب الدولہ (۲ خط)

غالبؔ کے اب تک ۸۹۴ اردو خطوط دستیاب اور مدون ہو چکے ہیں (غالب کے خطوط، ج/۵، ص: ۱۶۵) جو ہندوستان کی مختلف بستیوں، شہروں، اضلاع و ریاستوں میں آباد افراد کے نام ہیں۔ اس تعداد میں ۴۶ خطوط کے مخاطبین کا تعلق بدایوں سے ہے۔ دو خط فارسی کے ان کے علاوہ ہیں۔

سطورِ ذیل میں ان مکتوب الیہم کے غالبؔ سے ربط، قربت اور ادبی معاملات کو ان کے نام خطوط کی مدد سے روشنی میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جہاں ممکن ہو سکا ہے وہاں خط کے مضمون کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔

حکیم غلام نجف خاں اور حکیم ظہیر الدین کے کوائف گذشتہ باب میں شامل نہیں کیے جا سکے لہٰذا ان کے حالات و کوائف بھی پیش کیے جا رہے ہیں۔

۱
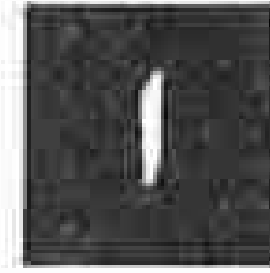
حکیم غلام نجف خاں

حکیم غلام نجف خاں، غالبؔ کے مکتوب الیہ بھی ہیں، شاگرد بھی اور منہ بولے بیٹے بھی۔ انہی کے ہم نام مولوی محمد نجف علی خاں خستہؔ و ملہمیؔ (ف شوال ۱۲۹۸ھ/ ستمبر ۱۸۸۱ء) تھے جنھوں نے سفرنگِ دساتیر (دہلی ۱۸۶۴ء)، دافع ہذیان (دہلی ۱۸۶۳ء) تصنیف کیں۔ عام طور پر ان کا نام مولوی نجف علی خاں جھجّری لکھا جاتا ہے۔ قدرے ملتے جلتے نام کے سبب اکثر معاملات میں غالب شناسوں کو التباس ہو جاتا ہے۔ چنانچہ

'پنج آہنگ' میں جو فارسی خط حکیم غلام نجف خاں کے نام ہے وہ مدتوں مولوی نجف علی خاں کی طرف منسوب رہا۔ اس امر کی وضاحت ابتدا میں اس لیے کی جارہی ہے تاکہ آئندہ مطالعے میں التباس کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔

حکیم غلام نجف خاں کے نام غالبؔ کے ۲۵ خطوط اردو میں ملتے ہیں۔ ۲۳ 'اردوئے معلیٰ' میں، ۲ کا اضافہ بعد کو ہوا۔ ایک مشفق خواجہ نے دریافت کیا (تحقیقی مضامین، ص: ۴۷) اور دوسرا سہ ماہی 'اردو' علی گڑھ (اپریل ۱۹۴۲ء) میں شائع ہوا تھا۔ فارسی میں ایک خط 'پنج آہنگ' میں شامل ہے۔ اردو کے کل خطوط 'غالبؔ کے خطوط' (مرتّبہ خلیق انجم، ج ر ۲ اور ج ر ۴) میں دیکھے جاسکتے ہیں۔۔ فی الوقت ۱۹ خطوط پر تاریخ وسنہ کا اندراج ملتا ہے۔ ۸ خطوط کی تاریخ تحریر کا تعین داخلی شواہد کی بنیاد پر کیا گیا ہے ان میں سے پہلا خط ۲۱ر دسمبر ۱۸۵۷ء کا مکتوبہ ہے اور انیسواں خط ۱۲ر نومبر ۱۸۶۵ء کا۔ گویا یہ خطوط تقریباً آٹھ سال کی مدت کو محیط ہیں۔ ۶ خط بدونِ تاریخ ہیں۔ یہ خط وکتابت مختلف ایام کی ہے۔ چند مقامی رقعے ہیں۔ کچھ ان ایام کی ہے جب ۱۸۵۷ء میں حکیم غلام نجف خاں دہلی چھوڑ کر اپنے وطن بدایوں کے لیے عازمِ سفر ہوئے اور مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے شیخو پور (بدایوں) پہنچے۔ ۱۸۶۵ء میں دوسری بار شیخو پور جانے پر بھی حکیم صاحب کو خط لکھے گئے ہیں۔ غالبؔ نے یہ خط دہلی سے بھی لکھے ہیں اور اثنائے سفر رامپور اور رامپور میں قیام کے دوران بھی۔ ان خطوط میں پنشن کے قضیے، دہلی کی تباہی، دربارِ رامپور کے حالات، دوستوں کے احوال اور ذاتی ضروریات وکیفیات وغیرہ کا بیان ہے جس کی وجہ سے ان خطوط کی تاریخی و ادبی افادیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ حکیم صاحب سے غالبؔ کے تعلقِ خاص اور دونوں کی ذاتی زندگی پر بھی ان خطوط میں چند اہم اشارے ملتے ہیں۔

ان خطوط میں میاں، بھائی، سعادت واقبال نشاں طال بقاؤہٗ، برخوردار سعادت و

اقبال نشاں، صاحب وغیرہ القاب کے ساتھ حکیم صاحب کو مخاطب کیا گیا ہے۔ خطوط میں غالب کا اندازِ تخاطب مشفقانہ، پدرانہ اور معلّمانہ ہے۔ اگرچہ عمر میں حکیم صاحب غالبؔ سے تقریباً بارہ سال چھوٹے تھے، بظاہر دوستی کے لیے یہ عمر کا کوئی بڑا تفاوت نہیں، لیکن طرفین کے درمیان تعلق بزرگ اور خرد کا سا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے جیسا کہ محمود احمد برکاتی نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ ''حکیم احسن اللہ خاں (ف ۱۸۷۳ء) جو طب میں حکیم غلام نجف خاں کے استاد تھے، غالبؔ کے دوست اور ہم سِن تھے۔ دوسرے حکیم غلام نجف خاں کو غالبؔ سے تلمذ کی نسبت تھی'' (العلم، کراچی، غالب نمبر ۱۹۶۹ء، ص: ۳۷۴، مآثر غالب، ص: ۴۲)۔ خطوط میں حکیم صاحب کو کثرت کے ساتھ لفظ 'تم' سے مخاطب کیا گیا ہے جس سے یہ باور ہوتا ہے کہ غالبؔ ان پر اپنا حق تصور کرتے تھے چنانچہ گاہے بہ گاہے ان کو مخاطب کر کے فرمائشیں بھی کرتے رہتے تھے، خطوط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ غالبؔ کو حکیم صاحب کی جدائی شاق گزرتی تھی اور وہ ان سے ملنے کے لیے بے چین اور ان کو اپنے آس پاس دیکھنے کے متمنی رہتے تھے۔ خطوط سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ حکیم صاحب غالبؔ کو مثل باپ اور استاد کے سمجھتے تھے اور ان کی اہلیہ کو والدہ اور استانی کا درجہ دیتے تھے۔ وہ عملاً اپنے قول وفعل سے اس کا مظاہرہ بھی کرتے تھے۔ خطوط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس رشتے کی بنیاد پر غالبؔ کی اہلیہ حکیم صاحب اور ان کے بیٹے حکیم ظہیرالدین سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ غالبؔ نے اپنے اور حکیم صاحب کے درمیان اس محبت و اخلاص کو خون کے رشتے سے تعبیر کیا ہے (خط نمبر ۱۴)۔ ایک خط میں انھوں نے حکیم صاحب کے کسی مسودے کی اصلاح کے لیے بھی آمادگی ظاہر کی ہے۔ اس سے ان کا غالبؔ سے اصلاح لینا بھی ثابت ہوجاتا ہے۔ (خط نمبر ۱۵) سطورِ ذیل میں خطوط سے چند اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں جو طرفین کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں:

N.M.1965.11

قبلہ و کعبہ جو حکم حضور کا [illegible] دنوں میں

[illegible]

والسلام

عکس تحریر حکیم غلام نجف خاں

(ماخذ: نقوش لاہور، خطوط نمبر، اپریل-مئی ۱۹۶۸ء، ص:۱۸)

''لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں؟ کچھ قابل لکھنے کے ہے؟ تم نے مجھ کو لکھا تو کیا لکھا؟ اور اب جو میں لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں؟ بس اتنا ہی ہے کہ ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے نہ میں لکھوں گا۔

ظہیر الدین کو میری دعا کہنا اور میری طرف سے پیار کرنا۔ تم کو اور ظہیر الدین کو اور اس کی ماں کو اور اس کی بہن کو اور اس کی لڑکی کو تمھاری ماں دعا کہتی ہے اور دعائیں دیتی ہے''۔

(خط نمبر ۲، مکتوبہ ۲۶ر دسمبر ۱۸۵۷ء)

''اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

نواسی کا حال معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اس کی ماں کو صبر دے اور زندہ رکھے۔ میں یوں سمجھتا ہوں کہ یہ چھوکری قسمت والی اور حرمت والی تھی۔

تمھاری استانی تم کو اور ظہیر الدین کو اور اس کی ماں کو اور اس کی بہن کو دعا کہتی ہیں اور میں ظہیر الدین کو پیار کرتا ہوں اور دعا دیتا ہوں''۔

(خط نمبر ۳، مکتوبہ ۱۹ر جنوری ۱۸۵۸ء)

''کہو! کوئی طرح شہر میں تمھارے آنے کی بھی ٹھہری یا نہیں؟ بُعد تیس کوس اور آدھ کوس کا برابر ہے۔ میری جان، تم ہنوز دو جانے میں ہو۔ مجھ کو بھی تم جانتے ہو کہ میرا شہر میں رہنا بہ اجازتِ سرکار کے نہیں اور باہر نکلنا بے ٹکٹ کے ممکن نہیں۔ پھر میں کیا کروں؟ کیوں کر وہاں آؤں؟ شہر میں تم ہوتے تو جرأت کر کے تمہارے پاس چلا آتا''۔

(خط نمبر ۷، مکتوبہ فروری و مارچ ۱۸۵۸ء)

ایک طویل خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

''اس وقت جی تم سے باتیں کرنے کو چاہا جو کچھ دل میں تھا وہ تم سے کہا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

از غالب بنام جان و جاناں واز جان و جاناں،
عزیز تر، حکیم غلام نجف خاں سلمہ اللہ تعالیٰ''

(خط نمبر ٦، مکتوبہ ١٨٥٨ء)

''تم اِس اپنے نام کے خط کو لے کر ڈیوڑھی پر جانا اور اپنی استانی جی کو پڑھ کر سنا دینا، اور خیر و عافیت کہہ دینا''۔

(خط نمبر ١٠، مکتوبہ ٢١؍جنوری ١٨٦٠ء بمقام میرٹھ، اثنائے سفر)

''یہ تم کیا لکھتے ہو کہ گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو۔ تم کو جو خط لکھتا ہوں گویا تمھاری استانی جی کو لکھتا ہوں۔ کیا تم سے اتنا نہیں ہوسکتا کہ جاؤ اور پڑھ کر سناؤ... تم یہ خط میرا ہاتھ میں لیے جاؤ اور حرف بہ حرف پڑھ کر سناؤ...

یہاں کا رنگ نواب صاحب کے آنے پر جو ہوگا اور جو قرار پائے گا وہ مفصل تم کو لکھوں گا اور تم اپنی والدہ کو سنا دینا اور ہاں بھائی یہ بھی گھر میں پوچھ لینا کہ کِدار ناتھ نے اندر باہر کی تنخواہ بانٹ دی؟ میں نے تو وفاداری اور حلال خوری تک کی بھی تنخواہ بھیج دی ہے''۔

(خط نمبر ١٢، مکتوبہ ١٤؍فروری ١٨٦٠ء)

''تمہارے یہاں نہ ہونے سے ہمارا جی گھبراتا ہے، کبھی کبھی ناگاہ ظہیرالدین کا آنا یاد آتا ہے۔ کہو اب خیر سے کب آؤ گے؟ کَے برس، کَے مہینے، کَے دن راہ دکھاؤ گے؟ یہاں کا حال جیسا کہ دیکھ گئے ہو بدستور ہے۔ زمین سخت ہے آسماں دور ہے''۔

(خط نمبر ١٣، ١١؍جنوری ١٨٦٣ء)

''یہ تم جو پھوڑے پھنسی میں مبتلا رہتے ہو، اس کا سبب یہ کہ مجھ میں تمہارا لہو ملتا ہے اور میں احتراقِ خون کا پُتلا ہوں ...تم سے تو میرا پیارا پوتا ظہیرالدین اچھا کہ جاتے وقت مجھ سے مل گیا اور وہاں پہنچتے ہی مجھ کو خط لکھا''۔ (خط نمبر ١٤، یکم اپریل ١٨٦٥ء)

”تم نے وہ مسوّدہ کیوں نہیں بھیجا؟ میں خدمت گزاری کو آمادہ ہوں“۔

(خط نمبر ۱۵، ستمبر ۱۸۶۵ء)

”تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم میں یہاں خوش اور تندرست ہوں“۔

(خط نمبر ۱۷، ۲۱ر اکتوبر ۱۸۶۵ء)

”ایک نسخہ اس کے پاس ماءاللّحم کا ہے وہ کھچوادو اور ذرا خبر لیتے رہو... اسمٰعیل خاں صاحب کو میری دعا کہو اور کہو کہ ڈیوڑھی کی سیڑھی بنوا دیں اور حویلی کے پائے خانے کی صورت درست کرا دیں“۔

(خط نمبر ۱۹، ۱۲ر نومبر ۱۸۶۵ء)

”حکیم غلام نجف خاں سنو! اگر تم نے مجھے بنایا ہے استاد، یعنی استاد اور باپ کہتے ہو۔ یہ امر اگر از روئے تمسخر ہے تو خیر اور اگر از روئے اعتقاد ہے تو میری عرض مانو اور ہیرا سنگھ کی تقصیر معاف کرد“۔

(خط نمبر ۲۰، مقامی بدون تاریخ)

”پرانے اور پتلے چانول آئیں۔ ایک روپے کے خرید کر کے بھیج دو“۔

(خط نمبر ۲۳، بدونِ تاریخ)

”تم کسو شخص سے اس کی نقل کراؤ اور کاتب خوش نویس یعنی مرزا عباد اللہ بیگ سے لکھواؤ“۔ (خط نمبر ۲۴، بدونِ تاریخ)

خطوط کے منقولہ صدر اقتباسات حکیم صاحب سے غالبؔ کی محبت اور غالبؔ کی زندگی میں ان کے عمل دخل کے مظہر ہیں۔ حکیم صاحب کے ساتھ غالبؔ کا رویہ بھی پوری طرح ان خطوط سے واضح ہو جاتا ہے۔ حکیم صاحب کے نام غالبؔ کے خطوط میں جو تاریخی واقعات کی طرف اشارے ملتے ہیں، ان پر غالبؔ سے متعلق تحریروں میں بارہا اظہارِ خیال کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا ان پر کچھ لکھنا اس تحریر کو طول دینے کے مترادف ہوگا۔

حکیم غلام نجف خاں کا ذکر غالب کے دوسرے مکتوب الیہ مرزا شہاب الدین

ثاقبؔ (ف ۱۸۶۹ء)، نواب مرزا علاء الدین احمد خاں علائی (ف ۱۸۸۴ء)، مولوی عزیز الدین صادقؔ (ف ۱۸۹۴ء) کے نام خطوط میں بھی آیا ہے مگر منفرد انداز میں۔ علائی کے نام ایک خط مکتوبہ ۱۵رفروری ۱۸۶۲ء میں غالبؔ نے حکیم صاحب کو ''دوست قدیم صادق الولا'' لکھا ہے (خط نمبر ۱۶) اور مرزا شہاب الدین خاں کے نام خط میں جو غصے کے عالم میں لکھا گیا ہے، حکیم صاحب کو ''لڑکا'' لکھ کر دل کا بخار نکالا ہے:

''بھائی شہاب الدین خاں، واسطے خدا کے یہ تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں خدا جانے کس ولدالزنا نے داخل کر دیے ہیں ...ایک تو لڑکے میاں غلام نجف، دوسرے تم۔ میری کم بختی بڑھاپے میں آئی کہ میرا کلام تمہارے ہاتھ پڑا''۔ (خط نمبر ۲، مارچ ۱۸۵۸ء)

یہاں یہ اشکال بھی درج کر دینا مناسب ہوگا کہ خط نمبر ۹ مکتوبہ ستمبر ۱۸۵۸ء حکیم صاحب کے نام معلوم نہیں ہوتا۔ اس خط میں تمام خطوط کے برخلاف القاب میں لفظ قبلہ اور تخاطب کے لیے دو مرتبہ ''تم'' کی جگہ ''آپ'' کا استعمال ہوا ہے۔ حکیم صاحب کے نام جملہ خطوط کا بیک نظر مطالعہ کرنے کے بعد یہ تمیز کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے کہ اس خط کا اندازِ تحریر ان کے نام کے دوسرے تمام خطوط سے مختلف ہے۔ مالک رام نے بھی شاید اسی بنا پر اس خط کے غلط انتساب کی نشاندہی کی تھی، جس پر توجہ نہیں دی گئی۔ وہ لکھتے ہیں:

''خطوطِ غالب میں حکیم غلام نجف خاں کے نام ۲۳ خط ملتے ہیں، لیکن ان میں سے ایک یعنی نمبر ۹ غالباً ان کے نام کا نہیں اور غلطی سے ان سے منسوب ہو گیا ہے''۔ (تحقیقی مضامین، ص:۵۱)

محققینِ غالب کو اس خط کے اصل مکتوب الیہ کے بارے میں تحقیق مزید کرنی چاہیے۔

غالبؔ کے نام حکیم غلام نجف خاں کے دو خط کے عکس 'نقوش' لاہور، خطوط نمبر ج ر ا (اپریل مئی ۱۹۶۸ء) میں شامل ہیں۔ ایک خط فارسی میں ہے، دوسرا اردو میں۔ دونوں خطوط پر مقام و تاریخِ کتابت کا اندراج نہیں۔ یہ دستی رقعے معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے

پتا چلتا ہے کہ غالبؔ کی نگارشات کی کتابت حکیم صاحب کے ذریعے انجام پاتی تھی۔ فارسی خط صحیح طور پر پڑھنے میں نہیں آسکا۔ اس کی بڑی وجہ حکیم صاحب کا بدخط ہونا ہے۔ اگرچہ 'نقوش' ص: ۱۳ پر اس خط کا متن بھی نقل ہوا ہے مگر وہ اصل سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ذیل میں خط کا وہ متن پیش کیا جارہا ہے جو ہمارے اپنے مطالعے میں آسکا۔ جو لفظ پڑھنے میں نہیں آسکے ہیں وہاں پر نقطے لگادیے گئے ہیں:

"قبلہ من! ہر سہ مسودہ بعد معائنہ صحیح و درست برآمدند۔ مسودہ رقعۂ جناب صاف نمودہ آمد و ہر دو مسودہ لالہ صاحب یکے فارغ خطی و دویمی ...صاف خواہد شد۔ مگر بندۂ نیازمند احتیاطاً برائے ملاحظۂ عالی آں ہم فرستادہ است۔ و یک سطر خود بدیں عبارت 'رقعۂ دستخطی خاں صاحب (یعنی غالب) بنابر ایصالِ سودِ سابق و حال ...نویسایندہ گرفتم' افزودہ شد۔ دراں ہیچ قباحت نیست کہ در فارغخطی جناب ہم ...الفاظ نوشتہ آمد بعدِ سہ چار سطر۔ بعد ملاحظہ واپس فرمایند کہ نویسایندہ شود۔

والتسلیم

غلام نجف"

(عکس مشمولہ 'نقوش' ص: ۱۳)

منقولہ خط کے مضمون کے بارے میں علم نہیں ہوسکا۔ دوسرا خط حسبِ ذیل ہے:

"قبلہ و کعبہ! جو حکم حضور کا۔ دو تین دن میں دے دیں گے۔ اے حضرت، وہ سطر تو کاغذ افشانی (افشاں؟) پر لکھ چکے، اب کیا ہوئے گا؟ عُجب کی بات ہے کہ جو دیکھے گا، ہنسے گا، اور دوسری بات یہ ہے کہ سلطانہا یا سلطانۂ کے کیا معنی؟ چاہیے سلطنتہا یا سلطنتۂ۔ خوب غور فرمایئے میری عرض پر، اور جواب اس کا عنایت فرمایئے۔ والتسلیم

غلام نجف"

(عکس مشمولہ 'نقوش' ص: ۱۸)

اس خط کا جواب 'غالبؔ کے خطوط' ج ۴/ (ص: ۵۷-۱۴۷۴) میں موجود ہے۔

یہ وہی خط ہے جو سہ ماہی 'اردو' (اپریل ۱۹۴۲ء) میں بنام عبدالحق شائع ہوا تھا۔ بعد میں غلام نجف خاں کے منقولہ خط کے دستیاب ہو جانے کے بعد اسے حکیم صاحب کے نام تسلیم کرلیا گیا۔ غالبؔ نے کوئن وکٹوریہ کی خدمت میں کوئی قصیدہ یا عرض داشت بھیجی تھی (جس کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں) یہ خط اسی سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔

حکیم غلام نجف خاں کے حالات پر سیر حاصل مقالہ ابھی تک سپردِ قلم نہیں کیا گیا۔ دہلی کی اہم شخصیات کے تحت ان کا تذکرہ 'آثارالصنادید' (سرسیّد احمد خاں)، واقعاتِ دارالحکومت دہلی' (بشیرالدین احمد)، 'دلی کی یادگار ہستیاں' (امداد صابری) میں محفوظ ہے، لیکن عموماً سرسیّد کے پیش کردہ احوال کو ہی سطر دو سطر کے اضافوں کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔ امداد صابری نے اتنا اضافہ ضرور کیا ہے کہ مغل تاریخوں کے حوالے سے حکیم صاحب کے بزرگوں کے حالات کی تفصیلات دے دی ہیں۔ طب یونانی کے تذکروں میں بھی ان کا ترجمہ ملتا ہے۔ محققین غالب میں سوائے مالک رام اور عبدالرؤف عروج کے کسی نے بھی ان کے احوال محفوظ کرنے کی سعی نہیں کی۔ مرزا محمد عسکری نے ادبی خطوطِ غالب (لکھنؤ، ۱۹۳۸ء) میں غالب کے مکتوب الیہم کے تعارف کے ذیل میں حکیم صاحب کے حالات بھی شامل کیے ہیں اور پہلی مرتبہ خطوطِ غالب کی روشنی میں ان کے اور غالبؔ کے درمیان اتحاد و موانست کی نشاندہی کی ہے۔ مالک رام نے اپنے ایک مضمون ''غالب کا ایک نیا خط'' میں ضمناً ڈیڑھ صفحے میں ان کے حالات درج کر دیے ہیں (ملاحظہ کریں تحقیقی مضامین، ص: ۴۹ تا ۵۱)۔ عبدالرؤف عروجؔ بھی اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکے۔ البتہ متقدمین کی فراہم کردہ جملہ معلومات کو انھوں نے نئی ترتیب سے پیش کر دیا ہے (بزمِ غالب، ص: ۲۹۷ تا ۲۹۹)۔ سیّد محمود احمد برکاتی نے اپنے مقالے حکیم غلام نجف خاں (مشمولہ 'العلم' کراچی، غالب نمبر، ۱۹۶۹ء) میں مرزا محمد عسکری کے طریق کو اختیار کرتے ہوئے ان کے نام غالبؔ کے خطوط کی مدد سے غالبؔ اور ان کے

روابط کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ سرسیّد کے خاندان سے حکیم صاحب کے روابط کی نشاندہی کی گئی ہے۔ حکیم صاحب کی زندگی کے اہم واقعات اور ان کی تاریخوں کی صحت کے لیے ان کے خاندان کے ایک بزرگ شیخ وحید احمد مسعود (۱۸۹۲ - ۱۹۷۷ء) مدیر 'نقیب' بدایوں سے رجوع کر کے مقالے کو مکمل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ وحید احمد مسعود حکیم غلام نجف خاں کی ہمشیرہ کے پوتے ہیں۔ علاوہ بریں مولانا برکات احمد ٹونکی (ف ۱۹۲۸ء) تلمیذ رشید حکیم غلام نجف خاں کی بیاضوں اور اپنے خاندان کے ذاتی کتب خانے کی مدد سے طب سے متعلق ان کے رسائل کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح اس مقالے کے ذریعے حکیم غلام نجف خان سے متعلق پہلی بار نہایت اہم اضافے کیے گئے ہیں۔

سطورِ ذیل میں مذکورہ صدر مآخذ اور مقامی تاریخوں و شجروں کی مدد سے ان کے احوال کو تاریخی تسلسل میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

حکیم غلام نجف خاں کا نام از روے شجرہ خاندانی 'غلام نجف الدین' تھا۔ (شیخو سے شیخوپور تک، ص:۶۹) ان کے خاندان میں چوں کہ 'الدین' کے لاحقے کے ساتھ بھی نام ملتے ہیں اس لیے اس نام کے درست ہونے میں شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن وہ غلام نجف خاں کے نام سے معروف ہوئے۔ حکیم صاحب نسباً شیخ فاروقی تھے۔ یعنی ان کا سلسلۂ نسب خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ پر منتہی ہوتا ہے۔ 'خانی' ان کا خطاب تھا اس بنا پر یہ نام کے ساتھ شامل ہوگیا۔

یہ خاندان[1] بیک وقت فقیری و امیری دونوں میں ممتاز رہا۔ حکیم غلام نجف خاں

---

[1] اس خاندان کے حسب نسب، تاریخ نیز اکابر کے تذکرے و سوانح سے متعلق حسب ذیل کتب میری معلومات میں ہیں:

- جواہر فریدی (فارسی)، محمد علی اصغر فتح پوری، سالِ تصنیف ۱۰۶۳ھ/ ۱۶۵۳ء۔ بابا فرید کی اولاد اور خلفاء کے احوال میں۔ اس کا اردو ترجمہ کریمی پریس لاہور سے شائع ہو چکا ہے جس پر سال اشاعت درج نہیں۔
- عروجِ شیخوپور (فارسی)، شیخ فتح الدین، سالِ تالیف ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۳ء، غیر مطبوعہ۔ حسب نسب و اکابر

حضرت فریدالدین مسعود شکر گنج (ف ۱۲۶۵ء) اور حضرت شیخ سلیم چشتی (ف ۱۵۷۳ء) کے داماد شیخ اعظم فریدی و فاروقی[۲] (ف ۱۵۸۳ء) بدایونی کی اولاد میں ہیں۔

شیخ فرید کی ساتویں زیریں پشت میں ایک بزرگ سعیدالدین فریدی[۳] فاروقی، ظہیرالدین بابر کے عہدِ حکومت (۱۵۲۶-۱۵۳۰ء) میں بدایوں آئے۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی اس خاندان کے بعض اور افراد بھی بدایوں آگئے اور انھوں نے یہیں سکونت اختیار کرلی۔ دھیرے دھیرے ان افراد کا ایک محلّہ قلعہ بدایوں سے جانبِ غرب شیخ پورہ کے نام سے آباد ہوگیا۔ اس محلے میں نیز اندرونِ قلعہ شیوخ فاروقی بڑی تعداد میں آباد ہوگئے (کنزالتاریخ ص: ۲۴۷)۔ شیخ پورہ کا اب کوئی نام ونشان باقی نہیں ہے۔

کے احوال ہیں۔ اس مسودے کی اصل کاپی ڈاکٹر محمد ایوب قادری (کراچی، ف ۱۹۸۳ء) کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ تھی۔ کتاب کا نام بھی ایوب قادری کا تجویز کیا ہوا ہے۔ شیخ وحید احمد مسعود (ف ۱۹۷۷ء) نے اس کتاب کی اساس پر اردو میں ایک کتاب تیار کی تھی جس میں اپنے زمانے تک کے شجرے مرتب کردیے تھے۔ ۵/جنوری ۱۹۸۳ء کے ایک خط میں ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے مجھے لکھا:

> میں کسی آنے جانے والے معتبر شخص کے ذریعے وحید احمد مسعود مرحوم کی ایک کتاب کا مسودہ آپ کو بھیجوں گا۔ جو انہوں نے شیخو پور اور اہل شیخو پور کے متعلق لکھی ہے۔ میں نے اس کو صاف نقل کر کے اپنے پاس محفوظ کرلیا ہے۔ اصل آپ کے کتب خانہ کے لیے بھیجوں گا۔ (حقائق و بصائر، ص: ۳۱۸)

ڈاکٹر قادری نے ''عروج شیخو پور'' کا تعارف اپنے مضمون وحید احمد مسعود (مشمولہ سہ ماہی روشن بدایوں، جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء) میں کرادیا ہے۔ شیخ فتح الدین حکیم غلام نجف خاں کے والد حافظ مسیح الدین کے حقیقی بھائی تھے۔

- نواب فرید، سلطان حیدر جوش۔ مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں ۱۹۱۷۔ بانی شیخو پور کی سوانح۔
- شیخو سے شیخو پور تک، تسلیم غوری بدایونی۔ بریلی الیکٹرک پریس، بریلی ۱۹۹۵۔ خاندان کی تاریخ، اکابر کے مختصر احوال اور شجرۂ نسب۔

۲۔ شیخ اعظم کا مزار بدایوں میں محلّہ شیخ پورہ سے متصل شیخ زادگان کے قبرستان میں ہے۔ ماضی میں اس پر ایک کتبہ ۹۹۱ھ/ ۱۵۸۳ء کا تھا جس کا عکس محکمہ آثار قدیمہ کی رپورٹس میں شائع ہوچکا ہے۔

۳۔ بدایوں کے تمام تذکرہ نویسوں نے ان کا نام سعیدالدین فاروقی لکھا ہے لیکن شجرہ نسب میں شیخ سعداللہ درج ہے۔ التباس کے سبب میں نے اول نام اختیار کیا ہے۔

مغلیہ دورِ حکومت میں اس خاندان کے متعدد افراد اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ انھوں نے مغل حکمرانوں کے ساتھ وفاداریوں اور جاں نثاریوں کا ایک تاریخ ساز نمونہ پیش کیا۔ قطب الدین کوکہ (ف ۱۶۰۷ء)، شیخ ابراہیم کشور خاں (ف ۱۶۱۳ء)، نواب فرید محتشم خاں (ف ۱۶۶۴ء) اور شیخ اللہ دیا اخلاص خاں (ف ۱۶۶۴ء) کا نام شاہانِ مغلیہ کی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔

شیخ اعظم کے بیٹے شیخ قطب الدین کوکہ جہانگیر کے رضاعی بھائی تھے۔ بایں سبب مغلیہ دربار میں ان کی خاص قدر و منزلت تھی۔ ان کے بیٹے نواب فرید کی فرمائش پر جہانگیر نے ایک فرمانِ شاہی کے بموجب ۱۰۳۵ھ/ ۱۶۲۵ء میں موضع پھولیا کھیڑا[1] میں ان کو چار ہزار بیگھا اراضی عطا کی (آثارِ بدایوں، ص: ۸۲) جس پر ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کیا گیا اور ایک نئی بستی تشکیل دی گئی۔ شہزادہ سلیم کی عرفیت 'شیخو' کی رعایت سے اس بستی کا نام شیخوپور رکھا گیا اور شیوخ فاروقی شیخ پورہ محلّہ سے ترکِ سکونت کر کے اس نو تعمیر بستی میں آباد ہو گئے۔

حکیم غلام نجف خاں کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

> ''غلام نجف خاں بن مسیح الدین بن شمس الدین بن بدرالدین بن شیخ محمد مراد بن دیوان عبدالہادی بن نواب فرید محتشم خاں بن نواب قطب الدین خاں بن شیخ اعظم شہید بن شیخ حسن حافظ بن شیخ ابراہیم بن شیخ آخوند میاں بن سعداللہ فاروقی (سعیدالدین) بن شیخ سلطان شاہ بن شیخ زین العابدین بن شیخ رفیع الدین بن شیخ داؤد بن شیخ محمود، بن شیخ بدرالدین بن حضرت فریدالدین مسعود شکر گنج''۔

حکیم غلام نجف خاں کے والد کا نام (حافظ محمد) مسیح الدین تھا۔ خاندانی شجرے میں ان کا نام حافظ مسیح الدین درج ہے۔ سر سیّد نے اس پر محمد کا سابقہ لگا کر حافظ محمد مسیح

---

[1] سرسید نے اس موضع کا نام مولیا درج کیا ہے۔ (آثار الصنادید، ص: ۵۰) بعد کے قلم کاروں نے بھی اسی کو دہرایا ہے جو غلط ہے۔

الدین لکھا (آثار الصنادید، ص:۵۰) بعد میں یہی رائج ہوگیا۔ مالک رام اور خلیق انجم نے ان کا نام بالترتیب حافظ محمد سمیع الدین (تحقیقی مضامین، ص:۵۰، آثار الصنادید/ خلیق انجم، ص:۲۶۲) اور عبدالرؤف عروجؔ نے حافظ مصلح الدین خاں درج کیا ہے (بزم غالب، ص:۲۹۷) جو غلط ہے۔

صاحبِ 'مرأۃ الاشباہ' (ص:۶۷) نے انھیں بھی طبیب لکھا ہے۔ (بحوالہ دلی اور طب یونانی، ص:۱۹۲)۔ ان کی شادی سیّد غلام علی لکھنوی کی بیٹی مریم النساء سے ۱۸۰۵ء میں ہوئی (العلم، غالب نمبر، ص:۴۶۸)۔ ان مسیح و مریم کے اختلاط سے پانچ بیٹے فیاض الدین، غلام نجف الدین، نجم الدین حیدر، وجیہ الدین، حمید الدین اور تین بیٹیاں وصل فاطمہ، بشیرا، حسینی بیگم پیدا ہوئیں۔

حکیم غلام نجف خاں ۲۴ رشعبان ۱۲۲۴ھ/ ۵ راکتوبر ۱۸۰۸ء کو اپنے آبائی وطن بدایوں میں پیدا ہوئے (العلم، غالب نمبر، ص:۴۶۹، تحقیقی مضامین، ص:۵۰)۔ محمود احمد برکاتی نے شیخ وحید احمد مسعود کی ارسال کردہ معلومات کی بنیاد پر مذکورہ تاریخِ پیدائش درج کی ہے اور مالک رام نے سیّد فرخ جلالی (علی گڑھ) کے ایک مکتوب کے حوالے سے یہی تاریخ منقول کی ہے۔ اس کا امکان ہے کہ 'غلام نجف' تاریخی نام ہو جس سے ۱۲۰۴ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس نام میں کوئی سابقہ یا لاحقہ چھوٹ گیا ہو یا ۱۲۰۴ھ ہی ان کا صحیح سالِ ولادت ہو لیکن یہ محض قیاس ہے۔

حکیم صاحب نے ابتدائی تعلیم وطن ہی میں مولوی مردان علی بدایونی سے حاصل کی۔ پانچ برس کی عمر میں اپنے خالو سیّد علی[1] کے ہمراہ دہلی چلے گئے۔ (آثار الصنادید، ص:۵۰) سیّد علی اُن دنوں سرکارِ انگریزی میں تحصیلدار کے عہدے پر مامور تھے بعد میں گورنر جنرل کے میر منشی ہوئے۔[2] حکیم صاحب کی بہن کے پوتے شیخ وحید احمد مسعود کا

---

[1] محمود احمد برکاتی نے سید علی کو حکیم صاحب کا ماموں لکھا ہے۔ (العلم غالب نمبر، ص:۴۶۹)

[2] شیخو سے شیخو پور تک (ص:۵۰) میں حکیم غلام نجف خاں کے خالو سید علی کے عہدے اور مناصب کو حکیم صاحب سے متعلق کر دیا ہے۔ حکیم صاحب کا تحصیلدار یا گورنر جنرل کا منشی ہونا غلط ہے۔ دراصل مرتب کو سر سید کی عبارت کو سمجھنے میں سہو ہوا۔

خیال ہے کہ حکیم صاحب نے مروّجہ تعلیم بدایوں میں حاصل کی اور جوان ہوکر طب کی تحصیل کے لیے دہلی پہنچے۔ (العلم، غالب نمبر، ص: ۴۶۹ حاشیہ)

حکیم صاحب کی تعلیم کے بارے میں تفصیلات نہیں ملتیں۔ ان کی علمی صلاحیت اور طبی لیاقت کو دیکھتے ہوئے یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے عربی و فارسی اور مروّجہ علوم کی تحصیل اپنے دور کے مشاہیر اساتذہ سے کی ہوگی۔ فارسی کی تحصیل انھوں نے مرزا غالبؔ سے کی تھی۔ (آثارِ غالب، ص: ۴۲)

مروّجہ درسی علوم کی تحصیل کے بعد طب کی طرف متوجہ ہوئے۔ طب کی مروّجہ نصابی کتاب کی تکمیل حکیم محمد شریف خاں کے بیٹے حکیم صادق علی خاں دہلوی (ف ۱۸۴۸ء) سے کی۔ عملی تربیت یعنی نسخہ نویسی اور علاج و معالجہ کے لیے حکیم احسن اللہ خاں (ف ۱۸۷۳ء) کے ہمراہ ان کے مطب میں بیٹھنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ ۱۲۵۲ھ/ ۱۸۳۷ء تک جاری رہا۔ حکیم احسن اللہ خاں نے ان کی تعلیم و تربیت میں کمال درجہ کی کوشش کی چنانچہ وہ بہت جلد دہلی کے نامور اطبا میں شمار کیے جانے لگے۔

اُن دنوں طبی تعلیم کے لیے کالج یا مدرسے نہیں تھے۔ حکما کے خاندان اور مطب ہی اس علم کی درس گاہیں تھیں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اساتذہ تحریری سند دے دیا کرتے تھے۔ یہ سند گویا علاج کرنے کا اجازت نامہ ہوا کرتی تھی۔ دلّی میں خاندان شریفی اور خاندانِ بقائی طب کے دو اہم مراکز تھے۔ حکیم غلام نجف خاں طب کے ان دونوں سلاسل اسناد یعنی خاندان شریفی و بقائی سے مستفید و مستفیض ہوئے۔ اسناد کا نام بہ نام سلسلہ محمود احمد برکاتی نے اپنے مقالے میں درج کیا ہے (العلم، غالب نمبر، ص: ۴۶۹)۔ طوالت کے خوف سے اسے ہم نظر انداز کرتے ہیں۔ خاندانِ بقائی سے سلسلۂ اسناد ملنے ہی کے سبب انھیں خاندانِ بقائی کے حکما میں بھی شامل کیا جاتا ہے۔ سرسیّد نے لکھا ہے:

> ''ان کو حاذق الملک موصوف (یعنی حکیم احسن اللہ) سے قرابت قریبہ تھی''۔ (آثار الصنادید، ص: ۵۰)

مولوی رضی الدین بسمل نے واضح الفاظ میں لکھا ہے:

''حکیم غلام نجف خاں صاحب پدر حکیم ظہیر الدین صاحب وزیر موصوف (یعنی حکیم احسن اللہ) کے بہنوئی تھے۔ یہ صاحب باہر دیوان خانے میں حکیم صاحب کے رہتے تھے''۔ (کنز التاریخ، ص: ۳۱۲)

خاندانی روایت کے مطابق ۱۰ر فروری ۱۸۳۴ء کو حکیم احسن اللہ خاں کی بہن سے حکیم صاحب کا عقد ہوا (تحقیقی مضامین، ص: ۵۰)۔ عقد کے بعد حکیم صاحب، حکیم احسن اللہ خاں کے ساتھ ہی رہنے لگے۔ ۱۸۵۷ء میں جب تلنگوں نے حکیم احسن اللہ خاں کے گھر پر حملہ کر کے ان کا مال و اسباب لوٹ لیا تو یہ بھی اس لوٹ مار سے متاثر ہوئے۔ ایک لٹیرے نے جو حکیم صاحب سے ذاتی طور پر واقف تھا ان کو گھر سے نکل بھاگنے میں ان کی مدد کی ورنہ یہ بھی قتل کر دیے جاتے۔ اس واقعے کی تفصیل رضی الدین بسمل نے اپنی کتاب 'کنز التاریخ' (ص: ۳۱۲ تا ۳۱۴) میں درج کی ہے۔

۱۸۳۴ء میں حکیم صاحب کے والد حافظ محمد مسیح الدین نے شیخوپور (بدایوں) میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے۔ ۱۸۵۸ء میں ان کی والدہ بھی رحلت فرما گئیں۔ (العلم، غالب نمبر، ص: ۴۶۹، ۴۷۰)

۱۸۳۷ء میں بہادر شاہ ظفر نے حکیم صاحب کو 'عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں بہادر' کا خطاب دیا۔ کچھ مدت کے بعد (۱۸۴۷ سے قبل) کمپنی کی طرف سے طبیب شہر کی حیثیت سے مامور کیے گئے۔ (بزمِ غالب، ص: ۲۹۸)

۱۸ر جون ۱۸۴۷ء کے روزنامچے کے مطابق مرزا مظفر بہادر کی مختاری کا عہدہ بھی ان کو مرحمت کیا گیا اور ان کو خلعت پنچ پارچہ اور سہ رقم جواہر حضور انور کی طرف سے عطا کیا گیا۔ (بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ[1]، ص: ۱۵۳، بحوالہ دلی اور طب یونانی، ص: ۱۹۳)

۱۸۵۷ء میں دہلی سے لُٹ لٹا کر بدایوں کے لیے روانہ ہوئے اور مہرولی، دوجانہ،

---

[1] دلی اور طب یونانی میں کتاب کا نام سہواً ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ از عبداللطیف درج ہو گیا ہے۔ مکتوب حکیم ظل الرحمٰن بنام راقم الحروف مؤرخہ ۳۰ر ستمبر ۲۰۰۳ء۔

لوہارو ہوتے ہوئے شیخوپور پہنچے۔ تقریباً دو سال یہاں مقیم رہنے کے بعد جب حالات کچھ بہتر ہوئے تو پھر دہلی چلے گئے۔ کسی معتبر ذریعے سے حکیم صاحب کی تاریخ وفات معلوم نہیں ہوئی۔ محمود احمد برکاتی نے سالِ وفات ۱۸۸۹ء لکھا ہے[1] اور قدم شریف دہلی میں مدفون ہونا لکھا ہے۔ (العلم، غالب نمبر، ص:۴۷۰) پس ماندگان میں ایک بیٹا ظہیرالدین احمد اور ایک بیٹی رحمت فاطمہ (رحمت النساء بیگم، بحوالہ العلم، غالب نمبر، ص:۴۷۵) زوجہ تفضّل حسین کوکب دہلوی یادگار چھوڑیں۔ طبی سلسلے میں حکیم صاحب کے ایک شاگرد حکیم برکات احمد ٹونکی (ف ۱۹۳۸ء) کا پتا چلتا ہے۔

حکیم غلام نجف خاں اپنی حیات میں دہلی کے علمی و ادبی حلقوں میں مقبول تھے۔ سرسیّد احمد خاں (ف ۱۸۹۸ء) سے بھی ان کے مخلصانہ اور برادرانہ روابط تھے۔ دراصل حکیم صاحب سرسیّد، کے بڑے بھائی سیّد محمد خاں (ف ۱۸۴۵ء) کے مخلص دوست تھے۔ سرسیّد حکیم صاحب کو مثل بڑے بھائی کے سمجھتے اور ان کی عزت و تکریم کرتے تھے۔ سرسیّد نے لکھا ہے:

''راقم ان کو بہ سبب کمال شفقت اور مخلص نوازی کے اپنے مہین برادر سے زیادہ تصور کرتا ہے ...ان کے اوصافِ حمیدہ اور اخلاقِ حمیدہ حیزِ تحریر سے خارج ہیں''۔ (آثار الصنادید، ص:۵۱)

'سیرتِ فریدیہ'، 'حیاتِ جاوید' اور 'مکتوباتِ سرسیّد' کے مطالعے سے بھی اس تعلق پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ تعلق ایک مستقل مضمون کا طالب ہے۔ محمود احمد برکاتی، اپنے مقالے میں اجمالاً اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ ہم اس تفصیل کو طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتے ہیں۔

حکیم غلام نجف خاں شاعر تھے؟ کیا شاعری میں بھی وہ غالبؔ کے شاگرد تھے؟ یہ

---

[1] مولانا عبدالسلام خاں نے اپنے مضمون ''علوم شرقیہ کے فروغ میں رامپور کا حصہ'' (مشمولہ رضا لائبریری جرنل، رامپور، شمارہ ۲، ۱۹۹۵ء، ص:۱۴) بتذکرۂ حکیم برکات احمد ٹونکی، حکیم غلام نجف خاں کا سال وفات ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۴ء) درج کیا ہے جو غلط ہے۔ ممکن ہے یہ سالِ وفات حکیم ظہیرالدین کا ہو۔ واللہ اعلم۔

وہ سوالات ہیں جن کے شواہد فی الوقت دستیاب نہیں۔ مرزا محمد عسکری نے لکھا ہے:

"فنِ شعر میں ان ہی (یعنی غالب) سے مشورت کرتے تھے"۔

(ادبی خطوطِ غالب، ص: ۳۱۲)

صباح الدین عبدالرحمٰن نے بھی عسکری کے بیان کو اپنے لفظوں میں دہراتے ہوئے لکھا ہے:

"وہ مرزا کو اپنا بزرگ مانتے اور باپ کے برابر جانتے یعنی شعر میں ان ہی سے مشورہ کرتے"۔

(غالب مدح وقدح کی روشنی میں، ج ۲، ص: ۱۱)

محمود احمد برکاتی نے عسکری کا بیان درج کر کے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے:

"ممکن ہے حکیم صاحب کو کبھی کبھار شعر کہہ لینے کا ذوق ہو"۔

(العلم، غالب نمبر، ص: ۴۷۳)

لیکن قاضی عبدالودود اُن کے شاعر ہونے کی نفی کرتے ہیں۔ 'پنج آہنگ' کا پہلا ایڈیشن بہ تصحیح حکیم غلام نجف خاں مطبع سلطانی لال قلعہ، دہلی سے ۱۸۴۹ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس کا منظوم اشتہار غلام نجف خاں کے نام سے 'اسعد الاخبار' آگرہ (۱۲/مارچ ۱۸۴۹ء) میں چھپا تھا (آثر غالب، ص: ۴۲)۔ اشتہار سے پہلے اور اس کے بعد نثری عبارتیں تھیں جو بالترتیب یہ ہیں:

(۱) نقل اشتہار منظوم طبع پنج آہنگ مصنفہ حضرت مرزا اسداللہ خاں صاحب بہادر غالب۔ جو اپریل کے مہینے میں قیمت بھیج دے تین روپے اور جو بعد اس کے بھیجے گا چار روپے دینے پڑیں گے۔

(۲) مخفی نہ رہے کہ یہ اشتہار دہلی سے بہ سبیل ڈاک میرے ایک مخدوم والا شان نے واسطے درج کرنے اخبار کے میرے پاس بھیجا۔ (دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، ص: ۳۶۴)

اشتہار میں ۳۳ شعر تھے، اکتیسویں شعر میں شاعر کا نام بھی نظم ہوا تھا:

میں جو ہوں درپے حصولِ شرف نام عاصی کا ہے غلام نجف

قاضی عبدالودود نے اس منظوم اشتہار کو دریافت کیا اور صرف اپنے قیاس کی بنیاد پر اسے کلامِ غالب میں شامل کرلیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ:

"غلام نجف خاں جن کے نام سے یہ اشتہار ہے، غالبؔ کے شاگرد تھے۔ لیکن یہ تلمذ ظاہراً فارسی پڑھنے تک محدود تھا۔ شاعر کی حیثیت سے ان کا ذکر کہیں نظر نہیں آیا۔ اشتہار غالبؔ کی طرز میں ہے اور قریب بہ یقین ہے کہ انھیں کا لکھا ہوا ہے۔ غالبؔ کے لیے خودستائی کوئی نئی بات نہیں اور اشتہار کی تو ذمہ داری بھی ان کے سر نہیں"۔

(مآثر غالب، ص: ۴۲)

قاضی صاحب کے اس محاکمے کے بعد ماہرِ غالبیات اسے غالبؔ ہی کا طبع زاد مان کر کلامِ غالب میں محسوب کرنے لگے۔ چنانچہ یہ منظوم اشتہار دیوانِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہرؔ (لاہور، ۱۹۶۷ء) دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، دیوانِ غالب نسخۂ رضا میں بغیر کسی بحث کے شامل کرلیا گیا ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی پہلے شخص ہیں جنھوں نے قاضی صاحب کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا استدلال حسبِ ذیل ہے:

"ہمارے نزدیک شاعر کی حیثیت سے کسی شخص کا کہیں ذکر نہ آنا ہرگز اس امر کی دلیل نہیں بن سکتا کہ وہ شعر گوئی کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ یا کوئی نظم جو اس کی طرف منسوب ہے اس کی طبع زاد نہیں۔ چنانچہ جب تک کوئی حتمی ثبوت دستیاب نہ ہو، زیر بحث اشتہار کو حکیم غلام نجف خاں کے بجائے مرزا غالبؔ کی تصنیف قرار دینا درست نہیں"۔

(غالب - احوال و آثار، ص: ۲۲۸)

حکیم صاحب کو غالبؔ سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اس عقیدت کا ثبوت جہاں اس امر سے ملتا ہے کہ وہ غالبؔ کے نجی اور ادبی کاموں میں ان کی معاونت کرتے نظر آتے ہیں وہیں یہ امر بھی اس تعلقِ خاطر پر دلالت کرتا ہے کہ انھوں نے قصبہ شیخوپور میں، جس کے نواح میں ان کی موروثی زمینداری تھی، میراں سرائے اور شیخوپور کے مابین معظم پور

نیبہ نگر میں ایک پٹی کو غالبؔ سے منسوب کر کے اس کا نام 'غالب پٹی' رکھا۔ جو اضافہ آبادی کے بعد موضع میں تبدیل ہوگئی اور آج بھی تحصیل ریکارڈ میں ''موضع غالب پٹی معظم پور نیبہ نگر'' کے نام سے درج ہے۔

راقم الحروف نے موضع غالب پٹی سے متعلق حصولِ معلومات کے سلسلے میں محمد ادریس خاں لودی (ف ۱۹۷۵ء) ساکن محلّہ جالندھری سرائے بدایوں کا نجی خسرہ بندوبست رجسٹر دیکھا تھا جس میں موضع غالب پٹی کی مزروعہ وغیر مزروعہ زمینوں کا صفحہ ۷۵ سے صفحہ ۱۳۶ تک اندراج ہے۔ یہ رجسٹر ۱۳۳۱ فصلی مطابق ۲۴-۱۹۲۳ء کا ہے۔ اس رجسٹر میں غالب پٹی کے دو نقشے دیے گئے ہیں۔ ایک نقشے کا عکس دیا جارہا ہے۔ اس نقشے سے غالب پٹی اور اس کی شیخوپور سے قربت کی تصدیق ہوجاتی ہے[1]۔

حکیم غلام نجف خاں اپنے عہد کے کامیاب طبیب تھے۔ سر سیّد نے لکھا ہے:

''قدرتِ الٰہی ہے، ایسا دستِ شفا نہیں دیکھا کہ وہ امراض جن کو لادوا و لاعلاج کہتے ہیں۔ اندک توجہ اور تھوڑے سے التفات سے اس طرح زائل ہوگئے کہ پھر تمام عمر اس بیماری کا نام و نشان باقی نہیں رہا''۔

(آثار الصنادید، ص: ۵۱)

حکیم صاحب نے مطب کی مصروفیت کے سبب تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی۔ تاہم محمود احمد برکاتی نے اپنے خاندانی کتب خانے کی مدد سے ان کے طب سے متعلق تین رسائل اور ایک یادداشت کا تعارف کرادیا ہے جو حسبِ ذیل ہے:

۱- نزہت العاشقین (فارسی): یہ رسالہ آتشک کے مجربات پر مشتمل ہے۔ ۱۸۶۰ء میں مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع ہوا، اس میں کل ۶۸ صفحات ہیں۔

۲- ماءُ الجُبُن (فارسی): جُبُن عربی میں پنیر کو کہتے ہیں۔ طب کی اصطلاح میں دودھ کے اُس پانی کو جبن کہتے ہیں جو دودھ کو پھاڑ کر نکالتے ہیں۔ اس رسالے میں ماء الجبن

---

[1] رجسٹر اور نقشے جناب تسلیم اللہ غوری، ساکن جالندھری سرائے بدایوں کی تحویل میں ہیں۔ ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

کے ساتھ استعمال ہونے والے مرکبات ظروف، ترکیب تیاری وغیرہ کا بیان ہے۔ اس رسالے کا نسخہ حکیم غلام نجف خاں کے شاگرد مولانا سیّد برکات احمد ٹونکی (ف ۱۹۳۸ء) کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور انہی کے خاندان میں محفوظ ہے۔

۳- علاجِ عنّین (فارسی): عنّین بروزن فتّین بمعنی نامرد۔ مجلوق و مغلم لوگوں کے لیے۔ بہ خط سیّد برکات احمد ٹونکی۔

۴- یادداشتیں: یہ وہ یادداشتیں ہیں جو نسخہ نویسی کے دوران حکیم صاحب نے اپنے استاد حکیم احسن اللہ خاں کے مطب میں بیٹھ کر قلم بند کی تھیں۔ حکیم صاحب کی یہ علمی باقیات ان کے خواجہ تاش سیّد دائم علی خاں بہادر ٹونکی کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ تھیں۔ جنھیں اس خاندان کے آخری علمی چراغ حکیم محمود احمد برکاتی نے اپنے مضمون میں متعارف کرایا ہے۔

حکیم غلام نجف خاں کے تعلق سے یہ تصحیح ضروری ہے۔ خاندان بقائی، دہلی کے اطباء کا ایک معروف خاندان ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے، فنِ طب میں حکیم غلام نجف خاں کا سلسلۂ اسناد اس خاندان سے بھی ملتا ہے۔ خاندان بقائی سے اس نسبت کی بنا پر حکیم سیّد ظل الرحمٰن کو مغالطہ ہوا اور انھوں نے حکیم غلام نجف خاں کو حکیم بھلو بقائی کے بیٹے حکیم سعید الدولہ کا فرزند لکھ دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "حکیم بقاء اللہ خاں کے دوسرے بیٹے حکیم بھلو بقائی تھے ...ان کے بیٹے حکیم سعید الدولہ ... اور ان کے بیٹے حکیم نجف خاں مسیح الملک تھے ... حکیم نجف خاں کے ایک بیٹے حکیم جالینوس الزماں تھے ... دوسرے بیٹے حکیم ظہیر الدین تھے جن کے صاحبزادگان حکیم رضی الدین اور حکیم ریاض الدین نے بھی اپنے زمانے میں ناموری حاصل کی"۔

(دلّی اور طب یونانی، ص:۸۰)
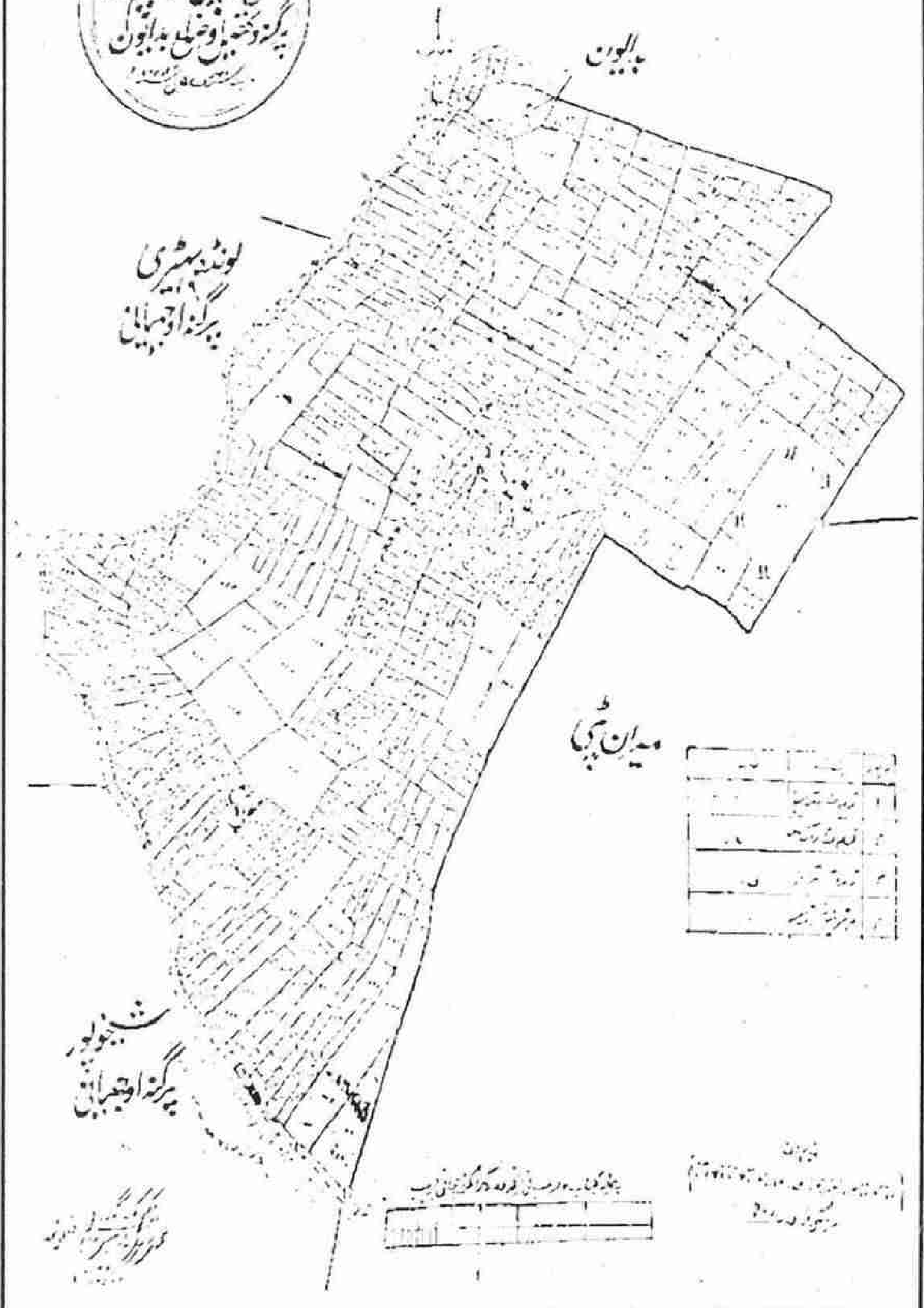
عکس نقشہ غالب پٹی

(مملوکہ جناب تسلیم اللہ غوری بدایونی)

۲

حکیم ظہیرالدین احمد خاں

حکیم ظہیرالدین کے نام غالبؔ کے صرف دو خط ملتے ہیں۔ ایک 'اردوئے معلیٰ' میں اور ایک اکبر علی خاں عرشی زادہ (ف ۱۹۹۷ء) نے 'ہماری زبان' دہلی (۱۵/اپریل ۱۹۹۰ء) میں شائع کردیا۔ لیکن یہ خط انھیں کہاں سے دستیاب ہوا اس کا حوالہ نہیں دیا۔ 'غالبؔ کے خطوط' (مرتبہ خلیق انجم) ج ۲، ۴ میں یہ دونوں خط شامل ہیں۔

ظہیرالدین سے غالبؔ کی مستقل خط و کتابت تھی۔ اس امر کا انکشاف ان کے والد حکیم غلام نجف خاں کے نام غالبؔ کے خطوط سے ہوتا ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

"پہلے ظہیر دل پذیر کا خط آیا۔ پڑھتے ہی اس کا جواب لکھ رکھا۔ دوسرے دن ڈاک میں بھجوایا۔ (خط نمبر ۱۴، یکم اپریل ۱۸۶۵ء)

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"میرا خط اس کا موسومہ (ظہیرالدین) تمھارے پاس پہنچا... ظہیرالدین کا خط تم نے کیوں کھولا۔ وہ مغلوب الغضب ہے، تم پر خفا ہوگا"۔ (خط نمبر ۱۸، ۱۲/نومبر ۱۸۶۵ء)

اُن کے والد حکیم غلام نجف خاں کے نام خط میں بھی ان کے نام مستقل عبارتیں ہیں۔ ان متعلقہ عبارتوں کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالبؔ ظہیرالدین سے بے لوث محبت کرتے تھے۔ ان کے والد کو مثل بیٹے کے اور خود ان کو پوتے کے طور پر مانتے تھے۔ ظہیرالدین بھی غالبؔ کو دادا اور ان کی اہلیہ کو دادی کا درجہ دیتے تھے۔ اس بنا پر غالبؔ کی اہلیہ ظہیرالدین سے پردہ نہیں کرتی تھیں اور ظہیرالدین کا غالبؔ کے گھر میں بے روک ٹوک آنا جانا تھا۔ مرزا محمد عسکری نے لکھا ہے:

"ظہیرالدین کو مرزا ایسا چاہتے تھے کہ کہیں اس کو اپنا پیارا پوتا لکھتے ہیں اور کہیں خط میں اس کا سلام نہ پہنچنے پر خفا ہوتے ہیں، کہیں

اس کا اپنے گھر نہ آنا یاد کرتے ہیں غرض کہ وہ محکم اور مستحکم تعلقات ہیں
جو عزیزوں اور رشتہ داروں میں بھی نہیں ہوتے۔ ایک ایک لفظ سے
محبت اور تعلق کی ایک داستان پیشِ نظر ہو جاتی ہے''۔

(ادبی خطوطِ غالب، ص: ۳۱۴)

حکیم غلام نجف خاں اور ان کے بیٹے ظہیرالدین سے بے انتہا محبت و اخلاص کو غالبؔ نے خون کا رشتہ ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ غالبؔ لکھتے ہیں:

''یہ تم جو پھوڑے پھنسی میں مبتلا رہتے ہو اس کا سبب یہ کہ مجھ
میں تمہارا لہو ملتا ہے اور میں احتراقِ خون کا پُتلا ہوں''۔

(خط بنام غلام نجف خاں، مکتوبہ یکم اپریل ۱۸۶۵ء)

اس محبت و اخلاص اور رشتہ مہر و وفا سے قاضی عبدالودود کو مغالطہ ہوا اور انھوں نے ظہیرالدین اور غالبؔ کے درمیان حقیقی خونی رشتہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

''مگر غالبؔ اور ان کے بیٹے (ظہیرالدین) میں خون کا رشتہ بھی
ہے۔ غالبؔ نے غلام فخرالدین خاں اپنے حقیقی بھائی کے نواسے کی
رہائی پر غلام نجف خاں کو مبارکباد دی ہے۔ گمان ہے کہ یہ رشتہ بھائی
کے ذریعے سے ہو''۔ (آثارِ غالب، ص: ۴۲)

قاضی صاحب کے اس گمان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

غالبؔ کے یہاں حکیم ظہیرالدین کا کم سنی ہی سے آنا جانا تھا۔ حکیم غلام نجف خاں کے نام خطوط کے مطالعے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ بچپن میں ظہیرالدین کے مزاج میں تلوّن تھا۔ غالبؔ شفقت کے ساتھ ان کی ناز برداری کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے چچا ڈپٹی نجم الدین حیدر نے انھیں ایک توپ کھیلنے کے لیے بھیجی۔ غالبؔ نے ظہیرالدین کی طرف سے اس کی رسید اور شکریے کا خط لکھا۔ یہ خط بدونِ تاریخ 'عودِ ہندی' میں بہ عنوان 'ظہیرالدین کی طرف سے ان کے چچا کے نام' شامل ہے۔ یہی خط خواجہ محمد شفیع دہلوی

کے زیر ملکیت نسخہ دیوانِ غالب (قلمی) کے آخر میں بھی درج ہوا ہے۔ اکبر علی خاں عرشی زادہ نے اس خط کی نقل 'فروغِ اردو' (لکھنؤ) غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں شائع کرائی۔ اس کے اور 'عودِ ہندی' کے متن میں معمولی اختلاف کے علاوہ آخر میں ایک سطری عبارت کا اضافہ بھی ہے جو 'عودِ ہندی' میں غالباً حذف کردی گئی تھی۔ وہ سطر یہ ہے:

"لو میاں ظہیر الدین ہم نے مسودہ لکھ کر بھیج دیا ہے (مراد خط) تم اس کو اپنے ابا سے پڑھ لو اور اس کی نقل کرا کر اپنے چچا جان کو بھیج دو"۔ (غالب کے خطوط، ج ۳، ص: ۱۰۴۰)

اس عبارت کو خلیق انجم نے مذکورہ خط کے متن میں شامل کرلیا ہے۔ (ایضاً حوالۂ سابق) لیکن 'غالب کے خطوط' ج ۲، ص: ۸۱۸ پر ایک علیحدہ خط کے طور پر بھی اس عبارت کو نقل کیا ہے اور اس کو علیحدہ شماریاتی نمبر بھی دیا ہے۔ اس سے بادی النظر میں یہ التباس ہوتا ہے کہ حکیم ظہیر الدین کے نام غالب کے تین خط ہیں، جو درست نہیں۔

غالبؔ اپنے خطوط میں ظہیر الدین کو "اقبال نشاں" اور "میاں" کے القاب سے مخاطب کرتے ہیں۔ حکیم ظہیر الدین کے نام جیسا کہ سطورِ بالا میں مذکور ہوا، دو خط ہی دستیاب ہیں۔ پہلا خط ۲ رنومبر ۱۸۶۵ء کا مکتوبہ ہے۔ یہ رامپور میں قیام کے دوران لکھا گیا۔ اس دوران ان کے والد کو بھی متعدد خطوط لکھے گئے۔

ظہیر کے نام اس خط میں دو باتیں اہم اور دریافت طلب ہیں۔ ذیل میں اس خط کا مکمل متن درج کر کے ان کی صراحت پیش کی جا رہی ہے:

"اقبال نشاں حکیم ظہیر الدین احمد خاں کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔ کہو میاں! تمھارا مزاج کیسا ہے؟ اور تمہارے بھائی مرزا تفضّل حسین خاں کیسے ہیں اگر ملو تو میری دعا کہنا اور مزاج کی خبر پوچھنا اور اپنے والد ماجد کو میری دعا کہنا اور کہنا کہ تمہارا خط میرے خط کے جواب میں تھا۔ اس میں اور کوئی بات جواب طلب نہ تھی۔

سنو میاں ظہیر الدین! تم اپنی دادی کے پاس ابھی چلے جاؤ اور

ان سے میری اور دونوں لڑکوں کی خیر و عافیت کہو اور پوچھو کہ شہاب الدین خاں نے اکتوبر کے مہینے کی تنخواہ کے پچاس روپے پہنچا دیے یا نہیں؟ کِدار ناتھ ڈیوڑھی پر آ کر جعفر بیگ، وفا دار وغیرہ کی تنخواہ بانٹ گیا یا نہیں؟ اچھا بیٹا، یہ دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر جلد مجھ کو لکھیو، دیر نہ کیجیو۔

خط کے جواب کا طالب

فقیر غالب''

اس خط کے پہلے پیراگراف میں مرزا تفضّل حسین خاں کا ذکر ہے۔ خطوطِ غالب کے مرتّبین یہ صراحت نہیں کر سکے کہ یہ کون ہیں اور ان کا حکیم ظہیرالدین سے کیا رشتہ ہے۔ اس موقعے پر ان کا تعارف کرا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کیوں کہ خطوطِ غالب میں ایک ہی نام کے متعدد اشخاص کا ذکر ہے جن کو ایک دوسرے سے ممیّز کرنا خط کے مضمون کے سیاق و سباق، غالبؔ کے تلامذہ و مکتوب الیہ اور معاصرین سے ان کے رشتوں کی نوعیت کو سمجھے بغیر ناممکن ہے۔ یہی صورت تفضّل حسین نامی افراد کی ہے۔ خطوطِ غالب میں اس نام کے حسبِ ذیل افراد کا ذکر ملتا ہے:

۱- میر تفضّل حسین خاں ولد فریدالدین احمد ٹونک والے: (اصل وطن خیرآباد) جن کی وفات کا ذکر منشی ہرگوپال تفتہؔ کے نام خط میں آیا ہے۔

(خط نمبر ۲۳، مکتوبہ ۲۳ر فروری ۱۸۵۴ء)

۲- نواب تفضّل حسین خاں (ف ۱۸۸۴ء) ولد نواب عنایت حسین خاں: ان کا ذکر بقول ڈاکٹر خلیق انجم علاء الدین علائی کے نام خط میں آیا ہے۔ یہ نواب تجمل حسین خاں والی فرخ آباد کے بھتیجے تھے۔ (غالب کے خطوط، ج ر ۴، ص: ۱۶۷۴)

۳- تفضّل حسین خاں ولد غلام علی خاں: ان کا ذکر نواب یوسف مرزا کے نام خط میں آیا ہے۔ (خط نمبر ۱، اواخر اپریل ۱۸۵۶ء)

۴- مرزا تفضّل حسین خاں: یہ غالبؔ کے مکتوب الیہ ہیں۔ ان کے نام ایک خط 'عودِ ہندی' میں شامل ہے۔ غالبؔ کے تلامذہ پر تحقیق کے ابتدائی ایام میں غالبؔ کے ایک شاگرد محمد تفضّل حسین کوکبؔ دہلوی کا بھی ذکر کیا گیا تھا، بعد میں یہ ثابت ہوا کہ غالبؔ کے مکتوب الیہ تفضّل حسین خاں اور محمد تفضّل حسین خاں کوکبؔ دہلوی دراصل ایک ہی فرد ہیں۔ غالبؔ کے مکاتیب کے مجموعوں میں ان کے نام کے ساتھ تخلص کا اندراج نہ ہونے کے سبب انھیں دو علیحدہ فرد تصور کرلیا گیا تھا۔ اس امر کی وضاحت کردینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خطوطِ غالب میں مذکورہ صدر ۱ تا ۳ تفضّل حسین نامی افراد کے علاوہ حسبِ ذیل افراد کے نام خطوط میں جس تفضّل حسین نامی فرد کا ذکر آیا ہے، وہ دراصل مرزا محمد تفضّل حسین کوکبؔ دہلوی ہیں:

بنام حکیم غلام نجف خاں (خط نمبر ۹)، حکیم ظہیرالدین (خط نمبر ۱)، باقر علی خاں کامل (خط نمبر ۳)، نواب ضیاء الدین خاں نیر (خط نمبر ۱)، میر مہدی مجروح (خط نمبر ۴۳)۔ لگاتار متعدد خطوط میں ان کا ذکر آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ غالب کے خاصے قریب رہے۔ سطورِ ذیل میں اُن کے مختصر حالات و کوائف اور حکیم ظہیرالدین سے ان کے رشتے کی وضاحت کی جارہی ہے۔

تفضّل حسین کوکبؔ کا تاریخی نام آغا مرزا (۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۵ء) تھا۔ یہ فضل اللہ خاں کے بیٹے اور ریاست الور کے دیوان منشی امین اللہ خاں عرف اموجان کے بھتیجے تھے۔ اس خاندان سے غالبؔ کے روابط تھے۔ کوکبؔ کے والد فضل اللہ خاں سے غالبؔ کی مراسلت تھی۔ ان کے نام دو خط 'پنج آہنگ' میں اور ایک 'باغِ دو در' میں موجود ہے۔

محمود احمد برکاتی نے اپنے مقالے میں ظہیرالدین کے نام غالبؔ کے زیر بحث خط کا مکمل متن درج کیا ہے (العلم، غالب نمبر، ص: ۶۷۴) اور خط میں غالبؔ کے اس جملے: ''تمھارے بھائی مرزا تفضّل حسین کیسے ہیں''؟ میں لفظ بھائی کے بعد بریکٹ میں بہنوئی

درج کیا ہے۔ ممکن ہے اصل خط میں بجائے ''بھائی'' کے لفظ ''بہنوئی'' ہی ہو لیکن وہ بھی یہ صراحت نہیں کر سکے کہ یہ تفضّل حسین کون ہیں؟

راقم الحروف کو بغیر کسی معتبر شہادت کے تفضّل حسین خاں کو ظہیر الدین کا بہنوئی اور حکیم غلام نجف خاں کا داماد تسلیم کرنے میں تامّل تھا۔ حسنِ اتفاق حکیم غلام نجف خاں کے ایک عزیز شیخ امین الدین حیدر (۱۸۷۸-۱۹۴۲ء) کی ایک انگریزی کتاب My Life and Family کے چند فوٹو اسٹیٹ اوراق دستیاب ہوگئے[1] ان میں شیخ صاحب نے عضدالدولہ حکیم غلام نجف خاں سے اپنے رشتے کی بات کرتے ہوئے واضح الفاظ میں لکھا ہے:

> "A DAUGHTER OF HIS (UZD- UDDAULAH'S) i.e. MY MATERNAL GRAND-MOTHER WAS MARRIED TO NAWWAB TAFAZZAL HUSSAIN KHAN, SON OF NAWWAB FAIZULLAH KHAN, WHO WAS A DIVAN OR MINISTER IN ALWAR STATE."
>
> (ترجمہ): اس کی (عضدالدولہ) ایک بیٹی یعنی میری نانی کی شادی نواب تفضّل حسین خاں ابن نواب فضل اللہ خاں سے ہوئی تھی جو الور ریاست میں دیوان یا وزیر کے عہدے پر فائز تھے۔
>
> (مائی لائف اینڈ فیملی، ص:۹)

شیخ امین الدین حیدر شیوخ فاروقی کے ممتاز فرد تھے۔ پیشے سے زمیندار تھے۔ مختلف تعلیمی و سرکاری اداروں کے اعزازی رکن رہے۔ ۱۹۲۰ء میں ''خان بہادر'' کا خطاب پایا۔ مرزا تفضّل حسین کوکبؔ دہلوی، امین الدین حیدر کے حقیقی نانا تھے۔ تفضّل حسین کی بیٹی حکیم احمد جان وقرؔ (ف ۱۹۰۸ء) کو منسوب تھیں جو امین الدین حیدر کے

---

[1] یہ اوراق جناب تسلیم غوری نے ان کے خاندان سے حاصل کیے تھے۔ اس کتاب کے اول و آخر اوراق موجود نہیں ہیں۔ ''مائی لائف اینڈ فیملی'' نام بھی اوراق پر تسلیم غوری کے خط میں لکھا ہوا ہے۔ تسلیم غوری نے ان اوراق کا عکس فراہم کیا جس کے لئے وہ شکریہ کے حق دار ہیں۔

والد تھے۔ وقر حکیم غلام نجف خاں کے والد حافظ مسیح الدین کے بھائی شیخ فتح الدین کے پوتے تھے۔ اس طرح یہ قرابت خاندانی تھی۔

شیخ امین الدین حیدر کے مذکورہ صدر بیان سے مرزا تفضّل حسین خاں کا حکیم غلام نجف خاں کا داماد ہونا ثابت ہوجاتا ہے۔ البتہ ان کے نام کے ساتھ ''نواب'' کا لفظ زائد ہے، الور ریاست میں ان کے والد نائب دیوان تھے۔ (آجکل، دہلی، فروری ۲۰۰۳ء)

تفضّل حسین خاں کے سنہ ازدواج کا علم نہیں ہوسکا۔ حکیم غلام نجف خاں کے نام غالبؔ کے ایک مکتوب مکتوبہ ۱۹رجنوری ۱۸۵۸ء سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوری ۱۸۵۸ء میں ان کی صغرسن بیٹی یعنی حکیم صاحب کی نواسی نے رحلت کی۔ ممکن ہے یہ تفضّل حسین کی پیلوٹی کی اولاد ہو۔ اس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کی شادی ۱۸۵۷ء یا اس سے ایک آدھ سال قبل ہوئی ہوگی۔

تفضّل حسین خاں کوکبؔ فارسی و اردو کی اچھی استعداد رکھتے تھے اور دونوں زبانوں میں فکرِسخن فرماتے تھے۔ شاعری میں غالبؔ سے تلمذ تھا۔ غالبؔ ان کو منشی امین اللہ عرف امّو جان سے تعلق کے سبب مثل بھتیجے کے مانتے تھے اور یہ بھی غالبؔ کو چچا کہتے تھے۔ 'عودِ ہندی' میں ان کے نام جو واحد خط ملتا ہے وہ غالبؔ اور ان کے مابین قربت و تعلق پر ہلکی سی روشنی ڈالتا ہے۔ مرزا لکھتے ہیں:

''کیوں صاحب! یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی و استادی سب پر پانی پھر گیا''۔ (غالب کے خطوط، ج ر ۳، ص:۱۱۷۸)

اسفند یار بیگ کی سازش سے منشی امّو جان کو جملہ رشتہ داروں کے ساتھ الور چھوڑ کر دہلی جانا پڑا۔ تفضّل حسین بھی دہلی میں بس گئے۔ غالبؔ نے اس واقعے پر ایک خط میں تشویش کا اظہار کیا ہے۔ (خط بنام غلام نجف خاں، نمبر ۹، مکتوبہ دسمبر ۱۸۵۸ء) یہ خط وہی ہے جس کی حکیم غلام نجف خاں سے نسبت پر ہم نے گذشتہ سطور میں شبہے کا اظہار کیا ہے۔

تفضّل حسین خاں کوکبؔ نے ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء میں انتقال کیا۔ قربان علی بیگ سالک دہلوی (ف ۱۸۸۰ء) نے ان کی وفات پر مرثیہ لکھا اور چند تاریخی قطعات کہے جو ان کے کلیات 'کلیاتِ سالک' (دہلی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) میں شامل ہیں۔[1]

مرزا تفضّل حسین نے دہلی کی تباہی و بربادی پر ایک کتاب 'فغانِ دہلی'[2] (مطبوعہ اکمل المطابع، دہلی، ۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۳ء) مرتّب کی تھی جس میں ۷۳ شعرا کی ۵۵ نظمیں و غزلیات یکجا کی گئی ہیں۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔ اس کتاب کا ایک ایڈیشن ۱۹۵۴ء میں اکادمی پنجاب لاہور نے بھی شائع کیا تھا۔ اسی کتاب کی اساس پر نظامی بدایونی (ف ۱۹۴۷ء) نے اپنی کتاب 'فریادِ دہلی معروف بہ انقلابِ دہلی' (نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۱ء) مرتّب کی تھی۔ راقم الحروف نے اپنے علمی مقالے 'نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات' (ص: ۱۶۰ تا ۱۶۸) میں دونوں کتب کا تقابل پیش کر دیا ہے۔

تفضّل حسین خاں کے علاوہ حکیم ظہیرالدین کے نام غالبؔ کے مذکورہ بالا خط میں دوسری اہم بات تنخواہ ہے۔ ماہرین غالبیات اس سلسلے میں بھی صراحت نہیں کر سکے۔ مالک رام نے لکھا ہے:

> ''غدر کے ساتھ ہی میرزا کی آمدنی کے سب وسیلے بند ہو گئے۔ قلعے کی تنخواہ تو بند ہونا ہی تھی... انگریزوں کی طرف سے جو خاندانی پنشن ملتی تھی وہ بھی بند ہو گئی... یہ دیکھ کر نواب ضیاء الدین احمد خاں نے میرزا کی بیوی جناب امراؤ بیگم کے پچاس روپے ماہانہ مقرر کر دیے۔ دراصل بالواسطہ یہ بھی میرزا ہی کی امداد تھی۔ وظیفہ بیگم کو ان کی وفات

---

[1] تفضّل حسین کوکب کے مزید حالات جاننے کے لیے دیکھیے:

(۱) تلامذہ غالب، مالک رام، طبع ثانی، دہلی ۱۹۸۴ء (ص: ۴۶۷ تا ۴۶۹)، (۲) تفضّل حسین کوکب، مشتاق احمد تجاروی، آج کل دہلی، فروری ۲۰۰۳ء، (۳) غالب کے ایک معاصر منشی امین اللہ خان، مشتاق احمد تجاروی، غالب نامہ دہلی، جنوری ۲۰۰۳ء۔

[2] مالک رام نے تلامذہ غالب (طبع دوم)، ص: ۴۶۹ پر اس کا سالِ اشاعت ۱۸۷۹ درج کیا ہے جو درست نہیں۔

تک ملتا رہا۔ میرزا رامپور سے ۲رنومبر ۱۸۶۵ء کو حکیم ظہیر الدین کے
نام لکھتے ہیں''۔ (ذکرِ غالب، ص: ۷۴)

مالک رام نے ظہیر الدین کے خط کا اقتباس درج کرکے اپنے بیان کو مکمل کر دیا ہے۔ دراصل شہاب الدین (خلف نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر) کے مذکورہ خط میں ذکر کے سبب مالک رام نے یہ خیال قائم کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے تنخواہ پر جو حاشیہ دیا ہے وہ حسب ذیل ہے:

''سمجھ میں نہیں آتا کہ غالبؔ کس تنخواہ کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس خط میں غالبؔ کے بیان سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے سسرال والے ان کی مدد کرتے تھے اور پچاس روپے ماہوار دیتے تھے۔ غالبؔ نے ان پچاس روپے ماہوار کا ذکر اس خط کے علاوہ کہیں نہیں کیا''۔

(غالب کے خطوط، ج ر ۲، ص: ۹۶۴، ۹۶۵)

البتہ ڈاکٹر حنیف نقوی نے راقم الحروف کے نام اپنے خط مورخہ ۱۰رنومبر ۲۰۰۳ء میں اس کی وضاحت کی۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا:

''اس سلسلے میں اب تک کوئی باوثوق معلومات سامنے نہیں آئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امراؤ بیگم کو لوہارو اسٹیٹ سے تیس روپے ماہوار بطورِ تنخواہ یا وظیفہ ملتے تھے۔ یہ تنخواہ شمس الدین احمد خاں نے بند کر دی تھی۔ ان کے پھانسی پانے کے بعد غالباً حکومت پنجاب کے ایما پر مسٹر ٹی. ٹی. مٹکاف ایجنٹ برائے گورنر جنرل شمالی مغربی صوبہ جات متعینہ دہلی نے ۱۰رجنوری ۱۸۳۹ء کو نواب احمد بخش خاں کے افرادِ خاندان اور متعلقین کا ایک تفصیلی گوشوارہ تیار کرکے بھیجا تھا۔ اس میں نمبر ۲۵ پر امراؤ بیگم کا نام درج ہے۔ ان کی عمر ۴۲ سال اور رشتہ بھتیجی بتایا گیا ہے۔ ذاتی ملکیت کچھ نہیں۔ کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ احمد بخش خاں کی جانب سے تیس روپے ماہانہ ملتے تھے۔ یہ وظیفہ شمس

الدین خاں نے بند کر دیا۔ کسی امداد کی ضرورت نہیں یہ دستاویز غالباً حکومت پنجاب (پاکستان) کے آرکائیوز ڈپارٹمنٹ میں محفوظ ہے۔ اس میں کل ۳۴ افراد کے نام شامل ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ لوہارو کے نظم جدید کے بعد یہ تنخواہ بحال کردی گئی ہوگی اور اسے تمیں روپے سے بڑھا کر پچاس روپے کر دیا گیا ہوگا"۔

حکیم ظہیرالدین کے نام غالبؔ کا دوسرا خط بدونِ تاریخ ملتا ہے جس میں چنبیلی کے پھول کے بارے میں استفسار کیا گیا ہے کہ اسے فارسی میں کیا کہتے ہیں؟ یہ مقامی اور دستی رقعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس استفسار سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکیم ظہیرالدین بھی اپنے والد کی طرح فارسی اور طب میں اعلیٰ استعداد رکھتے ہوں گے۔

ظہیرالدین کے والد حکیم غلام نجف خاں کے نام متعدد خطوط کے آخر میں ظہیرالدین کے نام مستقل عبارتیں ہیں۔ ان کو بھی یہاں درج کردینا مناسب ہوگا:

"کیوں ظہیرالدین! کیا میں اس لائق نہ تھا کہ تو ایک خط مجھ کو الگ لکھتا یا اپنے باپ کے خط میں اپنے ہاتھ سے بندگی لکھتا۔ حکیم غلام نجف خاں خط لکھنے بیٹھے، تیری بندگی لکھ دی۔ تیرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ اس بندگی کے آنے کی مجھے کیا خوشی؟"

(خط نمبر ۱۳، ۱۱ر جنوری ۱۸۶۳ء)

"حکیم ظہیرالدین خاں کو دعا۔ بیٹا! اب اس وقت مجھ میں دم نہیں۔ دعا پر قناعت کر۔ تیرے خط کا جواب جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں، بھیج چکا ہوں۔ جھوٹے پر لعنت! تو بھی کہہ، بیش باد!"

(خط نمبر ۱۴، یکم اپریل ۱۸۶۵ء)

"ظہیرالدین خاں بہادر کو دعا پہنچے۔ یہ خط لے کر تم اپنی دادی صاحبہ کے پاس جاؤ اور یہ خط پڑھ کر سناؤ اور ان سے کہہ دو کہ وہ بات جو میں نے تم سے کہی تھی وہ غلط ہے۔ اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔ باقی خیر و عافیت"۔

(خط نمبر ۱۷، ۲۱ر اکتوبر ۱۸۶۵ء)

حکیم ظہیرالدین، حکیم غلام نجف خاں کے اکلوتے فرزند تھے۔ عبداللطیف کے بیان کے مطابق حکیم احسن اللہ خاں نے انھیں اپنا متبنّیٰ بنالیا تھا (۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص: ۱۲۵)۔ ان کا صحیح اور مکمل نام 'ظہیرالدین احمد' تھا۔ غالبؔ کے خط بنام ظہیر اور عبداللطیف کے بیان میں ظہیرالدین احمد خاں اصل نام ہی استعمال ہوا ہے (ایضاً، ص: ۱۲۵) لیکن شجرۂ نسب میں حکیم ظہیرالدین ملتا ہے (شیخو سے شیخو پور تک، ص: ۶۹)۔ قیاس یہ ہے کہ ''ظہیرالدین احمد'' تاریخی نام ہے۔ اس سے ۱۲۶۳ھ برآمد ہوتا ہے جو مطابق ہے ۷-۱۸۴۶ء کے۔ ۱۲۶۳ھ کا آغاز ۲۰/دسمبر ۱۸۴۶ء کو ہوا تھا۔ لہٰذا اگر ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء کو حکیم ظہیرالدین کا سالِ ولادت قرار دیا جائے تو درست ہوگا۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے بھی اپنے خط بنام راقم الحروف میں اسی سنہ کی تائید کی ہے۔ (مورخہ ۱۰/نومبر ۲۰۰۳ء)۔ دوسرے تمام ذرائع بھی اسی قیاس کی تائید کررہے ہیں۔ حکیم محمود احمد برکاتی نے ان کا سالِ ولادت شیخ وحید احمد مسعود کی اطلاع کے بموجب ایک جگہ ۱۸۴۷ء اور دوسری جگہ ۱۸۴۶ء درج کیا ہے (العلم، غالب نمبر، ص: ۴۷۰، ۴۷۵) جس کی ایک حد تک تصدیق مولوی رضی الدین بسملؔ بدایونی (ف ۱۹۲۵ء) کے اس جملے سے ہوتی ہے جس میں انھوں نے حکیم ظہیرالدین کو اپنا دوست اور ہم عمر لکھا ہے (کنزالتاریخ، ص: ۳۱۳)۔ رضی الدین نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے چشم دید حالات کو بہ عمر دس سال دیکھنا بھی لکھا ہے (ایضاً، ص: ۳۰۴) رضی الدین کا سالِ پیدائش ۱۲۶۴ھ/ ۱۸۴۸ء ہے (انساب شیوخ فرشوری، ص: ۹۳)۔ محمود احمد برکاتی نے ان سنینِ ولادت پر تامّل کا اظہار کیا ہے اور قیاسی طور پر ''۱۸۴۰ء کو ان کا سالِ ودلات ہونا چاہیے'' لکھا ہے۔

(العلم، ص: ۴۷۵)

راقم الحروف کے خیال میں ہم عمر لکھنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ ایک ہی سالِ ولادت ہو، اس میں ایک آدھ سال کا فرق بھی ہوسکتا ہے۔ اس اعتبار سے ۱۸۴۷ء کا سنہ درست ہوسکتا ہے۔

حکیم ظہیرالدین نے ۲۵ رفروری ۱۹۰۶ء کو جو بیع نامہ لکھا تھا جس کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا، اس وقت ان کی عمر ۵۹ برس کی تھی۔ عمر کے اس اندراج سے ان کا سالِ پیدائش ۱۸۴۷ء ہی درست قرار پاتا ہے۔

ان کے مقامِ پیدائش کے بارے میں بھی علم نہیں۔ ممکن ہے ان کا مولد بدایوں ہی ہو اور دہلی کے مولد ہونے میں بھی تامّل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی علم نہیں کہ وہ اپنی ہمشیرہ رحمت فاطمہ سے بڑے تھے یا چھوٹے۔ قیاس ہے کہ وہ چھوٹے رہے ہوں گے۔ رحمت فاطمہ کی خوردسال بیٹی کی وفات کا ذکر غالبؔ کے ایک خط مکتوبہ ۱۹ رجنوری ۱۸۵۸ء بنام غلام نجف خاں میں موجود ہے۔

حکیم ظہیرالدین کی تعلیم سے متعلق تفصیلات نہیں ملتیں، گمان ہے کہ انھوں نے اپنے والد اور اپنے عم محترم حکیم احسن اللہ خاں سے طب کی تحصیل کی ہوگی۔ بایں طور طبی سلسلۂ اسناد کے تعلق سے ان کا شمار خاندان شریفی و خاندانِ بقائی کے حکماء میں کیا جاتا ہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد یہ بھی دہلی میں مطب کرنے لگے اور بہت جلد دہلی کے حاذق اطباء میں شمار کیے جانے لگے۔ محمود احمد برکاتی نے بہادر شاہ ظفر کی جانب سے ان کو ''منیرالدولہ'' کا خطاب دیا جانا لکھا ہے (العلم، غالب نمبر، ص: ۴۷۵) جو درست نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں کہ ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر معزول ہوگئے تھے اور اس وقت ظہیرالدین کی عمر تقریباً ۱۱ سال رہی ہوگی۔ دس گیارہ سال کی عمر میں اتنی استعداد و لیاقت حاصل کرلینا کہ خطاب کے مستحق قرار پائیں، ممکن ہی نہیں۔ بعد کو انگریزی حکومت کی جانب سے ان کو ''خان صاحب'' کا خطاب عطا ہوا تھا۔

طب کے علاوہ ان کو قومی کاموں سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ دہلی میونسپل کمیٹی کے بھی ممبر رہے۔ انجمن موید الاسلام (۱۸۹۲ء) کے بھی رکن اور سرپرست رہے۔ حکومت برطانیہ کی جانب سے آنریری مجسٹریٹ درجہ دوم نامزد ہوئے (دلّی کی یادگار ہستیاں، ص: ۳۵۳)۔ ۱۸۹۱ء میں حکومت برطانیہ کی جانب سے فہرست منظور شدہ درباریانِ

قسمتِ دہلی لغایت ۳۱؍دسمبر ۱۸۹۱ء دوسرے اطبا کے ناموں کے ساتھ حکیم ظہیر الدین کے نام کا بھی اندراج ملتا ہے (دلّی اور طب یونانی، ص: ۲۲۳)۔ ان کے معاصرین میں عبداللطیف نے ان کو اچھے الفاظ میں یاد کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''عمدۃ الحکماء (حکیم احسن اللہ خاں) اچھے حکیم، خلیق، نیک اور سخی آدمی تھے۔ اس سبب سے کہ ان کے بھانجے ظہیر الدین احمد خاں ان کے متبنّیٰ تھے۔ ہم ان کا ذکر بھی کیوں نہ کریں کہ وہ پسندیدہ روش اور نیک سیرت آدمی ہیں اور مجھ ہیچ مداں کے بزرگ ترین احباب میں سے ہیں[1] یقیناً وہ ایک بڑے ادیب اور شفیق اور عظیم المرتبت ہستی ہیں''۔ (۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، ص: ۱۲۵، ۱۲۶)

حکیم ظہیر الدین نے دو نکاح کیے تھے[2] پہلا عقد ۶؍دسمبر ۱۸۶۵ء کو ہوا تھا۔ اس شریکِ حیات سے ایک فرزند رضی الدین پیدا ہوئے۔ ان کا دوسرا عقد اپریل ۱۸۴۷ء کو ہوا۔ دوسری شریکِ حیات کے بطن سے ایک فرزند ریاض الدین پیدا ہوئے جو والد کی حیات ہی میں عین عالمِ جوانی میں فوت ہو گئے تھے۔ (العلم، ص: ۴۷۵)

حکیم ظہیر الدین کی نسل اور ان کی علمی وطبی وراثت کے امین تنہا حکیم رضی الدین

۱۔ ۱۸۵۷ء میں ظہیر الدین کی عمر ۱۱ برس تھی۔ عبداللطیف کے روزنامچہ کی مدت تحریر کا علم نہیں ہو سکا۔ ایسی صورت میں یہ بات خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ظہیر الدین، عبداللطیف کے بزرگ ترین احباب میں ہوں۔

۲۔ امداد صابری نے ان کی پہلی شادی کا اپنے خاندان (متوطن شیخوپور، بدایوں) میں ہونا لکھا ہے اور ان خاتون کے بطن سے ایک بیٹے رضی الدین اور چار بیٹیوں کا پیدا ہونا بتایا ہے۔ پہلی زوجہ کے فوت ہو جانے کے بعد دوسری شادی محمد میر کی بہن نور جہاں سے ہونا لکھا ہے جن سے ایک بیٹے ریاض الدین کا ذکر کیا ہے۔ (دلّی کی یادگار ہستیاں، ص: ۳۵۳) لیکن محمود احمد برکاتی نے دونوں شادیوں کا دہلی کے خاندانوں میں ہونا لکھا ہے۔ دونوں شادیوں کی تاریخ اور ظہیر الدین کے خسر کے نام بالترتیب عظیم اللہ خاں دہلوی اور سید مہر بادشاہ منصف دہلوی لکھے ہیں۔ (العلم، ص: ۴۷۵) اس سلسلے میں صحیح صورتحال سے واقفیت کے شواہد سردست دستیاب نہیں لہٰذا میں نے صرف برکاتی کی درج کردہ شادیوں کی تاریخوں کو قبول کر لیا ہے۔

(۱۸۶۸-۱۹۱۶ء) تھے۔ ان کو اولاً خان بہادر کا خطاب ملا۔ ۱۹۱۰ء میں "شفاء الملک" کے خطاب سے سرفراز کیے گئے۔ وہ حکیم اجمل خاں (ف ۱۹۲۷ء) کے طب و سیاست دونوں میں حریف رہے۔ ان کے بیٹے حکیم ناصرالدین (ف ۱۹۵۸ء) بھی بحیثیت طبیب معروف ہوئے۔ یہ ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد (ف ۱۹۶۳ء) کے اعزازی طبیب تھے۔

حکیم ظہیرالدین کی تاریخِ وفات بھی نہیں ملتی۔ پندرہ روپے کے کاغذ (اسٹامپ) پر ایک بیع نامہ راقم الحروف کی نظر سے گزرا جس کے مطابق حکیم ظہیرالدین اور ان کے بیٹے حکیم رضی الدین نے ایک قطعہ اراضی یوسف علی خاں لودی کے ہاتھ ۲۵ رفروری ۱۹۰۶ء کو فروخت کیا تھا۔ یہ بیع نامہ حکیم ظہیرالدین نے خود ہی لکھا تھا[1] اس بیع نامہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ۲۵ رفروری ۱۹۰۶ء تک حکیم ظہیرالدین حیات تھے۔

۳

مولوی محمد عزیز الدین صادقؔ

ان کے نام بھی صرف ایک خط ملتا ہے جو 'اردوئے معلّیٰ' اور 'عودِ ہندی' دونوں میں شامل ہے۔ 'غالب کے خطوط'، (ج ر ۴، ص: ۱۴۴۴) میں بھی یہ شامل ہے۔ اس خط پر تاریخ درج نہیں۔ خط میں غالبؔ نے ۱۸۵۷ء کے بعد دلّی کی تباہی کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کے پیش نظر ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کا زمانۂ تحریر ۱۸۵۸ء درج کیا ہے۔ عزیز کے بھتیجے مولوی رضی الدین بسملؔ نے اپنی کتاب 'کنزالتاریخ' (ص: ۳۴۹) میں اس خط کے بعض جملے اپنی یادداشت سے لکھے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ دسمبر ۱۸۵۸ء میں عزیزؔ نے مرزا غالبؔ کو دہلی کا حال دریافت کرنے کی غرض سے ایک خط لکھا تھا۔ مرزا کا زیرتذکرہ خط دراصل اُسی کا جواب ہے۔ رضی الدین کے اس بیان سے جہاں اس خط

---

[1] اس بیع نامہ کی اصل کاپی جناب تسلیم غوری بدایونی کے پاس محفوظ ہے۔

کے زمانۂ کتابت میں ماہِ دسمبر کا اضافہ ہوا وہیں سنہ کا تعین جو خط کے مضمون کی بنیاد پر کیا گیا تھا اس کی ایک خارجی شہادت بھی مل گئی۔ لہٰذا اب اس خط کا زمانۂ کتابت وسط یا آخر دسمبر ۱۸۵۸ء درست ہوگا۔

یہ خط بغیر القاب لفظ 'صاحب' سے شروع ہوتا ہے۔ اس خط کے مضمون سے متعلق چند باتیں 'کنز التاریخ' کے بیانات کی روشنی میں واضح ہوجاتی ہیں۔ مثلاً غالبؔ لکھتے ہیں:

"تمہارے مکان میں جو چھوٹی بیگم رہتی تھی اس کے پاس اور لکھمی کی دکان پر اس اشتہار کو بھیجا۔ بیگم لاہور گئی ہوئی ہے۔ لکھمی کی دکان میں کتے لوٹتے ہیں"۔ (غالب کے خطوط، ج ر ۴، ص: ۱۴۴۴)

صاحبِ 'کنز التاریخ' نے 'چھوٹی بیگم' کے بارے میں لکھا ہے:

"دیوان خانۂ جناب دادا صاحب (مراد عزیز الدین کے والد) میں ایک بیگم صاحبہ جو چھوٹی بیگم کر کے مشہور تھیں اور وہ کسی معزز یورپین کی بی بی تھیں اور ان کے لڑکے عیسائی کسی عہدۂ جلیلہ پر مامور تھے اور ان کو دو سو روپیہ ماہوار کی پنشن یا کسی بینک سے جیب خرچ ملتا تھا۔ وہ نہایت بوڑھی بیگم تھیں۔ بہت روزوں سے رہتی تھیں جبکہ دادا صاحب اپنے وطن قدیمی بدایوں میں تشریف لائے تھے ان کو کرایہ پر دے دیا تھا"۔ (ص: ۳۰۵)

"لکھمی حلوائی ہمارے دیوان خانہ کے متعلق جو دکانات ہیں ان میں بیٹھا کرتا تھا اور اس کی مٹھائی شہر میں مشہور تھی"۔ (ص: ۳۴۹)

اسی خط میں ایک 'محضر نامہ' کا بھی مذکور ہوا ہے۔ غالبؔ لکھتے ہیں:

"میں نے آپ مہر کردی۔ حکیم احسن اللہ خاں اور میاں غلام نجف اور بہادر بیگ اور نبی بخش خاں ساکن دریبہ ان کی مہریں ہوگئیں۔ محضر آپ کے پاس بھیجتا ہوں"۔ (غالب کے خطوط، ج ر ۴، ص: ۱۴۴۴)

یہ محضر ایک خاص واقعے سے متعلق ہے لہٰذا اس محضر کے پس منظر کو درج کیا جارہا ہے۔

جنرل بخت خاں (ف ۱۸۵۹ء) نے ۱۸۵۷ء میں علمائے دہلی سے جو فتویٰ مرتّب کرایا تھا (ملاحظہ کریں اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد شعراء، ص:۱۴۸ تا ۱۵۹) اس پر مولوی سعید الدین نامی کسی عالم کی مہر اور دستخط تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے ختم ہونے کے بعد دہلی میں موجود املاک وغیرہ کی بحالی کے لیے جب مولوی عزیز الدین مع اپنے بڑے بھائی حکیم سعید الدین درخواست گزار ہوئے، تب دستاویزات پر سعید الدین نام سے انگریز افسر کا ذہن مرتّبین فتویٰ میں شامل سعید الدین کی طرف منتقل ہوا اور اس نے حکیم سعید الدین کو طلب کرلیا۔ یہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے ایام میں ریاست رامپور میں مقیم تھے۔ لہٰذا اس دارو گیر سے بچانے کے لیے بدایوں اور رامپور میں ان کی موجودگی ثابت کی گئی جس کے لیے یہاں کے عمائدین کے دستخط اور مہروں سے ایک محضر مرتّب ہوا۔ دہلی میں ان کی عدم موجودگی دکھانے کے لیے شرفا و عمائدین دہلی سے ایک محضر نامہ مرتّب کرایا گیا۔ عزیز الدین نے مرزا غالبؔ کے ذریعے اس محضر پر دستخط اور مہریں لگوائی تھیں۔ ان دونوں محضر ناموں کے جمع کرنے کے بعد حکیم سعید الدین کی جان بچی۔

اس واقعے کی بالتفصیل روداد حکیم سعید الدین کے بیٹے رضی الدین بسملؔ نے اپنی کتاب 'کنز التاریخ' (ص:۳۵۱ تا ۳۵۲) میں محفوظ کردی ہے۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے بھی 'غالب اور عصرِ غالب' میں اس روداد کو نقل کردیا ہے (ص:۱۵۴ تا ۱۵۹)۔ ڈاکٹر قادری کی ایک دوسری کتاب 'جنگ آزادی ۱۸۵۷ء' (کراچی ۱۹۷۶ء) میں بھی اس واقعے کو دیکھا جاسکتا ہے (ص:۳۰۴ تا ۳۳۴)۔

قاضی عبدالودود نے 'جہانِ غالب' عنوان کے تحت اس خط اور اس کے مکتوب الیہ کے بارے میں اظہارِ خیال کیا تھا (معاصر، پٹنہ، حصہ ۴)، انھوں نے لکھا:

"اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ کا گھر ویران پڑا تھا

اور وہ شورش ۵۷ء کے فرو ہونے کے بعد بریلی میں تھے۔ [یہ اس لیے
کہ خط میں قاضی جمیل الدین (صحیح عبدالجمیل) بریلوی کو سلام ہے]''۔

(جہانِ غالب، ص:۷۸)

بدایوں سے بریلی کا راستہ اُس دور میں بھی دن بھر کی مسافت کا تھا۔ آج یہ ڈیڑھ سے دو گھنٹے کی مسافت ہے۔ ممکن ہے عزیز نے غالبؔ کو دریافتِ حال کے لیے جو خط لکھا وہ بریلی سے لکھا ہو۔

۴

مُنشی سخاوت حسین، مدہوش

ان کے نام غالبؔ کا صرف ایک خط (مکتوبہ ۴/فروری ۱۸۶۱ء) ملتا ہے۔ یہ خط غالبؔ کی وفات کے بعد مگر مدہوشؔ کی حیات (ف ۱۹۰۱ء) میں ۱۸۹۴ء کے اوائل میں مشتہر ہوا۔ مدہوشؔ اُن دنوں شاہجہانپور میں بہ سلسلۂ وکالت مقیم تھے۔ گمان بہ درجہ یقین ہے کہ انھوں نے ازخود اسے شائع کرایا تھا۔ یہ خط پہلی بار شاہجہانپور سے شائع ہونے والے 'سراجِ سخن' کی فروری ۱۸۹۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں فرخ جلالی نے ''غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط مدہوش بدایونی کے نام'' عنوان سے ماہنامہ 'آجکل' نئی دہلی (فروری ۱۹۶۰ء) میں اسے نقل کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے 'غالب کی نادر تحریریں' (ص:۳۸) میں اسے 'آجکل' سے نقل کیا۔ ۱۹۶۳ء میں 'رقعاتِ مدہوش' کا جب دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں بھی اسے شامل کیا گیا (ص:۱۷) بعد میں یہ 'غالب کے خطوط' ج/۳ (ص:۱۰۳۷) میں شامل ہوا۔

اس خط میں غالبؔ نے مدہوشؔ کو مشفقی و مکرمی سلمہ اللہ تعالیٰ کے القاب سے مخاطب کیا ہے۔ غالبؔ نے اس خط میں مکتوب الیہ کے حسنِ اخلاق کی تعریف اور دیدار کی خواہش ظاہر کی ہے۔ یہ خط مقفّیٰ جملوں میں لکھا گیا ہے اور انشائے غالب کا دلکش نمونہ ہے۔

۵

حکیم سیّد احمد حسن مودودی، فداؔ

'اردوئے معلّٰی' میں ان کے نام گیارہ خط ہیں۔ یہ خطوط ۲۸/جون ۱۸۶۱ء سے ۱۷/جولائی ۱۸۶۸ء سات سال کو محیط ہیں۔ غالبؔ نے ان خطوط میں پیرو مرشد، حضرت قبلہ، سیّد صاحب وقبلہ، القاب سے فداؔ کو مخاطب کیا ہے۔ ان خطوط میں تاریخوں کا اہتمام ملتا ہے۔ غالبؔ نے فداؔ کو سیّد ہونے کے سبب احترام سے یاد کیا ہے۔ مگر فداؔ کی جانب سے جلد جلد خط لکھنے اور غزلوں پر اصلاح کا تقاضا کرنے سے کہیں کہیں عاجز بھی نظر آتے ہیں۔ فداؔ نے اپنے کسی خط میں غالبؔ کو قبلۂ قبلہ اور کعبۂ کعبہ لکھا ہوگا۔ اس کے جواب میں غالبؔ لکھتے ہیں:

"'قبلۂ قبلہ اور کعبۂ کعبہ' یہ کیا ترکیب ہے؟...زنہار قبلۂ قبلہ کبھی نہ لکھیے گا۔ یہ سوے ادب ہے"۔ (خط نمبر ۱، مکتوبہ ۲۸/جون ۱۸۶۱ء)

فداؔ نے اپنی مہر پر کھدانے کے لیے ایک سجع کی فرمائش کی۔ غالبؔ نے لکھا:

"بہار گلستان احمد حسن

یہ سجع کیا برا ہے:

دلِ حیدر و جانِ احمد حسن

یہ اس سے بھی بہتر ہے۔ انھیں دونوں میں سے ایک سجع مہر پر کھدوا لیجیے"۔ (خط نمبر ۱، مکتوبہ ۲۸/جون ۱۸۶۱ء)

غالبؔ کے کلام میں اس سجع کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ فداؔ نے میر ابراہیم علی خاں وفاؔ اور میر عالم علی خاں مائلؔ کو اصلاح دینے کے لیے غالبؔ کو لکھا ہوگا۔ غالبؔ نے جواب میں لکھا:

"آپ کا حکم بے تکلف مانوں گا۔ جناب ابراہیم علی خاں صاحب اور حضرت میر علی خاں (کذا) صاحب کی خدمت گزاری کو اپنا

فخر و شرف جانوں گا"۔ (خط نمبر ۴، ۱۷ر جنوری ۱۸۶۶ء)

اسی خط میں سفر رامپور کی بھی اطلاع دی ہے۔

فدآ بہت پُر گو تھے۔ انھوں نے اپنا دیوان تیار کرلیا تھا۔ (خط مکتوبہ ۲۵ر دسمبر ۱۸۶۶ء) وہ چاہتے ہوں گے کہ سارا دیوان غالبؔ کی نظر سے گزر جائے۔ لہٰذا جلد جلد اصلاح کے لیے غزلیں بھیجتے تھے۔ چنانچہ غالبؔ نے متعدد خطوط میں اپنے بڑھاپے اور کمزوری کا دکھڑا بیان کیا ہے مگر ساتھ ہی خدمت گزاری کا اعادہ بھی کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے ... کہتے ہیں کہ شاہ شرف بو علی قلندر کو بہ سبب کبرِسن کے، خدا نے فرض اور پیغمبر نے سنت معاف کردی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمت اصلاحِ اشعار مجھ پر معاف کریں"۔ (خط نمبر ۵، مکتوبہ ۸ر اپریل ۱۸۶۶ء)

"مگر میرے قبلہ و کعبہ واسطے خدا کے، شجرہ منظومہ[1] ارسال نہ فرمائیے گا۔ اس کی اصلاح میرے حدِ وسع سے باہر ہے"۔

(خط نمبر ۶، مکتوبہ ۲ر جون ۱۸۶۶ء)

"حضرت یہ آپ کے جدامجد کا غلام تو مرلیا۔ کثرتِ احکام، تواترِ ورودِ اشعار پھر یہ ہنجار کہ سو روپے کے نوٹ کی رسید سو بار مانگتے ہو... غزلیں آپ کی برتی ہیں کہاں تک دیکھوں؟ آپ کی غزلوں کے ساتھ اور غزلیں بھی گُم ہوجاتی ہیں ـ... آپ کی غزلیں شمار سے باہر ہیں۔ بکس میں دیکھوں گا۔ کتابوں میں ڈھونڈوں گا، مدعا یہ کہ آپ اور دونوں سیّد صاحب اس کا التزام کریں کہ ایک غزل اپنے خط میں بھیجیں جب وہ غزل اور اس خط کا جواب پہنچ جائے تب دوسری غزل خط میں

---

[1] ارباب تصوف کے یہاں مرشد سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک روحانی سلسلے کو ترتیب وار یاد کرنا اور روزانہ اس کا ورد کرنا بھی یومیہ معمول کا حصہ ہے۔ ان شجروں کو منظوم صورت بھی دی جاتی رہی ہے۔ غالب کو ان شجروں سے بڑی نفرت تھی۔ (غالب، ص: ۲۷۶)

ملفوف ہو کر بھیجی جائے، اور خط، ہر صاحب کا جدا ہو۔ آپ یہ میرا خط خود غور سے پڑھ لیں اور دونوں سیّد صاحبوں کو پڑھوا دیں''۔

(خط نمبر ۹، مکتوبہ ۱۸؍اکتوبر ۱۸۶۶ء)

حکیم سید احمد حسن فدآ، میر عالم علی خاں مائل اور نواب ابراہیم علی خاں وفا تینوں کا تعلق سادات سہسوان سے تھا اور خاندانی رشتے سے بھی جڑے ہوئے تھے لہٰذا ایک خط میں غالب نے اسی باہمی قرابت و تعلق کو جاننے کے لیے استفسار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''دوسری یہ بات ہے کہ آپ سید صاحب کا حال مفصل لکھیے۔ ایسا کہ لاکھ کا ملک بڑودہ کی سرکار سے ہمارے محسن کو ملا ہے کہ ان سے دو لاکھ روپے نذرانہ مانگا جاتا ہے؟ آگے اس راج میں حسام الدین حسین خاں اور شرف الدین حسین خاں بڑے معزز اور مکرم متوسّل تھے اور سیر حاصل جاگیریں رکھتے تھے۔ کیا سید ابراہیم علی خاں صاحب اسی خاندان میں سے ہیں؟ اور ہاں یہ بھی لکھیے کہ میر عالم علی خاں کو ان سے اور آپ کو ان دونوں صاحبوں سے کیا قرابت ہے؟''

(خط نمبر ۸، مکتوبہ ۲۵؍دسمبر ۱۸۶۶ء)

اس خط کی وضاحت ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس طور کی ہے:

''غالباً اسی سوال کی بنیاد پر مالک رام صاحب نے مائل کے حالات میں میر ابراہیم علی خاں کو 'ان کے عزیزوں' میں لکھا ہے۔ مدنی صاحب اور مولانا غلام رسول مہر انھیں مجملاً وفا کا بھائی بتاتے ہیں (سخنورانِ گجرات، ص:۳۲۲ و خطوطِ غالب، ص:۴۲۶) لیکن نہ تو حسام الدین حسین کے خاندانی نسبت کے سلسلے میں مرزا غالب کا قیاس صحیح تھا اور نہ وفا اور مائل کے باہمی رشتے کے متعلق، آخر الذکر دونوں حضرات کا بیان درست ہے۔ حسام الدین حسین خاں کے بزرگ ہرات کے رہنے والے تھے اور ان کا خاندان دہلی ہوتا ہوا بڑودہ پہنچا تھا جب کہ مائل اور وفا کے مورثِ اعلیٰ نخشبی الاصل تھے اور یہ لوگ سہسوان

(ضلع بدایوں) سے بڑودہ منتقل ہوئے تھے۔ ان دونوں خاندانوں کے درمیان اس زمانے تک کوئی رشتہ داری بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں وفاؔ کے دو بیٹوں سیّد احتشام علی اور سیّد محمود علی کی شادیاں حسام الدین حسین کے بیٹے سیّد نورالدین حسین کی دو صاحبزادیوں سے اور ایک بیٹی سراج النساء کا نکاح موخرالذکر کے بیٹے سیّد نصیرالدین سے ہوا۔ مائلؔ کے چھوٹے بھائی خان بہادر میر مظہر علی کے صاحبزادے خان بہادر میر اظہر علی کی پہلی شادی بھی حسام الدین حسین کے فرزندِ اکبر میر کمال الدین حسین کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ مائلؔ اور وفاؔ دونوں اگرچہ قاضی عبدالشکور (مورثِ اعلیٰ سادات سہسوان) کے فرزندِ اکبر قاضی محمد صالح کی اولاد میں تھے لیکن ان دونوں میں کوئی بہت قریبی رشتہ نہ تھا بجز اس کے کہ وفاؔ کے دادا میر سرفراز علی کی دوسری شادی مائلؔ کی حقیقی پھوپھی مسماۃ وزیرالنساء (بنت سیّد عطاء محی الدین) سے ہوئی تھی۔ فداؔ اور وفاؔ کے درمیان بھی قرابت کی تقریباً یہی نوعیت تھی۔ اس کے برخلاف مائلؔ اور فداؔ کے درمیان بہت قریبی اور دوہرا خونی رشتہ تھا۔ مائلؔ کی والدہ مسماۃ مہرالنساء (بنت قاضی فضل امام) فداؔ کی حقیقی پھوپھی اور ان کی دادی مسماۃ امیرالنساء (زوجہ عطا محی الدین) فداؔ کے والد (سیّد محمد حسن بن قاضی فضل امام) کی حقیقی پھوپھی تھیں''۔

(غالب - احوال و آثار، ص: ۱۸۳، ۱۸۴)

فداؔ نے نواب ابراہیم علی خاں کے یہاں بیٹے کی متوقع پیدائش کے بارے میں غالبؔ سے قطعہ کہنے کی فرمائش کی ہوگی۔ غالبؔ نے جواب میں انھیں لکھا:

''یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ نواب صاحب قبلہ کے ہاں اس مہینے لڑکا ہونے والا ہے۔ مجھ کو تاریخ تولد کا خیال رہے گا۔ جب آپ کی تحریر سے نوید تولد معلوم کرلوں گا تب قطعہ یا رباعی جو کچھ ہوگئی وہ بھیج دوں گا''۔ (خط نمبر ۱۱، مکتوبہ ۱۷؍ جولائی ۱۸۶۸ء)

اسی خط میں غالبؔ نے اپنی تصویر کی رسید ملنے پر انھیں لکھا:

"بارے بہ صورت تصویر دونوں صاحبوں کی خدمت میں میرا پہنچنا معلوم ہوا۔ اگر چہ اس صورت میں چلنا پھرنا خدمت بجالانی نہیں ہوسکتی مگر خیر، حضرت کے پیش نظر رہوں گا۔ عنایت کی نظر رہے میرے حال پر"۔ (حوالۂ سابق)

۶

نواب میر ابراہیم علی خاں وفاؔ

'اردوئے معلیٰ' میں ان کے نام پانچ خط ملتے ہیں۔ پہلا خط ۲۱/جولائی ۱۸۶۶ء کا ہے اور آخری جولائی اگست ۱۸۶۸ء کا۔ پانچوں خطوط میں تاریخوں کا اہتمام ملتا ہے۔ غالبؔ نے ان خطوط میں پیر و مرشد، ولی نعمت، سیّد صاحب وقبلہ، جناب تقدس انتساب وغیرہ القاب و آداب سے وفاؔ کو مخاطب کیا ہے۔ خطوط کی عبارت میں نواب کی امارت و منصب کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"قبلہ آپ کے بھائی صاحب میر عالم علی خاں صاحب مجھ پر کیوں خفا ہیں کہ اپنی غزل نہیں بھیجتے؟ یہ امر اُن کے خاطر نشان ہوجائے کہ غالبؔ آپ کے دادا کا غلام اور خدمت بجالانے کو آمادہ ہے"۔ (خط نمبر ۱، مکتوبہ ۲۱/جولائی ۱۸۶۶ء)

ایک خط میں نواب کی تصویر موصول ہونے اور اپنی تصویر بھیجنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تصویر مہر تنویر مجھے پہنچی اور میں نے رسید لکھ پہنچی (کذا)... امسال فقیر نے جو خاکساری کا خاکہ یعنی تصویر منشی میاں داد خاں کی معرفت نذر کی ہے یقین ہے وہ بھی پہنچی ہوگی"۔

(خط نمبر ۲، مکتوبہ ۱۷/اگست ۱۸۶۶ء)

ایک خط میں آزردہؔ نامی کسی شاگرد کا تذکرہ ہے۔ لیکن 'تلامذۂ غالب' یا کسی دوسرے تذکرے کے حوالے سے آزردہ تخلص کا غالبؔ کا کوئی شاگرد ابھی تک منصۂ شہود پر نہیں آیا۔ لکھتے ہیں:

''دو تین دن ہوئے کہ قبلہ و کعبہ میر عالم علی خاں کا خط آیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ آزردہ تخلص کی دو غزلیں اصلاحی پہنچیں۔ دیکھیے اس سہو کو، کہ کس کی غزلیں کس کو پہنچیں۔ مزا اس میں ہے کہ اب یہ بھی یاد نہیں آتا کہ آزردہؔ کا نام کیا ہے؟ اور وہ کون ہے؟ اور کہاں کا ہے؟... یہ اکہتر برس کی عمر کی خوبی ہے''۔ (خط نمبر ۳، مکتوبہ ۲/ اکتوبر ۱۸۶۶ء)

ایک خط میں اپنے ضعف اور غذا کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''قبلہ ضعف نے مضمحل کر دیا ہے۔ حواس بجا نہیں۔ اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے تہتّرواں برس شروع ہو گیا ہے۔ غذا بہ اعتبار آرد و برنج مفقود۔ محض صبح کو پان سات بادام کا شیرہ، بارہ بجے آبِ گوشت، شام کو چار کباب تلے ہوئے، بس آگے خدا کا نام''۔

(خط نمبر ۴، مکتوبہ ۵/ دسمبر ۱۸۶۶ء)

ایک خط میں مکتوب الیہ کے یہاں بیٹا تولّد ہونے پر ایک عبارت رنگین اور ایک قطعہ و رباعی کہہ کر 'اکمل الاخبار' میں چھپوانے کی اطلاع دی گئی ہے:

''بعد بندگی معروض ہے۔ حضرت سیّد احمد حسن خاں صاحب مدظلہ العالی کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ کے گھر مولود مسعود پیدا ہوا۔ ایک عبارت رنگین مرتّب کر کے 'اکمل الاخبار' میں، میں نے چھپوا دی ہے۔ اور ایک رباعی اور ایک قطعہ اپنا اور ایک قطعہ سیّد صاحب ممدوح کا جو انھوں نے یہاں بھیجا تھا وہ بھی چھپوا دیا۔ اور تین قطعے تاریخی بہاری لال مشتاقؔ اور میر فخرالدین مہتمم مطبع نے جو یہاں تاریخیں لکھی تھیں، وہ چھپوا دیے۔ چنانچہ اپنی لکھی ہوئی رباعی اور قطعہ عرض کرتا ہوں۔ رباعی:

حق داد بہ رسید ز پے انعامش   فرخ پسرے، کہ واجب است اکرامش
تاریخ ولاتش بود، بے کم و بیش   'ارشاد حسین خاں' کہ باشد نامش

قطعہ:

غالب حال سنین ہجری معلوم کن از خجستہ فرزند
چوں یک صد و بست و چار ماند ایں است شمار عمر دلبند

یہ تو ظاہر ہے کہ ۱۲۸۵ھ ہے۔ جب 'خجستہ فرزند' کے اعداد میں سے ۱۲۵۰ لے لیے تو ایک سو چوبیس بچتے ہیں۔ ان کو میں نے دعائے عمر نومولود قرار دیا۔ حق تعالیٰ اس مولود کو تمہارے سامنے عمر طبعی کو پہنچائے''۔

(خط نمبر ۵، مکتوبہ جولائی اگست ۱۸۶۸ء)

یہ قطعہ و رباعی وفاؔ کے فرزند اکبر میر احتشام علی خاں جادوؔ (پیدائش ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ/ ۱۶ اگست ۱۸۶۸ء وفات: ۲۸ مئی ۱۹۰۷ء) سے متعلق ہے۔ یہ عبارت رنگیں اور قطعہ و رباعی 'اکمل الاخبار' (دہلی) ۲ ستمبر ۱۸۶۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ غالبؔ کی متذکرہ عبارت ان کے نثری مجموعوں میں شامل نہ ہوسکی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ یہ عبارت اخبار میں مہتمم اخبار کی طرف سے شامل کی گئی تھی۔ عبارت حسبِ ذیل ہے:

''بفضل الٰہی ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۸۵ھ کو روز یکشنبہ گھنٹہ بھر دن رہے جناب معلی القاب نواب میر ابراہیم علی خاں بہادر رئیس اعظم سورت کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ گویا نواب صاحب چاند تھے اور یہ چاند کے پاس ایک روشن ستارہ چمکا۔ حق تعالیٰ اس ماہِ رخشندہ و اختر تابندہ کو اوج عزت و اقبال پر تا آفتاب قیامت پُر نور و ضیا گستر رکھے۔ جناب مستطاب نجم الدولہ نواب اسد اللہ خاں غالب بہادر مدظلہم نے ایک رباعی اور ایک قطعہ تہنیت نئی طرز کا کہ دیکھنے والے بشرط دید و فہمید اس کا لطف اٹھائیں گے، ارشاد فرمایا ہے۔ ہم بہ (غرض) افزائش رونق

اخبار رباعی وقطعہ لکھتے ہیں..."

(تحقیقی نوادر، اکبر حیدری، لکھنؤ ۱۹۷۴ء، ص: ۵۳۸، ۵۳۹، بحوالہ غالب - احوال و آثار، ص: ۱۸۸)

یہ عبارت جو غالبؔ کے اپنے قول کے مطابق خود ان کی طبع زاد ہے، غالبؔ کی نثری تحریروں میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ مالک رام بھی اس تحریر کے نظر انداز کیے جانے پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

"کسی نے یہ عبارت مرزا کے نثری مجموعوں میں شامل نہیں کی، خدا معلوم کیوں؟" (تلامذۂ غالب، ص: ۵۴۷)

وفاؔ کے نام خط نمبر ۵ (متعلق ولادت پر احتشام علی خاں) جس کا مکمل متن گذشتہ سطور میں نقل ہوا، اس خط پر تاریخ تحریر نہیں تھی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے احمد حسن فداؔ کے نام غالبؔ کے خط مکتوبہ ۱۷ر جولائی ۱۸۶۸ء کی بنیاد پر (جس میں غالبؔ نے وفاؔ کے یہاں متوقع نئے مولود کی پیدائش کی اطلاع پانے پر تاریخی قطعہ کہہ کر بھیجنے کا ذکر کیا تھا) اس خط کی تاریخ تحریر جولائی اگست ۱۸۶۸ء طے کی (غالب کے خطوط، ج ر ۳، ص: ۱۰۱۶)۔ غالبؔ کے زیرِ بحث خط میں 'اکمل الاخبار' میں عبارت وقطعہ و رباعی کے بارے میں لکھا ہے، "وہ چھپوا دیے"۔ گویا خط 'اکمل الاخبار' میں متعلقہ عبارت و اشعار کی اشاعت ۲ر ستمبر ۱۸۶۸ء کے بعد لکھا گیا۔ لہٰذا اس خط کی تاریخ تحریر اوائل ستمبر ۱۸۶۸ء طے کی جانی چاہیے جو زیادہ قرینِ صحت ہوگی۔

حکیم سیّد احمد حسن مودودی، میر عالم علی خاں اور میر ابراہیم علی خاں کے ہم وطن، ہم خاندان، ہم ذوق اور خواجہ تاش ہونے کے سبب غالب کبھی کبھی دو افراد کو مخاطب کر کے خط لکھتے تھے، مثلاً:

"بہ خدمت قبلہ سیّد احمد حسن صاحب مودودی تسلیم و بہ جناب میر ابراہیم علی خاں بہادر کورنش مقبول باد"۔

(خط نمبر ۲، مکتوبہ ۱۷را اگست ۱۸۶۶ء)

اور کبھی ایک کو تاکید کرتے ہیں:

"آپ میر صاحب قبلہ کو خط پڑھوا دیجیے گا"۔

(خط نمبر ۳، مکتوبہ ۲/۱ اکتوبر ۱۸۶۶ء)

۷

نواب محمد زکریاں خاں زکیؔ

ان کے نام صرف ایک خط مکتوبہ ۲۹/جنوری ۱۸۶۸ء ملتا ہے۔ یہ خط اولاً نقوش (لاہور) مکاتیب نمبر (۱۹۵۷ء) میں شامل ہوا۔ بعد ازاں "غالب کی نادر تحریریں" (ص: ۸۶، ۸۷) کتاب میں شامل ہوا۔ 'غالب کے خطوط' (ج/۲، ص: ۷۹۹) میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس خط میں زکیؔ کو "بندہ پرور" کے القاب سے مخاطب کرتے ہوئے زکیؔ کے علم و فضل اور کلام کی داد دی گئی ہے۔ متعلقہ اقتباس زکی کے ترجمے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

۸

قطب الدولہ

ان کے نام دو فارسی خط ملتے ہیں۔ ایک خط ۲۴/مئی ۱۸۴۹ء اور دوسرا ۶/۱ اکتوبر ۱۸۴۹ء کا مکتوبہ ہے۔ یہ دونوں خط 'باغِ دو در' میں شامل ہیں (ص: ۱۱۰ تا ۱۱۴)۔ ان خطوط میں نواب واجد علی شاہ والیِ اودھ (ف ۱۸۸۷ء) کے حضور غالب کا قصیدہ پیش کرنے اور بادشاہ کی جانب سے صلہ حاصل کرنے کی استدعا کی گئی ہے۔ (قطب شاہ نامی کسی شخص کے نام خط میں غالبؔ نے اس صلے کی رقم -/5000 روپے بھی طے کردی ہے)

پہلے خط میں مرزا نے اولاً اپنے شاگرد میر احمد حسین میکش دہلوی (ف ۱۸۵۷ء) کو والی اودھ کے یہاں ملازمت دلوانے کی پُرزور سفارش کی ہے اور خود کو نصیر الدین حیدر (ف ۱۸۳۷ء) کے زمانے سے شاہانِ اودھ کا مدح خواں لکھتے ہوئے احمد حسین

میکش کے توسط سے قصیدہ بھیجنے اور اس کو شاہ کے حضور پیش کرنے کی گزارش کی گئی ہے۔

دوسرا خط کلیتاً قصیدے سے متعلق ہے جس میں شاہ کے حضور قصیدہ پیش کرنے کی یاددہانی کرائی گئی ہے۔ مرزا لکھتے ہیں:

> ''بعد گزارش مدعا یہ ہے کہ ایک طویل مدت گزری۔ قصیدہ اور ایک عرضداشت آپ کی خدمت میں بھیج کر بہ ہزار آرزو درخواست کی تھی کہ یہ نظم اور نثر حضرت قدر قدرت ظل الٰہی خلداللہ ملکہٗ وسلطانہٗ کی نظر ربوبیت اثر کے سامنے پیش کردیں۔ حقیقت ہے کہ قصد یہ تھا کہ عطیہ شاہی حاصل کرکے عتبات عالیات کا رخ کروں۔ راقم کی ناسازی طالع پروا ہے ہو کہ ابھی تک اس بہار کی جھلک نظر نہیں آسکی ہے۔ شاہنشاہ کا دستِ کرم ابرِ رحمت ہے جو خار و گل پر یکساں برستا ہے۔ جہاں بے مانگے لعل و گہر کی کانیں کی کانیں بخشتے ہوں سوال کے بعد سائل کی محرومی کیسے ممکن ہے؟
>
> ... خدارا اس گوشہ نشیں اندوہ گیں پر رحم فرمائیں اور قصیدہ اور عرضداشت بادشاہ کے حضور میں پیش کردیں اور جس عطیے کا حکم ہو اس طرح کہ تاخیر نہ ہو اس گدائے امیدوار کو ارسال فرمائیں۔ اس سے زیادہ دعائے دوام دولت حضرت ظل سبحانی کے سوا جو ہر دم وردِ زبان ہے کیا عرض کروں۔ نامہ نگار ہوا خواہ۔ اسداللہ۔ ۶/اکتوبر ۱۸۴۹ء''۔
>
> (باغِ دودر، ص:۱۱۱)

ان خطوط کے طرزِ تخاطب اور اسلوب سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قطب الدولہ کے نام مرزا کے اور بھی خط ہوں گے جو محفوظ نہ رہ سکے۔ اور یہ کہ قطب الدولہ سے غالبؔ کا تعلق رسمی نہیں۔ اس تعلق میں اعتماد کی جھلک صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔

قطب الدولہ کا مکمل نام محمد قطب علی خاں تھا۔ یہ سہسوان ضلع بدایوں کے رہنے والے تھے۔ ان کے ایک ساتھی مصاحب الدولہ کا وطن بھی سہسوان تھا (موسیقی کا رامپور،

سہسوان گھرانہ، رضا جرنل، ش ۴-۵، ۱۹۹۹ء، ص:۲۰۷) نسباً غالباً آفریدی پٹھان تھے۔ موسیقی کے فن کے ماہر تھے۔ خصوصاً ستار بجانے میں ان کا نام دور دور تک مشہور تھا۔ قطب الدولہ عربی، فارسی اور شاعری میں بھی اچھی استعداد رکھتے تھے۔ واجد علی شاہ نے اپنی منظوم قلمی داستان 'عشق نامہ' میں موسیقی (ستار) میں اُن سے تلمذ کا اعتراف کیا ہے۔

(واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات، ص:۵۶)

اپنے فن میں کامل ہونے، والیِ اودھ کا استاد ہونے اور اربابِ نشاط کا ایک بڑا طائفہ اپنے ساتھ رکھنے کے سبب یہ واجد علی شاہ کے بہت قریب ہوگئے۔ تخت نشیں ہونے کے بعد شاہ نے انھیں ''قطب الدولہ، مفتاح الملک، مصاحب خاص محمد قطب علی خاں بہادر صمصام جنگ'' کا خطاب عطا کیا تھا۔ (حوالۂ سابق، ص:۴۷)

قطب الدولہ درباری معاملات میں بھی دخیل رہے۔ ۵/اگست ۱۸۴۸ء کو نواب واجد علی شاہ کے وزیر امین الدولہ کی جگہ نواب علی نقی خاں کا تقرر بحیثیت وزیر کرانے میں ان کا نام بھی آتا ہے۔ (حوالہ سابق، ص:۶۲) اُن کی پیدائش و وفات اور سوانحی کوائف نہیں ملتے۔ البتہ موسیقی کے فن پر مبنی اردو و ہندی کتب کے مطالعے سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ تان سین گھرانے کے عروج کے دوران ہی موسیقی کی دنیا میں انھوں نے ''سہسوان گھرانے'' کی بنیاد رکھی۔

قطب الدولہ نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ لکھنؤ میں بسر کیا۔ جولائی ۱۸۴۹ء میں انھیں اور ان کے ساتھیوں کو بعض نازیبا حرکتوں کے سبب شہر بدر کردیا گیا تھا (حوالہ سابق، ص:۶۴)۔ کچھ مدت کانپور میں گزار کر رامپور آگئے تھے۔ واجد علی شاہ کے کلکتہ جانے کے بعد غالباً لکھنؤ بھی پہنچے تھے۔ بعد کی تفصیلات نہیں ملتیں۔

قطب الدولہ کے شاگرد اور داماد محبوب حسین خاں نے ان کے وطن سہسوان ہی میں دھرپد بین، خیال گائیکی اور ستار بجانے کو فروغ دیا۔ محبوب حسین خاں کے بیٹے عنایت حسین خاں نے ریاست رامپور سے وابستہ ہوکر بڑا نام کمایا اور سہسوان کے موسیقی گھرانے کو استحکام بخشا۔

مکاتیبِ غالبؔ میں افرادِ بدایوں کے اَسما

خطوطِ غالب میں بدایوں کے جن افراد کے نام آئے ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اساس الدین (مولوی): ان کا ذکر قاضی عبدالجمیل جنونؔ بریلوی (ف ۱۹۰۰ء) کے نام خط (نمبر ۱۰، مکتوبہ بدونِ تاریخ) میں آیا ہے۔ مولوی اساس الدین (۱۷۹۰-۱۸۸۲ء) تلمیذ غالبؔ، عزیز الدین صادقؔ کے والد تھے۔ عالم و فاضل شخص تھے۔ ۱۸۵۷ء میں بدایوں آگئے تھے۔ عزیزؔ کے خاندان سے غالبؔ کا براہِ راست تعلق معلوم ہوتا ہے۔ غالبؔ نے ۱۸۵۷ء میں دہلی سے مراجعت کے وقت رقعہ سفارشی لکھ کر ان کی مدد بھی کی تھی۔ (دیکھیے بابِ دوم) غالبؔ کے خط بنام عزیزالدین میں جنونؔ بریلوی کا ذکر آیا ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عزیزؔ اور جنونؔ کے درمیان بھی تعلق استوار تھا۔ اس لیے قریب بہ یقین ہے کہ جنونؔ کے خط میں جن مولوی اساس الدین کو غالبؔ نے سلام نیاز بھیجا ہے وہ عزیزؔ کے والد ہی ہیں۔

سیّد فرخ جلالی (علی گڑھ) نے اپنے ایک مضمون 'غالب کے ایک دوست اساس

الدین دہلوی' (مطبوعہ 'ہماری زبان' دہلی، ۷؍جولائی ۲۰۰۵ء) میں تین انکشافات کیے ہیں: (۱) اساس الدین بدایونی غالبؔ کے دوست تھے (۲) غالبؔ نے فارسی دیوان کے انتخاب میں ان کو شامل کیا تھا (۳) غالبؔ کے شاگرد اپنے خط مولوی صاحب کی معرفت بھیجتے تھے---- سیّد صاحب نے مذکورہ انکشافات کے حوالے درج نہیں کیے اور میں بھی اول الذکر دو اطلاعات کے حوالے تلاش کرنے سے قاصر رہا۔ البتہ موخرالذکر انکشاف درست ہے۔ غالبؔ کے ایک خط مکتوبہ جون ۱۸۵۸ء کے پتے سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ غالبؔ یا غالبؔ کے شاگرد خطوط کی ترسیل میں مولوی اساس الدین کو ذریعہ بناتے تھے۔ (غالب کی نادر تحریریں، ص: ۱۴۳)

۲- **جعفر علی خاں سہسوانی، نواب میر (ف ۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۳ء)**: ان کا ذکر نواب غلام بابا خاں (ف ۱۸۹۳ء) کے خط (نمبر ۱، مکتوبہ ۶؍ستمبر ۱۸۶۳ء) میں آیا ہے۔ میر جعفر علی خاں کی چھوٹی بیٹی غلام بابا خاں کو منسوب تھی۔ (سخنورانِ گجرات، ص: ۲۷۳) غالبؔ کا یہ خط دراصل ان کے خسر نواب میر جعفر علی خاں کی وفات پر اظہارِ ماتم ہے۔ ان کی وفات پر غالبؔ نے ایک قطعہ بھی ارسال کیا تھا جو حسبِ ذیل ہے:

گردید نہاں، مہر جہاں تاب، دریغ　　شد تیرہ جہاں بچشمِ احباب، دریغ
ایں واقعہ را ز 'روئے زاری' غالبؔ　　تاریخ رقم کرد کہ نواب، دریغ

از 'روئے زاری' زائے ہوز کے عدد بڑھائے جائیں تو ۱۲۸۰ھ پیدا ہوتے ہیں۔

(غالب کے خطوط، ج ؍۳، ص: ۱۰۰۶)

میر جعفر علی خاں کا تعلق سادات سہسوان کی اس نسل سے تھا جس نے بڑودہ منتقل ہو کر وہاں اعلیٰ عہدے اور مناصب حاصل کیے۔ ان کے والد کا نام میر سرفراز علی خاں تھا اور ان کے بھتیجے میر ابراہیم علی خاں وفاؔ بھی غالبؔ کے چہیتے شاگرد تھے۔

حکیم سیّد احمد حسن مودودی فدا جمالی کے نام خط نمبر ۴ (مکتوبہ ۱۷/جنوری ۱۸۶۶ء) میں بھی جعفر علی خاں کا ذکر ملتا ہے۔

۳- **حمید الدین، محمد:** یہ حکیم غلام نجف خاں کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ 'پنج آہنگ' میں جو فارسی مکتوب غلام نجف خاں کے نام ہے اس میں غالبؔ نے ان کو سلام لکھا ہے (پنج آہنگ میں مکاتیبِ غالب، ص:۱۸۸)۔ ایک مدت تک یہ خط حکیم غلام نجف خاں کے ہم نام مولوی نجف علی خاں جھجری (ف ۱۸۸۱ء) کی طرف منسوب رہا۔ لیکن مذکورہ داخلی شہادت کی بنیاد پر اسے غلام نجف خاں کے نام ہی تسلیم کرلیا گیا۔ دراصل خط میں تخاطب میاں محمد نجف صاحب کے نام سے ہوا ہے۔ حکیم صاحب کے نام میں محمد کا سابقہ نہیں۔ اسے غالبؔ کا سہو حافظ خیال کیا گیا (مآثر غالب، ص:۸۰) غالبؔ نے کسی حمید الدین نامی فرد کی وفات پر فارسی میں ایک قطعہ تاریخ کہا تھا، لیکن بقول پروفیسر نثار احمد فاروقی "کلیاتِ نظم سے اس کا اخراج ظاہراً مادۂ تاریخ کے بھونڈے پن کی وجہ سے ہوا"۔ فاروقی صاحب نے انجمن محمدیہ آگرہ کے کتب خانے میں مجموعہ مثنویات کی ایک جلد میں "کلیاتِ نظمِ غالب" کے کچھ اوراق دیکھے، انہی میں یہ قطعہ بھی تھا۔ قطعہ حسبِ ذیل ہے:

رفت چوں مولوی حمید الدین   زیں جہاں کز فنا عبارت اوست
از خود از دہر رفت و دہر ہنوز   پُرز آوازۂ فضیلتِ اوست
سیّد الانبیا شفیع اش باد   کاں سعید ازل ز عترت اوست
دخل را چوں فزوں کنی بر خلد   سالِ فوتش ہمیں حقیقت اوست

۶۳۴ +   ۶۳۴ + = ۱۲۶۸ھ

داخل خلد گشت پنداری   دخل در خلد سالِ رحلتِ اوست

۶۳۴ + ۶۳۴ = ۱۲۶۸ھ

رمز دریاب تا غلط نہ کنی زاں کہ تکرار خلد صورت اوست
خلدِ، خلدِ است بر لبِ غالبؔ فکر ہر کس بہ قدرِ ہمتِ اوست
۶۳۴+ ۶۳۴ = ۱۲۶۸ھ

('تلاشِ غالب'، ص: ۶۴، ۶۵)

پروفیسر نثار احمد فاروقی نے حمید الدین کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ لیکن ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے 'تلاشِ غالب' کے حوالے سے منقولہ صدر قطعے کو اپنے مضمون 'غالب اور روہیل کھنڈ' میں درج کرتے ہوئے اسے حکیم غلام نجف خاں کے بھائی حمید الدین کا 'قطعۂ تاریخِ وفات' قرار دیا ہے۔ (غالب اور عصرِ غالب، ص: ۱۸۵، ۱۸۶) بہ ظاہر یہ قطعہ تاریخ مولوی حمید الدین کی وفات ہی سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کی کوئی خارجی یا داخلی شہادت نہیں ملتی۔ اس قطعے کے تیسرے شعر میں مولوی حمید الدین کو سیّد الانبیا کی عترت (اولاد) کہا گیا ہے۔ لفظ عترت غلطی سے 'تلاشِ غالب' میں عشرت (ص: ۶۴) اور 'غالب اور عصرِ غالب' میں عزت (ص: ۱۸۵) چھپا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی بھی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اس داخلی اور بڑی حد تک واضح شہادت کے بعد اس قطعہ تاریخ کو حکیم غلام نجف خاں کے بھائی مولوی حمید الدین سے متعلق کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ مولوی حمید الدین نسلاً فاروقی تھے۔ اس خاندان کا غالبؔ سے جو خصوصی تعلق تھا اس کی بنیاد پر یہ یقین کرنے میں تامّل ہے کہ غالبؔ حکیم صاحب اور ان کے بھائی حمید الدین کو خاندانِ سادات کا فرد سمجھتے ہوں۔ لہٰذا یہ قطعہ تاریخ کسی دوسرے مولوی سیّد حمید الدین کی وفات سے متعلق ہے۔

۴- **فصیح الدین بدایونی، قاضی:** ان کا ذکر غالبؔ کے دو فارسی خطوط میں آیا ہے۔ پہلے خط بنام میر تفضّل حسین خاں خیرآبادی (ٹونک والے) میں غالبؔ، قاضی صاحب کے نام سے پہلے مکرمی اور آخر میں بداؤنی لکھتے ہیں۔ خط کی

درمیانی سطور میں ان کو فرخندہ آئین بھی لکھا ہے۔ اس سے دو باتیں پتا چلتی ہیں ایک یہ کہ قاضی صاحب علم و فضل، عہدہ و منصب اور شرافت و نسب کے لحاظ سے برتر تھے، دوسری یہ کہ عہدِ غالبؔ میں بھی بدایوں کو بداؤں لکھا جاتا تھا۔ خط کا متعلقہ متن حسبِ ذیل ہے:

''اینک ہفتۂ بیش نگذشتہ باشد کہ مکرمی قاضی فصیح الدین بداؤنی را از آگرہ بہ دہلی گذار افتاد۔ چوں شمارا دیدہ بود، وہم از آن انجمن می آمد ورودِ شما از ٹونک بہ متھرا او از متھرا بہ اکبرآباد بمن باز گفت۔ ایں فرخندہ آئیں را نیز چون خود ثنا خوان و در ستایش شما با خویش ہم زبان یافتم''۔ (باغِ دودر، ص:۱۴۵)

ترجمہ: ایک ہفتے سے زیادہ نہیں گذرا مکرمی قاضی فصیح الدین بداؤنی کا آگرے سے دہلی آنا ہوا آپ سے مل کر آئے تھے۔ ان سے آپ کے ٹونک سے متھرا اور متھرا سے اکبرآباد آنے کی اطلاع ملی۔ انھیں بھی اپنی طرح آپ کی تعریف میں رطب اللسان اور آپ کی مدح وثنا میں اپنا ہم زبان پایا۔ (باغِ دودر، ص:۵۱)

بدایوں میں آباد خاندانوں میں سے اکثر ممتاز خاندانوں کی تاریخیں اور شجرے مطبوعہ موجود ہیں۔ ان کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ عہدِ غالب میں بھی قضات کا عہدہ بدایوں کے کئی خاندانوں میں برقرار تھا۔ مگر عہد غالب میں فصیح الدین نامی بزرگ کا نام شیوخ صدیقی کی شاخ حمیدی ہی میں نظر آیا۔ کسی دوسرے خاندان میں نہیں۔ لہٰذا گمان بدرجۂ یقین ہے کہ غالبؔ کے خط میں جن فصیح الدین کا ذکر آیا ہے وہ یہی ہیں۔ حمیدی خاندان کے شجرے میں قاضی فصیح الدین بن اصلح الدین کی بابت ایک جملے میں صرف یہ اطلاع دی گئی ہے:

''بوجہ عہدہ قضا منصف اوجھیانی (ضلع بدایوں) ہوئے''۔

(تاریخ بنی حمید، انشاء اللہ، ص:۱۴)

قاضی فصیح الدین کی بابت مزید معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔

دوسرے خط بنام مفتی سیّد احمد خاں سیّد بریلوی (ف ۱۸۵۹ء) مکتوبہ ۳/ اکتوبر ۱۸۵۰ء میں غالبؔ، عبدالمجید خاں نامی کسی فرد کے سلام و پیام تحریر نہ کیے جانے کا ذکر کرتے ہوئے قاضی فصیح الدین کی موت کا ماتم کرتے ہیں۔ قاضی فصیح الدین سے اپنے تعلق کی صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اللہ کی قسم! قاضی فصیح الدین میرا یار تھا، عزیز دوست تھا، محبت کرنے والا تھا۔ ہے ہے کہاں چلا گیا اور اس کو کیا ہوگیا۔ ابھی اس کے مرنے کے دن نہیں تھے''۔

قاضی فصیح الدین کے بار بار وطن جانے اور عزیز و اقارب سے ملنے کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ اس خط سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

- قاضی فصیح الدین اور عبدالمجید خاں سے غالبؔ کا گہرا اور پائیدار تعلق تھا۔ لیکن معلوم نہیں کہ عبدالمجید خاں کون تھے؟ ممکن ہے قاضی فصیح الدین سے قرابتِ قریبہ رکھتے ہوں۔
- ۳/ اکتوبر ۱۸۵۰ء کو قاضی فصیح الدین حیات نہیں تھے۔ اُن کی وفات ۳/ اکتوبر سے پیشتر کسی قریبی وقت میں ہوئی تھی۔
- قاضی صاحب دہلی میں کیوں تھے؟ بدایوں بار بار کیوں جاتے تھے؟ شاید ملازمت کی وجہ سے بدایوں آتے ہوں۔ لیکن دہلی میں کیا کرتے تھے، یہ سوالات ہنوز لاینحل ہیں۔

مذکورہ خط غالبؔ کے کسی مجموعۂ خطوط میں شامل نہیں ہے۔ ذوقؔ کے شاگرد مولوی دلدار علی مذاقؔ بدایونی کے ذخیرے سے ''ملفوظات طیبات مذاق میاں'' میں نقل ہوا۔ وہاں سے 'آئینہ دلدار' میں شامل ہوا۔ خط کا متعلقہ متن حسبِ ذیل ہے:

> ''عجب کہ اندریں نامہ از جانب والا تبار عبدالمجید خاں سلامے و پیامے مرقوم نبود۔ خود ندانستم کہ مخدوم من کجاست، و روز گارش چوں

می گزرد۔ از مرگِ مینونشیں قاضی فصیح الدین بر دلش چہ گذشتہ باشد۔
باللہ قاضی فصیح الدین یارے بود عزیز، و دوستے بود مہر پیشہ، ہے ہے کجا
رفت و چہ شد؟ ہنوز ہنگام مردنش نبود، مخدوم مرحوم خوے آں داشت کہ
در وطن نیا سودے و ہمیشہ رہ پیمودے۔ یاد دارم کہ بار ہا بوے گفتہ ام
کہ از بادیہ نوردی باز آے و چوں گوشہ و توشہ داری در وطن بیاسائے۔
گفتہ، مرا خوار درشتے بلکہ خواستے کہ مرا از جاے برانگیزد و آئین
آوارگی آموزد و دریں بار کہ ہمانا دیدار باز پسینش بود، بمن می فرمود کہ
اے خاکِ زمیں گیر برخیز و بسوے حیدر آباد خرام۔ من باتو ہمرہم۔
ببیں تا چہ می کنم و گوہر کمالِ ترا بکدام بہا می فروشم۔ بیا تا برگ و ساز ہا
فراہم آوریم و زر ہا اندوزیم۔ ہیہات، ہیہات۔

عرفی چہ نشستہ ای کہ یاراں رفتند

داستانِ ایں اندوہ بہ دفتر کراں نپذیرد۔ تا دریں یک ورق چہ
قدر تواند گنجید۔ خدایش بیامرزاد و بہ فردوسِ بریں جا دہاد''۔

(آئینہ دلدار، ص: ۹۳)

۵- **فضل رسول، مولوی شاہ محمد** (ف ۱۸۷۲ء): ان کا ذکر حکیم غلام نجف خاں
کے نام خط نمبر ۱۳ (مکتوبہ ۱۱ر جنوری ۱۸۶۳ء) میں آیا ہے۔ غالبؔ کے
معاصرین کے تحت ان کا ذکر بابِ اول میں گزر چکا ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی
نے مذکورہ خط میں فضل رسول سے مراد منشی فضل رسول واسطی (ف ۱۸۷۹ء) لیے
ہیں جو غلام امام شہید کے بھانجے تھے اور مظفر علی اسیر لکھنوی کے شاگرد۔ (تلاشِ
غالب، ص: ۵۷) لیکن ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے بوستانِ اودھ (ص: ۱۹۷، راجا
درگا پرشاد، مطبع احمدی لکھنؤ، ۱۸۸۶ء) کے حوالے سے واسطی کے حیدر آباد جانے
کی نفی کی ہے۔ (غالب اور عصرِ غالب، ص: ۱۸۷) جب کہ 'اکمل التاریخ'
(ج ر ۲، ص: ۵۲) اور 'قاموس المشاہیر' (ج ر ۲، ص: ۱۱۵) سے مولوی فضل رسول

بدایونی کا حیدر آباد جانا ثابت ہوتا ہے۔ لٰہذا زیر گفتگو خط میں فضل رسول سے مراد یہی بدایونی عالم شاہ محمد فضل رسول مستؔ ہیں۔

۶- کشفیؔ، مولانا شاہ سلامت اللہ (ف ۱۸۶۴ء): ان کا ذکر قدر بلگرامی کے نام خط نمبر ۵ (مکتوبہ ۱۸۶۱ء) میں ملتا ہے۔ ان کا ذکر بھی معاصرینِ غالب کے تحت بابِ اوّل میں کیا جاچکا ہے۔

۷- مذاقؔ، شاہ دلدار علی (ف ۱۸۹۴ء): تلمیذ ذوق دہلوی۔ ان کا ذکر ایک فارسی خط بنام مفتی سیّد احمد خاں سیّد (ف ۱۸۵۹ء) میں ملتا ہے۔ سیّدؔ، غالبؔ کے شاگرد تھے۔ انھوں نے جب مرزا سے تلمذ اختیار کرنا چاہا (۱۸۵۰ء) تب مرزا نے انھیں مذاقؔ بدایونی سے رجوع کرنے کے لیے کہا۔ یہ خط (مکتوبہ ۱۳/اکتوبر ۱۸۵۰ء) پہلے ''ملفوظات، طیبات مذاق میاں'' (اخیار علی بدایونی، بدایوں، سنہ ندارد) میں شامل ہوا۔ اسی رسالے سے یہ خط آئینہ دلدار (ص:۹۱ تا ۹۳) میں نقل ہوا ہے۔ یہ خط غالبؔ کی فارسی تحریروں کے مجموعوں میں ہنوز شامل نہیں ہوسکا ہے۔ مذاقؔ کا ذکر بھی گذشتہ اوراق میں ''غالب کے مداحین'' کے تحت گزر چکا ہے۔

۸- نجم الدین حیدر، شیخ: غلام نجف خاں کے چار بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ سب سے بڑے بھائی فیاض الدین تھے۔ نجم الدین حیدر تیسرے نمبر کے یعنی نجف خاں سے چھوٹے تھے۔ یہ آگرہ میں بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ شیر زماں خاں نے آگرے سے جب غالبؔ کو خط لکھا تو اس میں ایک رقعہ شیخ نجم الدین حیدر کا بہ نام ظہیرالدین رکھ دیا۔ چوں کہ ان دنوں (دسمبر ۱۸۵۷ء) حکیم صاحب کا خاندان بدایوں کے لیے روانہ ہو چکا تھا لٰہذا غالبؔ نے اس خط کو اپنے خط کے ساتھ (محررہ ۲ر دسمبر ۱۸۵۷ء) ملفوف کر کے حکیم صاحب کو بدایوں کے پتے پر روانہ کر دیا اور اس کا جواب منگانے اور اس جواب کو اپنے خط کے ہمراہ آگرہ بھیجنے

کی پیش کش بھی کی۔ دوسرے خط بنام نجف خاں (محررہ ۲۶ر دسمبر ۱۸۵۷ء) میں بھی نجم الدین حیدر کا نام آ گیا ہے۔

شیخ نجم الدین حیدر نے ظہیر الدین کو ان کی کم سنی میں ایک کھلونا بھیجا۔ غالبؔ نے ظہیر الدین کی جانب سے شکریہ اور رسید کا خط لکھا۔ 'عودِ ہندی' اول و دوم میں یہ خط بہ عنوان ''ظہیر الدین کی طرف سے ان کے چچا کے نام'' شامل ہوا ہے۔
(رک، غالبؔ کے خطوط، ج ۳، ص ۱۰۴۰)

۹- **غلام نجف خاں، حکیم:** یہ غالبؔ کے مکتوب الیہ ہیں۔ ان کا ذکر گذشتہ اوراق میں صراحت سے گزر چکا۔ غالبؔ کے بعض دوسرے مکتوب الیہ کے نام خطوط میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے:

مرزا شہاب الدین احمد ثاقب (ف ۱۸۶۹ء) خط نمبر ۲، مکتوبہ مارچ ۱۸۵۸ء
نواب مرزا علاء الدین احمد خاں علائی (ف ۱۸۸۶ء) خط نمبر ۱۶ مکتوبہ ۱۵ر فروری ۱۸۶۲ء
عزیز الدین، عزیز و صادق (ف ۱۸۹۴ء) خط نمبر ۱، مکتوبہ دسمبر ۱۸۵۸ء

۱۰- **مائل، میر عالم علی خاں** (تلمیذ غالب): ان کا ذکر حکیم سیّد احمد حسن مودودی فداو جمالی (ف ۱۸۹۴ء) کے نام خط نمبر ۴ (۱۷ر جنوری) خط نمبر ۶ (۲ر جون)، خط نمبر ۷ (یکم ستمبر)، خط نمبر ۸ (۲۵ر دسمبر ۱۸۶۶ء)، خط نمبر ۹ (۱۸ر اکتوبر ۱۸۶۶ء) میر ابراہیم علی خاں وفاؔ کے نام خط نمبر ۱ (۲۱ر جولائی)، خط نمبر ۳ (۲ر اکتوبر)، خط نمبر ۴ (۵ر دسمبر ۱۸۶۶ء) اور میر غلام بابا خاں بہادر کے نام خط نمبر ۴ (۲۲ر مارچ ۱۸۶۶ء) میں آیا ہے۔ میر ابراہیم علی خاں کے نام خط نمبر ۳ میں مائل کا خط وصول پانے کی اطلاع دی گئی ہے۔ اس بیان سے مائل سے غالب کی خط و کتابت ثابت ہو جاتی ہے، مگر مائل کے نام غالبؔ کا ایک بھی خط دستیاب نہیں۔

۱۱- **ظہیر الدین احمد حکیم:** ان کا ذکر حکیم غلام نجف خاں کے نام خطوط میں ملتا

ہے۔ ایسے تمام خطوط کے اقتباسات گذشتہ اوراق میں ان کے حالات کے ضمن میں درج کیے جا چکے ہیں۔

۱۲۔ **میر ابراہیم علی خاں وفا:** یہ غالبؔ کے شاگرد اور مکتوب الیہ ہیں۔ حکیم سیّد احمد حسن فدا کے نام خط نمبر ۴ (۱۷ر جنوری)، خط نمبر ۶ (۲ر جون)، خط نمبر ۷ (یکم ستمبر)، خط نمبر ۸ (۲۵ر دسمبر ۱۸۶۶ء)، خط نمبر ۱۱ (۱۷ر جولائی ۱۸۶۶ء) میں اور نواب میر غلام بابا خاں کے نام خط نمبر ۴ (۲۲ر مارچ ۱۸۶۶ء) میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

۱۳۔ **حکیم سیّد احمد حسن فدا:** یہ بھی غالبؔ کے شاگرد اور مکتوب الیہ ہیں۔ ان کا ذکر میر ابراہیم علی خاں کے نام خط نمبر ۲ (۱۷ر اگست)، خط نمبر ۴ (۵ر دسمبر ۱۸۶۶ء)، خط نمبر ۵ (جولائی، اگست ۱۸۶۶ء) میں اور نواب میر غلام بابا خاں کے نام خط نمبر ۴ (۲۲ر مارچ ۱۸۶۶ء) میں ملتا ہے۔

۱۴۔ **قطب الدولہ، محمد قطب علی خاں:** یہ غالبؔ کے مکتوب الیہ ہیں۔ واجد علی شاہ کے استاد اور مصاحبِ خاص تھے۔ ان کا ذکر میر احمد حسین میکش اور قطب شاہ کے نام فارسی خطوط میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ نواب محمد علی خاں بہادر عرف میرزا حیدر کے نام ایک خط میں بھی ان کا نام آ گیا ہے۔ یہ خط پنج آہنگ میں شامل ہے۔

بابِ چہارم

نظامی بدایونی اور غالب

نظام الدین حسین نظامی بدایونی

(ماخذ: تجلیاتِ سخن، نظامی بدایونی، بدایوں ۱۹۳۰ء)

دیوانِ غالب نسخۂ بدایوں

دیوانِ غالب (اردو) کا یہ خطی نسخہ نظامی بدایونی (ف ۱۹۴۷ء) کے بیٹے احیدالدین نظامی (۱۸۹۳-۱۹۷۹ء) کو کہیں سے دستیاب ہوا جسے 'نسخۂ بدایوں' کا نام دیا گیا۔ احیدالدین نظامی کے امتیاز علی خاں عرشی (ف ۱۹۸۱ء) سے مخلصانہ روابط تھے۔ چنانچہ احیدالدین نے یہ نسخہ عرشی صاحب کو سونپ دیا اور ان سے اس پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی۔ عرشی صاحب نے اس پر پہلا مضمون بعنوان "دیوانِ غالب (اردو) کا ایک اور نادر مخطوطہ" نقوش، لاہور (جون ۱۹۶۰ء) میں لکھا۔ یہی مضمون ہفتہ وار 'ذوالقرنین' بدایوں (۲۱ر جولائی ۱۹۶۰ء) میں بھی شائع ہوا۔ بارِ دگر "دیوانِ غالب نسخہ بدایوں ایک نادر مخطوطہ" عنوان سے 'نیا دور' لکھنؤ (جنوری ۱۹۷۱ء) میں طبع ہوا۔ بعد میں یہ مضمون ان کے مرتبہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی (طبع دوم ۱۹۸۲ء) کے مقدمہ کا جزو بن گیا۔

یہ نسخہ کب، کہاں اور کس سے ملا اور عرشی صاحب کے تعارفی مضمون کی اشاعت کے بعد کس طرح یہ نیشنل میوزیم کراچی منتقل ہوا، عرشی صاحب نے مذکورہ مضامین میں اس پر اظہارِ خیال نہیں کیا۔ مقدمہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی میں بھی اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔

راقم الحروف نے جناب مونس نظامی (فرزندِ احیدالدین نظامی) سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو انھوں نے بتایا کہ یہ نسخہ انھوں نے لکھنؤ کے ایک کتب فروش سے پندرہ روپے میں خریدا تھا۔ جب انھوں نے یہ نسخہ اپنے والد احیدالدین کو دکھایا تب احیدالدین نے اس کی اطلاع عرشی صاحب کو دی۔ عرشی صاحب نسخۂ شوق قدوائی[1] سمجھ کر فوراً بدایوں آگئے اور احید صاحب سے مطالعہ کے لیے نسخہ لے گئے، بعد میں عرشی صاحب نے بتایا کہ یہ ایک علیحدہ نسخہ ہے۔ عرشی صاحب نے اس نسخے پر مضمون لکھ کر نقوش میں شائع کرادیا (۱۹۶۰ء) انھی دنوں مونس نظامی کراچی گئے اور نسخۂ بدایوں اپنے ہمراہ لے گئے۔ کراچی میں انھوں نے یہ نسخہ جوش ملیح آبادی، مولوی عبدالحق اور بعض دوسرے اکابرِ اردو کو دکھایا۔ مولوی عبدالحق نے کہا کہ ہندوستان میں تو دیوانِ غالب کے خطی نسخے بہت ہیں پاکستان میں کمیاب ہیں لہٰذا اسے یہیں رہنا چاہیے۔ لیکن انجمن کی مالی حالت درست نہ ہونے کے سبب وہ اسے خرید نہیں سکے۔ البتہ مولوی عبدالحق اور جوش نے اس کی خریداری کی تحریری سفارش کی۔ ان سفارشوں کے ساتھ مونس صاحب نیشنل میوزیم کراچی پہنچے اور مبلغ چار ہزار میں یہ نسخہ ۱۹۶۰ء کے وسط یا آخر میں نیشنل میوزیم کو فروخت کردیا گیا۔ اس طرح ہندوستان کا یہ بیش قیمت ادبی اثاثہ پاکستان منتقل ہوگیا۔ میرے خیال سے اس نسخے کی دستیابی کی کہانی طبع زاد ہے۔ مونس نظامی کو یہ نسخہ بدایوں ہی میں کسی سے ملا ہوگا۔ عموماً قدیم کتب کی خرید و فروخت کرنے والے افراد ایسے خاندانوں اور ادیبوں کے ذاتی ذخیروں کی تلاش میں رہتے ہیں جن کے وارثان ان کی صحیح قدر و قیمت سے ناواقف ہوں اور مختلف ترکیبوں سے ان کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں۔ بسا اوقات یہ وارثان خود بھی انھیں فروخت کردیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شیوخ فاروقی کے خاندان سے ہی یہ نسخہ مونس نظامی یا احیدالدین نظامی کے ہاتھ

---

[1] دیوان غالب کا وہ خطی نسخہ جو احمد علی شوق قدوائی (ف ۱۹۲۵ء) کے پاس تھا، جس سے نظامی نے غالب کے دیوان کے دیباچے کی تاریخ ۱۲۴۸ھ طے کی۔ کچھ اور بھی استفادہ کیا لیکن شوق کی وفات کے بعد یہ نسخہ دستیاب نہیں ہوسکا۔

لگا ہوگا۔ عرشی صاحب کا اپنے مضامین میں اس کے حصول کی روداد کا نہ بیان کرنا بھی مصلحت سے خالی نہیں معلوم ہوتا۔

عرشی صاحب نے اپنے مقدمہ میں (مشمولہ نسخۂ عرشی) نسخۂ بدایوں کا تعارف اس کی اہمیت وغیرہ پر تقریباً ۶ صفحات میں (صفحہ ۱۰۶ تا ۱۱۱) روشنی ڈالی ہے۔ سطورِ ذیل میں اس نسخہ کا چند سطروں میں تعارف کرا دینا کافی ہوگا۔ عرشی صاحب لکھتے ہیں:

> ''یہ نسخہ جو بدایوں میں دریافت ہوا تھا۔ ۴/۱ ۸ x ۲/۱ ۵ انچ ناپ کا ہے۔ روشنائی کالی۔ عنوان اور جدول شنجرفی اور باریکا لاجوردی ہے۔ کاغذ بانس کا دیسی بنا ہوا ہے۔ ہر ورق میں رکاب بھی ہے اور ورق داغ بھی۔ خط شکستہ آمیز نستعلیق ہے۔ معمولی کرم خوردگی بھی پائی جاتی ہے۔ جلد پرانی مگر عام حالت اچھی ہے''۔
>
> (مقدمہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی، طبع دوم، ص:۱۰۶)

اس نسخے کا متن ۱۰۶۷ شعروں پر مشتمل ہے۔ ۳۵ شعر نسخے کے حاشیوں پر لکھے ہوئے ہیں (مقدمہ نسخۂ عرشی، ص:۱۰۸)۔ تقریظ کی رو سے نسخہ ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء کا مرتّبہ ہے (ایضاً ص:۱۰۹)۔ غالبؔ کے دیوان کے خطی نسخوں کی تاریخی ترتیب میں بعض داخلی شواہد کی بنیاد پر یہ ''نسخۂ رامپور قدیم'' (۱۸۳۳ء) کے بعد آتا ہے (ایضاً ص:۱۱۰)۔ اس نسخے کے سرورق پر ایک مہر ہے جس پر ''محمد ذوالفقار الدین ۱۲۵۲ھ'' کندہ ہے (ایضاً ص:۱۰۶)۔ عرشی صاحب نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ نسخہ سیّد حسین مرزا ذوالفقار الدین حیدر الموسوی کا نقل کرایا ہوا ہے (ص:۱۰۹)۔ عرشی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ نسخے کا تعلق مرزا صاحب کے کسی قریبی دوست یا عزیز سے تھا (ص۱۰۹، ۱۱۰)۔ لیکن ڈاکٹر محمد ایوب قادری (ف ۱۹۸۳ء) نے اس نسخے کو مہر کی بنیاد پر کسی دوسرے شخص کا نسخہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''حسین مرزا کا پورا نام 'سیّد ذوالفقار الدین حیدر الموسوی' تھا۔ یہ نام خود غالبؔ نے اپنے قلم سے لکھا ہے (ملاحظہ کریں نسخۂ طاہر)۔

اور ہمارے خیال سے لفظ ''سیّد'' اور ''حیدر'' حسین مرزا کے نام کے اہم جزو ہیں۔ جو مہر میں حذف کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مہر میں ''محمد ذوالفقارالدین'' ہے۔ لہٰذا یہ مہر حسین مرزا (سیّد ذوالفقارالدین حیدر الموسوی) کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی ہے اور اُس شخص کا تعلق بدایوں یا نواحِ بدایوں سے ہونا چاہیے۔ دراصل یہ بزرگ محمد ذوالفقارالدین حکیم غلام نجف خاں شیخوپوری ثم دہلوی کے حقیقی چچازاد بھائی تھے۔ محمد ذوالفقارالدین شیخوپور (بدایوں) کے سربرآوردہ اور علم دوست شخص تھے۔ یہ ان ہی کی مہر ہے۔ یہ نسخہ حکیم غلام نجف خاں کے توسط سے محمد ذوالفقارالدین کو پہنچا ہوگا۔ لہٰذا اس مہر اور نسخے کا تعلق سیّد ذوالفقارالدین حیدر الموسوی عرف حسین مرزا سے مطلق نہیں ہے''۔ (غالب اور عصرِ غالب، ص: ۲۱۴)

مہر میں لفظ 'محمد' کا اضافہ اور حسین مرزا کے نام میں لفظ 'محمد' کا نہ پایا جانا ڈاکٹر ایوب قادری کے خیال کو تقویت دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی قرینے ایسے ہیں جو اس نسخے کا مالک محمد ذوالفقارالدین کو قرار دیتے نظر آتے ہیں۔

اول: لفظ سیّد خواہ نام کا جزو ہو یا نہ ہو حیدر نام کا جزو ہے، جو مہر میں موجود نہیں۔ دوم: ''محمد ذوالفقارالدین'' کے خاندان سے غالبؔ کے خصوصی مراسم ہونا۔ سوم: نسخہ کا بدایوں میں ہی دستیاب ہونا۔ شیخ ''محمد ذوالفقارالدین'' از روئے شجرہ خاندانی حکیم غلام نجف خاں کے والد حافظ مسیح الدین کے سب سے چھوٹے بھائی شیخ فتح الدین کی اولادِ نرینہ میں دوسرے بیٹے تھے۔ بایں طور وہ حکیم غلام نجف خاں کے حقیقی چچازاد بھائی ہوئے۔ (شیخو سے شیخوپور تک: ۶۶)

شیخ فتح الدین نے اپنے خاندانی حالات پر ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۳ء میں فارسی میں ایک رسالہ لکھا تھا جس میں محمد ذوالفقارالدین کا بھی ذکر کیا ہے (اس رسالے کا ذکر حکیم غلام نجف خاں کے ترجمے میں کیا جاچکا ہے) ذوالفقارالدین کے چھوٹے بھائی شیخ شرف

الدین (ف ۱۸۸۶ء) کو ۱۸۵۷ء میں انگریز کلکٹر کو پناہ دینے کے صلے میں انگریزی حکومت نے انھیں بدایوں کی تحصیلداری اور C.I.E کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔

حکیم غلام نجف خاں کو مرزا مثل اولاد کے سمجھتے تھے۔ وہ ان کی نجی زندگی میں بھی عمل دخل رکھتے تھے۔ وہ ان کو مثل باپ اور استاد کا درجہ دیتے تھے۔ اس تعلق کی وضاحت گذشتہ اوراق میں کی جاچکی ہے۔ اسی تعلق کی بنا پر حکیم صاحب کے ذریعے کسی نسخے کا بدایوں منتقل ہونا اور وقتاً فوقتاً حاشیوں پر کلام کا اضافہ بھی ہوتے رہنا قرینِ قیاس ہے۔

کسی حد تک یہ طے پا جانے کے بعد کہ یہ نسخہ ''محمد ذوالفقارالدین'' کی ملکیت تھا، اس کو نسخۂ بدایوں کہنے اور لکھنے میں تامّل نہیں ہونا چاہیے۔ وہ فی الوقت نیشنل میوزیم کراچی کی ملکیت ہے۔

اُردو

دیوان غالب

معہ شرح نظامی

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

سنہ ۱۹۲۰ء

عکس سرورق، دیوانِ غالب مع شرح نظامی

دیوانِ غالب کے نظامی ایڈیشن

نظامی بدایونی (۱۸۷۲-۸ رجون ۱۹۴۷ء) پر علمی مقالہ لکھ کر راقم الحروف پی ایچ ڈی کی سند حاصل کر چکا ہے۔ اس مقالے میں غالبؔ سے متعلق ان کی خدمات کا تفصیل سے ذکر آ چکا ہے۔ سر دست اس میں اضافے کی گنجائش نہیں۔ یہ تحریر ڈیمائی سائز کے 65 صفحات پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اسی تحریر کو من و عن نقل کر دینا درست نہیں ہوگا، تفصیل کے لیے میرے علمی مقالے سے رجوع کر لیا جائے۔ یہاں اس میں پیش کردہ معلومات کا خلاصہ درج کیا جا رہا ہے۔ البتہ مزارِ غالبؔ کی مرمّت سے متعلق نظامی کی خدمات اس خلاصے پر اضافہ ہیں۔

نظامی بدایونی، ۱۸۹۱ء سے ۱۹۴۷ء تک قلم سے رشتہ استوار کیے رہے۔ وہ بیک وقت شاعر، صحافی، طابع و ناشر، مصلح، ماہرِ تعلیم، ادیب، شارح و فرہنگ نگار تھے۔ حالیؔ و شبلیؔ کے بعد کی نسل کے محققِ ادب بھی۔ دراصل وہ سر سیّد کی تعلیمی و اصلاحی تحریک کے زیر اثر رہے۔ ادب میں انھوں نے حالیؔ کی قائم کردہ شاہراہ کو منتخب کیا۔ ان کی فکر و عمل میں انہی دو اکابر کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔

انھوں نے متفرق موضوعات پر دو درجن سے زائد کتب یادگار چھوڑی ہیں۔ لیکن ان کی شہرت و عظمت کی بنیاد 'دیوانِ غالب' اور 'قاموس المشاہیر' کی اشاعتیں ہیں۔

دیوانِ غالب

نظامؔی نے 1915ء میں 'دیوانِ غالب' کا پہلا ایڈیشن شائع کیا جو کئی اعتبار سے عام مطبوعہ نسخوں سے بہتر تھا۔ اس میں متن کی صحت، مطبوعہ نسخوں سے تقابل، املا و اشاراتِ املا، نئے سائز، ظاہری دلکشی و رعنائی وغیرہ کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ نسخہ غالبؔ کی زندگی میں شائع ہونے والے مطبع احمدی دہلی کے مطبوعہ دیوان (۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) کی اساس پر تیار کیا گیا تھا۔ یہ نسخہ دراصل سیّد معین الدین شاہجہانپوری (ف ۱۹۳۷ء) کا مرتبہ تھا۔ طبعِ اول کے دیباچے میں نظامی نے خود صراحت کر دی ہے:

> ''اس کے بعد اپنے مکرم دوست سیّد معین الدین صاحب شاہجہانپوری مترجم اورنگ زیب و نپولین اعظم کے دل سے ممنون ہیں کہ انھوں نے اشاراتِ املائی اور تصحیح و تدوین کے اہم کام کو نظامی پریس کی خاطر انجام دیا۔ پہلے انھوں نے مختلف چھاپے کے دیوانوں کو پیش نظر رکھا۔ نمونہ کا ایک نسخہ اپنے قلم سے لکھا۔ پھر اسی کو کاما، ڈیش، علامتِ استفہام اور دیگر علامات سے مرتّب و مزیّن کیا۔ اسی قلمی نسخے کی یہ نقل ہے جو آج آپ کے مبارک ہاتھوں تک پہنچنے کا فخر حاصل کر رہی ہے''۔ (دیوانِ غالب، ص: ۴۳، ۴۴، طبع ششم)

بعد کے ایڈیشنوں میں ترتیب و تصحیح کا عمل مسلسل جاری رہا جو نظامی کی کوششوں کا نتیجہ تھا لہٰذا وہی ان کے مرتّب کہلائے۔

طبعِ اوّل کا سائز ۲۷x۱۷/۸ تھا جو اس وقت تک کتب کی اشاعت میں رائج نہیں تھا۔ نظامی اس سائز کے مخترع بھی کہلائے اور یہ سائز اتنا پسند کیا گیا کہ اقبالؔ نے اپنی کئی کتب اسی سائز پر طبع کرائیں (تفصیل کے لیے دیکھیے راقم کا مضمون'' کچھ اقبال

کے تعلق سے'' مشمولہ نقد و اثر، (ص: ۱۳۷)۔

سیّد معین الدین شاہجہانپوری انگریزی کے ماہر تھے، طبعِ اوّل انھوں نے ہی مرتّب کیا۔ یہ نسخہ جس شخص کی تحریک پر اشاعت کے لیے تیار کرایا گیا وہ بھی مغربی تعلیم یافتہ تھا یعنی سر راس مسعود (ف ۱۹۳۷ء)۔ نظامی لکھتے ہیں:

''اردو ادب سے ان کے (سر راس مسعود) ذوق کا پتا اس وقت چلا جب ولایت سے آئے ہوئے انھیں ایک سال گزرا تھا اور دلّی میں ایک یورپین دوست ان کے مہمان تھے، جن کو دینے کے لیے سب سے بڑے شاعر مرزا غالبؔ کے دیوان کے بہترین نسخے کی تلاش ہوئی، جس کے لیے انھوں نے دلّی جیسے شہر کے کتب فروشوں کی دوکانیں چھان ڈالیں لیکن کوئی نسخہ اچھے کاغذ اور خوشنما چھپائی کا نہ ملا۔ بالآخر انھوں نے منشی رحمت اللہ رعد مرحوم مالک نامی پریس کانپور کو جن کے پریس سے مسدس حالی، دیوانِ حافظ اور مثنوی مولانا روم جیسی مشہور کتابوں کے خاص ایڈیشن شائع ہو چکے تھے، لکھا کہ وہ دیوانِ غالب کا صحیح نسخہ بہم پہنچا کر ایک خاص ایڈیشن چھاپیں۔ منشی صاحب نے یہ خدمت نظامی پریس بدایوں کو تفویض کی''۔

(سر راس مسعود، زمانہ، کانپور، نومبر ۱۹۳۷ء)

یہ واقعہ ۱۹۱۳ء کا ہے۔ محمد اسماعیل بدایونی لکھتے ہیں:

''اتفاقاً انھیں ایام میں نظامی صاحب پریس کی مشکلات کے بارے میں مشورے کے لیے کانپور رعد صاحب کے پاس پہنچے۔ جو خط راس مسعود صاحب نے دیوانِ غالب کی طباعت کے متعلق لکھا تھا، رعد صاحب کو دے دیا اور کہا کہ اس منشاء کو پورا کرو۔ مسعود اردو ادب کا دلدادہ ہے اور تمہارا بھی یہی مذاق بلکہ یہی پیشہ ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۱۳ء کا ہے۔ بدایوں آکر نظامی صاحب نے دیوانِ غالب کی طباعت کے متعلق مسعود صاحب سے مراسلت شروع کر دی اور ۱۹۱۵ء میں دیوانِ

غالب کا پہلا ایڈیشن نہایت صحت و نفاست کے ساتھ شائع ہوا۔ راس صاحب کو اس کی کاپی ملی، بہت پسند فرمائی"۔

(نظامی بدایونی کی ادبی خدمات، 'نیا دور' لکھنؤ، مئی ۱۹۷۵ء)

مذکورہ صدر اقتباسات درج کرنے کا منشاء یہ ہے کہ قارئین یہ اندازہ لگالیں کہ اُس دور کے نئے تعلیم یافتہ افراد ہی مشاہیر کے دواوین کو ان کی ادبی عظمتوں کے پیش نظر اعلیٰ معیار پر طباعت کے خواہاں تھے۔ چنانچہ نسخۂ نظامی نے مقبولیت حاصل کی۔ اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے انجمن ترقی اردو کو دیوانِ غالب کی اشاعت کا زیر عمل منصوبہ ملتوی کرنا پڑا جسے سیّد ہاشمی فرید آبادی (ف ۱۹۶۴ء) انجمن کے لیے ترتیب دے چکے تھے۔ بعد میں عبدالرحمٰن بجنوری نے نسخۂ بھوپال (یعنی نسخۂ حمیدیہ) کے فراہم ہوجانے کے بعد ایک مکمل دیوان کی اشاعت کی تجویز مولوی عبدالحق کو پیش کی۔ انھوں نے سیّد ہاشمی کے مرتبہ دیوان کو مزید نکھارنے سنوارنے اور مکمل دیوان پر ایک مقدمہ لکھنے کی پیش کش بھی کی اور مقدمہ کی تیاری بھی شروع کردی۔ لیکن ۷ رنومبر ۱۹۱۸ء کو ان کے اچانک وفات پاجانے کے سبب انجمن کی جانب سے شائع ہونے والے دیوانِ غالب کی ترتیب و اشاعت موقوف ہوگئی۔ وفات کے دو سال بعد ان کا مقدمہ جو متداول دیوان کو بنیاد بنا کر لکھا گیا تھا، اولاً اردو اورنگ آباد (جنوری ۱۹۲۱ء) میں شائع ہوا بعد میں 'محاسنِ کلامِ غالب' کے نام سے ۱۹۲۱ء میں مفیدِ عام اسٹیم پریس آگرہ سے شائع ہوا (نقد بجنوری، ص:۱۸، ۱۹)۔ ۱۹۲۱ء ہی میں نسخۂ حمیدیہ (اسٹیم پریس آگرہ) میں بھی شامل ہوا۔ یہ امر تحقیق کا موضوع بن چکا ہے کہ بجنوری نے یہ مقالہ نسخۂ حمیدیہ کے لیے بطور مقدمہ لکھا تھا یا انجمن ترقی اردو ہند کے دیوانِ غالب کے جدید ایڈیشن کے لیے، (ملاحظہ فرمائیں نسخۂ حمیدیہ اور بجنوری، مولانا عرشی، العلم کراچی، غالب نمبر ۱۹۶۹ء) چونکہ یہ ہمارا موضوع نہیں ہے اس لیے اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

نظامی نے دیوانِ غالب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۸ء میں اپنے پریس سے شائع کیا۔ اس کا مقابلہ نظامی نے منشی احمد علی شوق قدوائی (ف ۱۹۲۵ء) کے پاس موجود ایک قلمی

نسخے سے کیا جو اس وقت رامپور میں مقیم تھے۔ نظامیؔ نے اس قلمی نسخے سے فارسی دیباچہ بھی شاملِ دیوان کیا اور اس نسخے کی مدد سے دیباچہ کی تاریخ ۱۲۴۸ھ/ ۱۸۳۳ء متعین کی۔ اس طرح اس ایڈیشن کا متن زیادہ صحیح اور معتبر بنالیا گیا۔ نظامی لکھتے ہیں:

''اس مرتبہ اس سے بھی پرانا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آیا جو اصل دیوان سے نقل کیا گیا ہے جس کو پہلی مرتبہ غالبؔ نے ۱۲۴۸ھ میں مرتب کیا تھا۔ یہ نقل جو ہمیں دستیاب ہوئی ہے اسی زمانے کی لکھی ہوئی ہے۔ اسی کے ساتھ ایک دیباچہ بزبانِ فارسی مصنف نے لکھا ہے جس کو ناظرین کے مطالعے کے لیے اس دیوان کے شروع میں بجنسہٖ درج کیا گیا ہے۔ اس دیباچہ کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان اردو، فارسی دیوان سے پہلے مصنف نے ۱۲۴۸ھ میں ترتیب دیا۔ لیکن اس میں مصنف کی بعض مشہور غزلیں نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۴۸ھ کے بعد دوسرا نسخہ مرزا نے ان غزلیات کو شامل کر کے جو سالِ مذکور کے بعد تصنیف ہوئیں، ترتیب دیا ہے اور وہی اب تک رائج ہے۔ اگر اس قلمی نسخے کی جو ۱۲۴۸ھ کا لکھا ہوا ہمیں ملا ہے، متابعت کی جائے تو بعض مشہور غزلیں نکال دینی پڑیں گی مثلاً یہ غزل: 'لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور' جس کا مضمون تاریخی واقعے پر مشتمل ہے اور یقیناً غالبؔ کی مصنفہ ہے اسی لیے اس قلمی دیوان سے صرف یہ مدد لی گئی ہے کہ بعض خفیف غلطیاں جو مطبوعہ دیوانوں میں پائی گئیں، درست کر لی گئی ہیں''۔ (دیباچہ، ص: ۶۱، ۶۲ طبع ششم)

نظامیؔ کا منشاء غالبؔ کے دیوان کا تحقیقی متن پیش کرنا نہیں تھا بلکہ مطبوعہ ایڈیشنوں میں جو مختلف متن نظر آتا تھا یا کتابت و طباعت کے سبب لفظ کچھ سے کچھ ہو گئے تھے ان کو درست کرنا تھا اور ان کا قابلِ قبول متن اور صحیح قرأت پیش کرنا تھا۔ نظامی نے اس نسخے سے بعض لفظی غلطیاں درست کیں۔ اشعار کی ترتیب اور ان کی تعداد سے کوئی

سروکار نہیں رکھا۔ دیباچہ مع تاریخ (بست و چہارم شہر ذی قعدہ ۱۲۴۸ھ) درج کیا، باقی کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

نظامیؔ کے مطالعے میں آنے کے بعد یہ نسخہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شوق کی وفات (۱۹۲۵ء) کے سبب یہ دوبارہ دیکھنے میں نہیں آسکا (ملاحظہ کریں راقم الحروف کا مضمون 'دیوانِ غالب کا ایک مستور رامپوری نسخہ' مشمولہ 'غالب اور رامپور' مرتّب شاہد ماہلی، دلّی ۲۰۰۶ء، ص: ۱۲۷ تا ۱۴۶)۔

تیسرا ایڈیشن (۱۹۲۰ء) ترتیب دیتے وقت نظامی کے پیش نظر ایک اور قلمی نسخہ دیوانِ غالب رامپور (جدید) بھی رہا جو ۱۲۷۱ھ/ ۱۸۵۵ء کا مکتوبہ ہے۔ مرزا نے یہ دیوان غدر ۱۸۵۷ء سے قبل نواب محمد یوسف علی خاں والیِ رامپور کو نذر گزرانا تھا۔ محققین کا خیال ہے کہ مرزا کے کلام کو زندہ رکھنے کا سبب یہی قلمی دیوان ہے جو تلف ہونے سے بچ گیا۔ اس قلمی دیوان سے نظامیؔ نے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھایا۔ لکھتے ہیں:

> "اس جدید نسخے (یعنی تیسرے ایڈیشن) کو ریاست رامپور کے سرکاری کتب خانہ کے قلمی دیوان سے جو ۱۸۵۵ء مطابق ۱۲۷۱ھ کا لکھا ہوا ہے، مقابلے کی عزت حاصل ہوئی ہے"۔ (دیباچہ، ص: ۵۴)

دیوانِ غالب کے اس تیسرے ایڈیشن پر ڈاکٹر سیّد محمود غازیپوری (ف ۱۹۷۱ء) کا مقدمہ ملتا ہے۔ یہ مقدمہ ۱۹۱۹ء میں نظامی کے اصرار پر لکھا گیا۔ اس کے خاتمے پر ۱۸/ اکتوبر ۱۹۱۹ء تاریخ مرقوم ہے۔ یہ مقدمہ ۱۹۲۳ء کے لائبریری ایڈیشن کو چھوڑ کر بعد کے ہر ایڈیشن کی زینت بنا۔ ۱۹۲۱ء میں اس مقدمہ پر نظرِ ثانی کی گئی۔ بعد نظرِ ثانی چوتھے ایڈیشن (۱۹۲۲ء) میں شامل کیا گیا۔ طبعِ سوم میں یہ کتابی سائز کے ۲۷ صفحات پر مشتمل تھا، بعد نظرِ ثانی اس کے صفحات میں اضافہ ہو گیا۔ طبعِ ششم (۱۹۲۷ء) میں یہ ۳۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر سیّد محمود نے عبدالرحمٰن بجنوری کی طرح غالبؔ کی شاعری کا مطالعہ ایک نئے زاویے سے کیا ہے۔ انھوں نے غالبؔ کی شاعری میں ۱۸۵۷ء کی خوں چکاں داستان

تلاش کی ہے اور اس عہد کے سیاسی واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے غالبؔ کے یہاں وطنیت اور قومیت کے عناصر دریافت کرلیے ہیں۔ اس طرح ان عناصر کی موجودگی میں ان کی حب الوطنی کا ثبوت فراہم کردیا ہے۔ اس پس منظر میں وہ غالبؔ کو ایک وطن دوست اور قوم پرور شاعر قرار دیتے ہیں۔ اپنے عہد میں اس مقدمہ نے نئے تعلیم یافتہ افراد میں غالبؔ کی قوم پرستی کی خاصی تشہیر کی لیکن بہت جلد اردو ناقدین اور محققین نے جب اس کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا تو یہ ثابت ہوگیا کہ مقدمہ نگار نے اپنے نظریے کے اثبات کے لیے جن اشعار کو مثالوں میں پیش کیا تھا ان کی اپنے عہد کے سیاسی واقعات سے محض اتفاقی مطابقت تھی۔ چنانچہ ان اشعار سے استنباطِ نتائج میں مقدمہ نگار کی غلطیوں کو واضح کردیا گیا اس طرح اس مقدمہ کا بنایا ہوا تنقیدی حصار ٹوٹ گیا۔ چوتھا ایڈیشن (۱۹۲۲ء)، پانچواں ایڈیشن (۱۹۲۳ء) اور چھٹا ایڈیشن (۱۹۲۷ء) ماقبل کے ایڈیشن کے مطابق ہی شائع ہوئے۔

نظامیؔ کے شائع کردہ اور مرتّب کردہ ان دیوانوں کی بعض خصوصیات اور بھی ہیں۔ اختصار کے ساتھ سطورِ ذیل میں ان کا ذکر کیا جارہا ہے۔

تعداد اشعار و نَو دستیاب کلام کا اضافہ

نظامیؔ کے مرتّبہ دیوانِ غالب طبع ششم میں اشعار کی کل تعداد ۱۸۳۸ ہے۔ متداول دیوان میں تعداد اشعار ۱۸۱۸ ہے۔ گویا نظامیؔ کے نسخے میں بیس اشعار کا اضافہ ہے۔ اس اضافے کی نوعیت حسبِ ذیل ہے۔

نظامیؔ نے اصل دیوان میں ''سہرا'' بھی شامل کیا ہے جو غالبؔ کی زندگی میں شائع ہونے والے کسی بھی دیوان میں نہیں ملتا۔ اس سہرے میں بارہ اشعار ہیں۔ علاوہ ازیں نظامیؔ نے دو رباعیات بھی 'اردوے معلیٰ' سے اخذ کر کے اصل دیوان میں شامل کردی ہیں۔ غزلیات میں ''غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے'' غزل کے چار شعر اضافہ کر کے شامل کیے ہیں۔ اس طور نظامیؔ نے اصل دیوان میں بیس اشعار کا اضافہ کیا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ غزل ''ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے'' میں دو شعر بالترتیب داغؔ اور ظفرؔ کے شامل ہوگئے ہیں جو ان دونوں کے دیوان و کلیات میں موجود ہیں۔ (ملاحظہ کریں 'گلزارِ داغ' ص:۲۱۶، دیوانِ ظفر، ص:۱۶۶) نظامیؔ نے ایک قدیم قلمی تذکرے سے اخذ کرکے ان کو اصل دیوان میں شامل کردیا۔ ان دونوں اشعار کی غالبؔ سے نسبت غلط ہے۔ لہٰذا ان دو اشعار کو بھی اگر دیوان سے خارج کردیا جائے تو نسخۂ نظامی میں اشعار کی کُل تعداد ۱۸۳۶ رہ جاتی ہے۔

نظامیؔ نے اپنے مرتّبہ دیوانوں میں نَو دستیاب کلام کا اضافہ بھی بہ عنوان ''وہ کلام جو مروّجہ دیوانوں میں نہیں'' کیا ہے۔ اس کلام کا ماخذ، اخبارات و رسائل و نجی بیاضیں ہیں۔ نظامیؔ نے جگہ جگہ حواشی بھی دیے ہیں اور حوالہ بھی۔ لیکن کہیں حوالہ یا ماخذ نہیں دے سکے۔ یہ تمام کلام ایک اردو قصیدہ، چند غزلیات، قطعات اور فردیات پر مشتمل ہے۔ ان کی تعداد اشعار ۱۱۹ ہے۔ بعد میں یہ اشعار مالک رام کے مرتّبہ دیوانِ غالب نسخہ مالک رام (دہلی ۱۹۵۷ء) اور امتیاز علی خاں عرشی کے مرتّبہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی (طبع دوم دہلی، ۱۹۸۲ء) میں شامل ہوئے۔ مالک رام نے نظامیؔ کے درج کردہ اشعار میں سے ۸۶ اشعار اپنے دیوان کے تتمہ میں شامل کیے لیکن نظامیؔ کا حوالہ نہیں دیا۔ البتہ عرشی صاحب نے کہیں کہیں نظامیؔ کا حوالہ دیا ہے۔

نظامیؔ کے پیش کردہ ۱۱۹ اَشعار میں ۱۱۸ کی تصدیق دو ماہرینِ غالبیات نے اپنے مرتّبہ دیوانوں میں ان کو شامل کرکے کردی ہے، ایک شعر: ''چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط'' کی غالب سے نسبت مشتبہ تھی۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے ایک قدیم گلدستے میں عاشق حسین بزم اکبرآبادی (ف ۱۹۵۳ء) کا اسی مضمون کا شعر دریافت کرلیا اور غالبؔ سے منسوب شعر کو اصل شعر کی بدلی ہوئی شکل قرار دیا۔ گویا غالبؔ سے اس کی نسبت غلط قرار دے دی گئی (غالب - احوال و آثار، ص ۱۵۲ تا ۱۵۹)۔ اس طرح نظامیؔ نے ۱۹۲۷ء تک غالبؔ کے ۱۱۸ اشعار دریافت کیے۔ غالبؔ کے اس نئے کلام کی دریافت و

بازیافت کی طرف نظامی کا یہ پہلا قدم تھا۔

دیباچے، عکس تحریر اور فوٹو

نظامی نے دیوانِ غالب کی ہر اشاعت کے لیے نیا دیباچہ لکھا۔ انھوں نے کل سات دیباچے لکھے۔ ان دیباچوں کا سالِ تحریر کبھی کبھی سالِ اشاعت سے مختلف ہو گیا ہے۔ تفصیل حسبِ ذیل ہے:

دیباچہ طبعِ اوّل مع سوانح عمری	۱۷ر جنوری ۱۹۱۵ء	۹ صفحات
دیباچہ طبعِ دوم	۱۴ر جون ۱۹۱۸ء	۷ صفحات
دیباچہ طبعِ سوم	۸ر دسمبر ۱۹۱۹ء	۴ صفحات
دیباچہ طبعِ چہارم	۱۴ر جولائی ۱۹۲۱ء	۵ صفحات
دیباچہ طبعِ پنجم (لائبریری ایڈیشن)	۲۴ر اکتوبر ۱۹۲۲ء	۲ صفحات
دیباچہ طبعِ پنجم	۳۱ر اکتوبر ۱۹۲۲ء	۴ صفحات
دیباچہ طبعِ ششم	۳ر اپریل ۱۹۲۷ء	۴ صفحات

نظامی نے ان دیباچوں میں مرتبہ دیوانوں کی خصوصیات، تعارف و تفصیلات اور اپنے منشاء و موقف کی وضاحت کی ہے۔ یہ دیباچے مربوط، مکمل اور جامع ہیں۔ ان میں مرتبہ دیوانوں کی اساس، صحتِ متن، املا، شرح اور اضافہ کیے گئے اشعار کا ذکر اور متعاون حضرات کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ ماقبل کے ایڈیشن کے دیباچے مابعد کے ایڈیشنوں میں شامل کیے گئے ہیں جن کے مطالعے سے ماقبل کے تمام ایڈیشنوں کی خصوصیات کا بھی علم ہو جاتا ہے۔

دیوانِ غالب کی اشاعتوں میں مرزا غالبؔ کا ایک فوٹو اور ایک خط کا عکس بھی شامل ہوتا رہا ہے۔ مرزا کا خط ۳۰ر نومبر ۱۸۶۳ء کا مکتوبہ ہے اور یہ قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی (ف ۱۹۰۰ء) تلمیذ غالب کے نام ہے۔ یہ خط طبعِ دوم کی ترتیب کے وقت ملا۔ اس خط کا عکس طبعِ دوم تا ششم ہر اشاعت میں شامل ہوا۔

طبعِ اوّل تا ششم مرزا کا فوٹو بھی شامل ہوا ہے۔ نظامیؔ نے اپنے دیباچوں میں فوٹو کے متعلق صراحت نہیں کی۔ البتہ نکاتِ غالب (طبعِ دوم) میں انھوں نے لکھا ہے کہ مرزا نے یہ تصویر ۱۸۶۷ء میں اپنی وفات سے صرف دو سال پہلے کھنچوائی تھی (ص: ۲)۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو (ف ۳۰ر جون ۲۰۱۰ء) اسے مرزا کی پہلی تصویر قرار دیتے ہیں جو کیمرے کے ذریعے لی گئی۔ (آئینۂ غالب، ص: ۳۷) مولانا ابوالکلام آزاد کے ارشاد کے مطابق:

> "یہ فوٹو دو اور تصویروں کے ساتھ خواجہ حالی مرحوم نے منشی رحمت اللہ رعدؔ کے پاس اس غرض سے بھیجا تھا کہ ان میں سے جو تصویر بہتر ہو اس کی نقل یادگارِ غالب کے لیے تیار کرالی جائے"۔
>
> (آئینۂ غالب، ص: ۳۸)

منشی رحمت اللہ رعدؔ (ف ۱۹۲۱ء) نظامیؔ کے استاد تھے اور ان کی تحریک پر نظامیؔ نے دیوانِ غالب شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لہٰذا قرینِ قیاس ہے کہ یہ تصویر منشی رحمت اللہ رعدؔ ہی سے نظامیؔ کو ملی ہو اور تصویر کے متعلق زمانہ کا تعین نظامی نے منشی جی سے یا حالی سے کرلیا ہو۔ مرزا کا یہ اصل فوٹو کتب خانہ حبیب گنج میں بھی موجود ہے۔

(آئینۂ غالب، ص: ۳۸)

شرح وفرہنگ

دیوانِ غالب، طبعِ اوّل کو چھوڑ کر ہر ایڈیشن میں مشکل الفاظ کے معانی اور پیچیدہ اشعار کے مطالب حاشیوں کی صورت میں درج کیے گئے ہیں۔ یہ حاشیے جن کی ابتدا طبعِ دوم (۱۹۱۸ء) سے ہوئی نظر ثانی ہوتے ہوئے چھٹے ایڈیشن (۱۹۲۷ء) تک قابلِ قدر شرح بن گئے۔ یہ شرح، اصل دیوان ہی کا حصہ ہے، دیوان سے علیحدہ اس کو تنہا شرح کی صورت نہیں دی گئی۔ یہ شرح بعض خصوصیات میں منفرد ہے، مثلاً:

☆ نظامیؔ بیشتر غالبؔ اور حالیؔ کے بیان کردہ مطالب کو درج کرتے ہیں۔

☆ علمی شان برقرار رکھتے ہوئے شعر کا مطلب عام فہم انداز میں تحریر کرتے ہیں۔

☆ لاطائل بحث، طول طویل توجیہہ و تجزیے سے گریز کرتے ہیں۔

☆ گاہ گاہ کلامِ غالب کے ہم مضمون فارسی اشعار سے بھی تقابل کرتے ہیں۔

☆ اختصار و جامعیت کو بہر طور ملحوظ رکھتے ہیں

☆ صرف مشکل اشعار ہی کی شرح لکھتے ہیں۔

☆ اشعار غالب پر حک و اصلاح سے گریز کرتے ہیں جیسا کہ شوکت میرٹھی اور طباطبائی نے کیا ہے۔

☆ شعر کا صرف ایک مطلب بیان کرتے ہیں کئی ایک مطالب لکھ کر قاری کے ذہن کو الجھاتے نہیں۔

جہاں تک فرہنگ کا تعلق ہے تو یہ صرف طبع پنجم (۱۹۲۳ء) کے لائبریری ایڈیشن (جو غیر مشرح ہے) میں شامل ہے۔ یہ فرہنگ چونکہ مشرح ایڈیشن ہی سے جزوی طور پر تیار کی گئی ہے لہٰذا اسے بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔

دیوانِ غالب کے ''نسخہ ہائے نظامی'' کے حوالے جہاں تہاں ماہرینِ غالبیات کی تحریروں میں آتے رہے ہیں۔ نظامی کی ان خدمات پر اظہارِ خیال بھی کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن ان سبھی نسخوں کا تحقیقی مطالعہ راقم الحروف سے پیشتر کسی نے نہیں کیا۔

نکاتِ غالب

جس میں

میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی

کی

خود نوشتہ سوانح عمری، نکتے جو وقتاً فوقتاً اُنھوں نے اپنے خطوط

میں لکھے اور اُن کے لطیفے شامل ہیں

مرتبہ

نظامی بدایونی

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

عکس، نکاتِ غالب

نکاتِ غالب

نظامیؔ کا غالبؔ سے متعلق دوسرا اہم کام 'نکاتِ غالب' کی ترتیب و اشاعت ہے۔ مرزا غالب کے خطوط جو 'عودِ ہندی' (۱۸۶۸ء) اور 'اردوے معلیٰ' (۱۸۶۹ء) میں ملتے ہیں، ان میں مرزا کی نجی زندگی، شخصیت اور فن سے متعلق بہت کچھ مواد ملتا ہے۔ نظامیؔ نے ان خطوط سے اقتباسات اخذ کر کے ایک سلسلے کے تحت پیش کر دیے ہیں جو ایک طرح سے خود نوشت سوانح معلوم ہوتی ہے۔ اس کتاب کے بالترتیب تین ایڈیشن ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۴ء، ۱۹۵۴ء شائع ہوئے۔ طبعِ اوّل کا انتساب حاجی محمد حمید اللہ صاحبزادہ سلطان جہاں بیگم فرماں روائے ریاست بھوپال کے نام کیا گیا ہے۔

سرورق کے بعد آرٹ پیپر پر مرزا کا فوٹو دیا گیا ہے۔ یہ وہی فوٹو ہے جو 'دیوانِ غالب' میں شامل ہوا تھا۔ کتاب فہرست سے عاری ہے۔ گزارش (ص:۱ تا ۴) کے تحت کتاب کا تعارف کرا دیا گیا ہے۔ کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

مرزا غالب کی سرگزشت ص: ۵ تا ۱۹

مرزا غالب کے انمول نکتے ص: ۲۰ تا ۴۹

مرزا غالب کے لطائف وظرائف ص: ۵۰ تا ۶۷

پہلے حصے ''سرگزشت'' کے ذیلی عنوانات حسبِ ذیل ہیں:
خاندان ونسب، پیدائش، لڑکپن اور تعلیم، حلیہ، مذہب، شادی و اولاد، کلکتہ کا سفر، دہلی سے رامپور، شاعری وتصنیف، عالمِ شباب، مالی حالت اور افلاس، قید ہونے کا واقعہ، غدر اور اس کے بعد کے حالات، شراب و آم کا شوق، سخت علالت، بڑھاپا اور آخری حالت، آخر عمر کے خیالات، دنیا سے بے دلی۔

کہیں کہیں حواشی دے کر نظامیؔ نے اس حصے کی تاریخی صحت بھی کردی ہے اور قدرے وضاحت بھی۔ دوسرے حصے ''انمول نکتے'' کے تحت ۱۰۳ نکتے خطوط سے تلاش کر کے ایک مختصر تمہید کے ساتھ ترتیب دیے ہیں (طبعِ سوم)۔ یہ نکتے شاعری کے فن، تذکیر وتانیث، لفظوں کے ماخذ واشتقاق، اشعار کے حسن و قبح سے متعلق ہیں۔

آخری عنوان 'لطائف وظرائف' کے تحت بھی مختصر تمہید کے بعد مرزا کے ۴۶ لطیفے یکجا کیے گئے ہیں (طبعِ سوم)۔

غالبؔ سے متعلق یہ کتاب عام طور سے مقبول ہوئی۔ سلطنتِ آصفیہ حیدرآباد ٹکسٹ بُک کمیٹی نے اسے منظور کرلیا تھا اور صوبہ متحدہ آگرہ کے سررشتہ تعلیم اور بعض دوسرے صوبہ جات میں بھی یہ اردو نصاب میں داخل رہی۔

اُس وقت غالبؔ پر یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی۔ بعد میں اسی طرز پر چار کتابیں تالیف ہوئیں، جن میں غالبؔ کے جملہ خطوط اور تمام شعری~~ہ~~ نثری تخلیقات کو سامنے رکھ کر ایک مکمل خودنوشت سوانح اور بسیط انداز میں ان کے ادبی وشعری نظریات وخیالات مدوّن کیے گئے۔ وہ چار کتابیں حسبِ ذیل ہیں:

غالب	غلام رسول مہر	دہلی	۱۹۳۶ء
ادبی خطوطِ غالب	مرزا محمد عسکری	لکھنؤ	۱۹۳۸ء
غالب کی آپ بیتی	نثار احمد فاروقی	دہلی	۱۹۶۹ء

غالب کا تنقیدی شعور اخلاق حسین عارف لکھنؤ ۱۹۶۹ء

مذکورہ کتب کے مولّفین نے نظامیؔ کی 'نکاتِ غالب' کا تذکرہ نہیں کیا۔ موضوع، اندازِ ترتیب کے لحاظ سے 'نکاتِ غالب' نقشِ اول تھا بعد کی کتابیں نقشِ ثانی ہیں۔ 'نکاتِ غالب' اجمالی سہی لیکن اس نے اہلِ قلم کے لیے ایک نئی راہِ تالیف کی نشاندہی کی اس لیے وہ اولیت کی مستحق ہے۔

نظامیؔ بدایونی نے غالبؔ پر چند متفرق مضامین بھی لکھے۔ ہفتہ وار اخبار 'ذوالقرنین' (اجرا ۷؍جون ۱۹۰۳ء) میں اداریے، شذرات اور نوٹ بھی لکھے۔ بعض دوسرے اہلِ قلم کے مضامین بھی اخبار میں شائع کیے۔ 'ذوالقرنین' کی فائلوں کے مطالعے کے دوران غالبؔ کے بارے میں ۲۱ تحریروں کی فہرست میں تیار کرسکا۔ ان میں آٹھ تحریریں بدایوں سے باہر کے اہلِ قلم کی ہیں[1]۔ چار تحریریں نظامیؔ کی ہیں، باقی دس تحریریں نظامیؔ کے بیٹے احیدالدین نظامی (۲۳؍اپریل ۱۸۹۳ء - ۱۷؍فروری ۱۹۷۹ء) کی معلوم ہوتی ہیں جو نظامیؔ کی وفات (۱۹۴۷ء) کے بعد 'ذوالقرنین' کے ایڈیٹر بنے۔ غالبؔ سے متعلق ان تمام تحریروں کا اشاریہ کے تحت آئندہ اوراق میں اندراج کیا جائے گا۔

---

[1] ۱۔ تربت غالب مظلوم ومرحوم	معین الدین شاہجہانپوری	ذوالقرنین	۲۸؍جون ۱۹۱۱ء
۲۔ مرزا غالب کا اردو کلام	محمد یحییٰ تنہا	ذوالقرنین	۷؍اکتوبر ۱۹۲۸ء
۳۔ حضرت غالب دہلوی کے قدر شناسوں کی خدمت میں	مولوی مہیش پرشاد	ذوالقرنین	۲۲؍نومبر ۱۹۳۳ء
۴۔ غالب	وقار رضوی	ذوالقرنین	۱۴؍مارچ ۱۹۵۷ء
۵۔ دیوان غالب (اردو) کا ایک اور نادر مخطوطہ	امتیاز علی خاں عرشی	ذوالقرنین	۲۱؍جولائی ۱۹۶۰ء
۶۔ غالب: شخصیت اور شاعری	مالک رام		۲۱؍فروری ۱۹۶۹ء
۷۔ غالب کی شخصیت	رشید احمد صدیقی		۲۱؍مارچ ۱۹۶۹ء
۸۔ غالب کے مغلوبوں کو جواب	ابرار حسین فاروقی		۱۴؍جون ۱۹۶۹ء

نظامی پریس کے ذریعے بھی انھوں نے غالبؔ اور غالبیات کے موضوع پر متعدد کتب شائع کیں، ان میں بعض کتب اہم ہیں، ان کا ذکر بھی آئندہ اوراق میں ''غالب اور نظامی پریس'' عنوان کے تحت کیا جارہا ہے۔ غالبؔ سے نظامیؔ کی دلچسپی تصنیف و تالیف اور کلامِ غالب کی نشر واشاعت تک محدود نہیں تھیں بلکہ غالبؔ کی یادگار کے قیام کے سلسلے میں بھی وہ ہر ممکن تعاون دیتے، تجاویز و مشورے پیش کرنے میں فعال رہے۔ اس سلسلے کی ان کی کوششوں پر ہنوز توجہ نہیں دی گئی ہے۔ ذیل میں ان کے اداریوں و شذرات کی روشنی میں اس سلسلے کی ان کی مساعی کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

نظامی اور غالب کے مزار کی مرمّت

مزارِ غالبؔ کی مرمّت اور اسے ایک یادگار کے طور پر محفوظ کرنے کا احساس پہلی مرتبہ وسط ۱۹۱۱ء میں ایک یورپین شخص جے مورٹن کو ہوا، جو ایک مراسلے (مطبوعہ ڈیلی پائنیر الہ آباد، ۷/جون ۱۹۱۱ء) کے ذریعے ملک کے سنجیدہ اہلِ قلم اور پرستارانِ غالب کو اس کام کی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوا اور اس طور ملک کے طول وعرض میں ''مزارِ غالب کا تحفظ'' عنوان نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی جو سبک رفتار کے ساتھ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۵۵ء تک چندوں، کمیٹیوں، اسکیموں، تجاویز اور مشوروں کے درمیان کبھی دم پکڑتی رہی اور کبھی دم توڑتی رہی۔ تا آنکہ ستمبر ۱۹۵۳ء میں ''غالب سوسائٹی'' قائم ہوئی اور اس کے تحت دسمبر ۱۹۵۴ء میں مزارِ غالب پر سنگِ مرمر کی ایک چوکھنڈی تعمیر ہوئی۔ مرزا کی تاریخِ وفات کی رعایت سے اس کا افتتاح ۱۵/فروری ۱۹۵۵ء کو کیا گیا۔ (غالب سوسائٹی، مالک رام، آجکل، دہلی، مارچ ۱۹۵۸ء)

نظامیؔ نے بھی اس تحریک میں قابلِ ذکر حصہ لیا۔ تجاویز و مشورے بھی دیے اور مالی مدد پیش کرنے کی بھی سعی و تدبیر کی۔ لیکن نظامی کی اس سلسلے کی کوششوں کی اہمیت و قدر و

قیمت کا صحیح اندازہ اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک اس تحریک کے سیاق و سباق سے تاریخی طور پر ہم واقف نہ ہوں۔ اگرچہ اس تحریک کی تفصیلات بیان کرنا ہمارے موضوع کا حصہ نہیں ہیں۔

۱۹۶۹ء میں نادم سیتاپوری نے ''غالبؔ کی آخری آرام گاہ'' (العلم، کراچی، غالب نمبر ۱۹۶۹ء) کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا جس میں بڑی حد تک انھوں نے اس تحریک کو متعارف کرادیا ہے۔ لیکن نظامیؔ کی تحریروں سے وہ ناواقف رہے۔ مورٹن کے مراسلے کا انگریزی متن اور معین الدین شاہجہانپوری کا ترجمہ و خلاصہ بھی انھیں دستیاب نہیں ہوسکا تھا۔ شاہد ماہلی کی کتاب ''مزاراتِ غالب و ذوق'' (دہلی ۱۹۹۹ء) بھی اس اولین تحریک کے سیاق و سباق کو پیش کرنے سے قاصر رہی۔ نادم سیتاپوری کی تلاش و تحقیق کے اعتراف کے ساتھ اس تحریک کے آغاز و انجام کا اجمال پیش کررہا ہوں۔ تفصیل راقم الحروف کے مضمون ''مزارِ غالب'' (سہ ماہی 'فکر و تحقیق' دہلی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۵ء) میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء (مطابق ۲رذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو مرزا غالبؔ کا انتقال ہوگیا (ذکرِ غالب، ص:۱۰۵)۔ غالبؔ سے متعلق کتب اور آثار و اکابرِ دہلی سے متعلق تصنیفات سے مزارِ غالبؔ کی اولین شکل و حلیے کی بابت معلومات نہیں ملتیں۔ مرزا حیرت دہلوی نے لکھا ہے:

> ''ان کا مزار حضرت شاہ نظام الدین اولیا، میں موجود ہے جس کے گرد ان کے ہندو شاگرد نے چہار دیواری کھنچوادی ہے''۔
>
> (چراغِ دہلی، ص:۳۶)

مالک رام نے مرزا حیرت کا قول نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

> ''میں اس بیان کی کہیں سے تصدیق نہیں کرسکا، نہ ان ہندو شاگرد کا نام ہی معلوم ہوا''۔ (ذکرِ غالب، ص:۱۰۶)
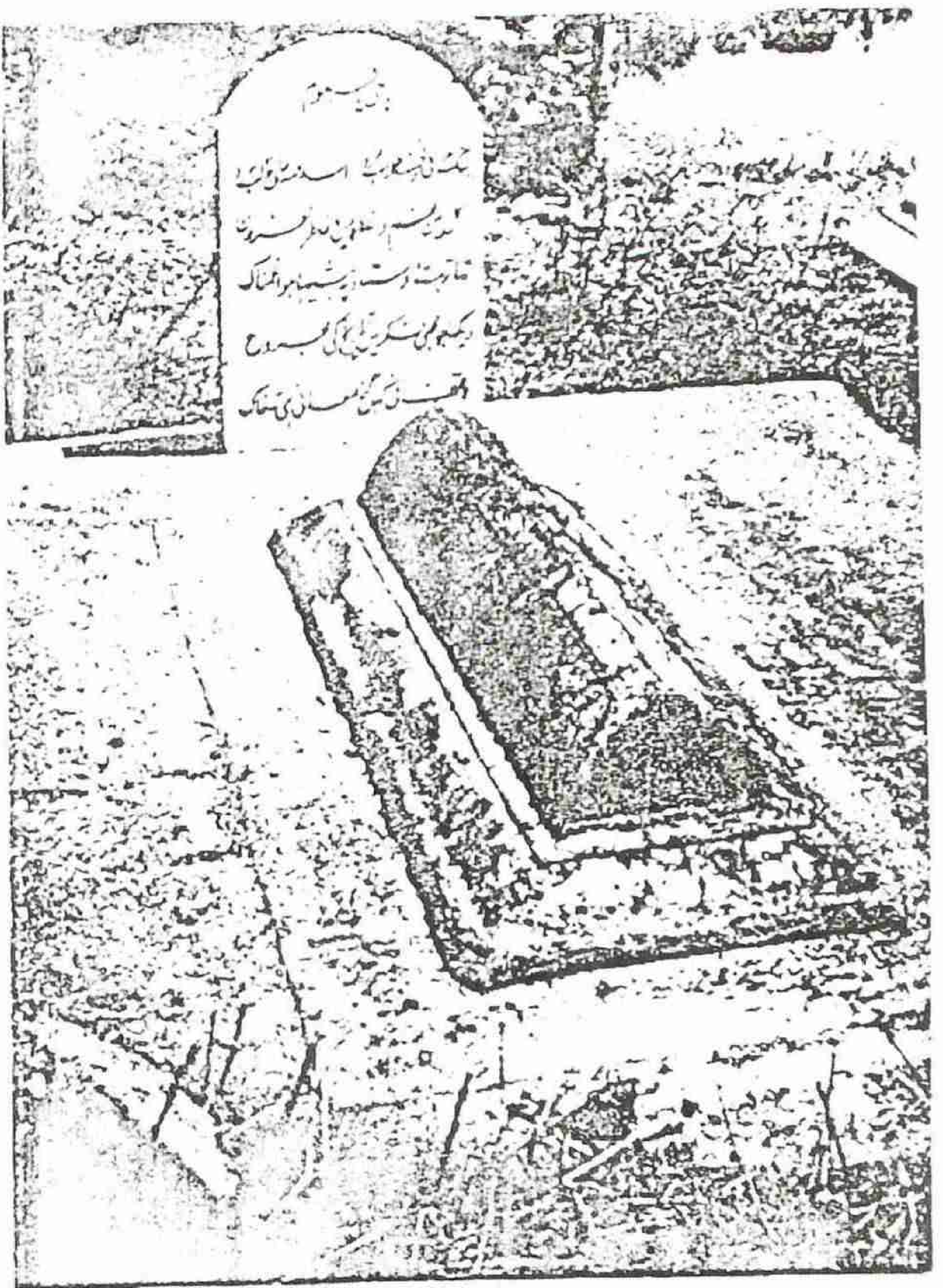
فوٹو مزار غالب قدیم

(ماخذ: کیمرے کے ذریعے لی گئی یہ تصویر مسعود اختر نام کے کسی شخص نے لی تھی
جو ہمایوں لاہور، جون ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی)
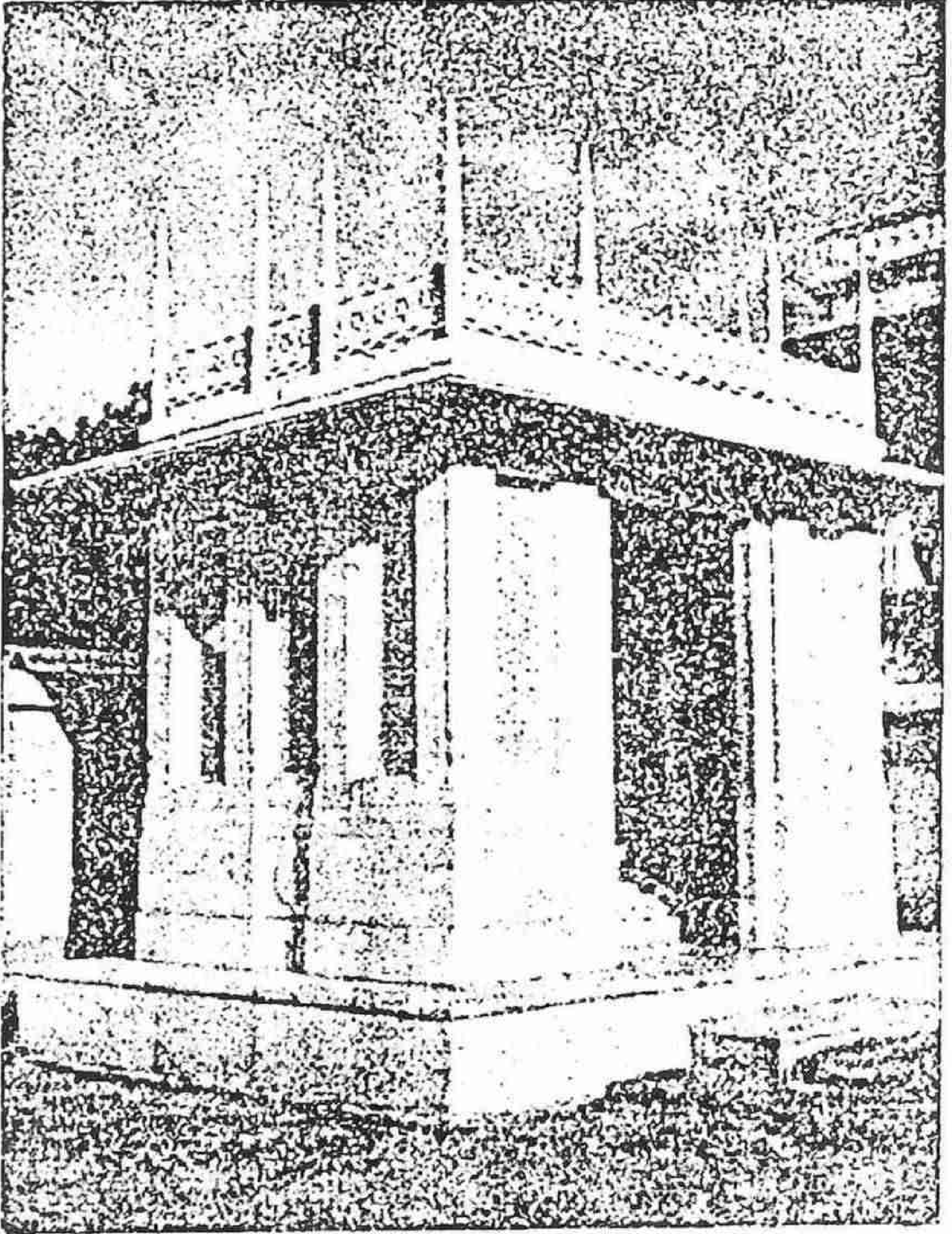
مقبرہ غالب (جدید)

بیسویں صدی کے ربعِ اول میں بعض اہلِ علم و قلم نے متفرق اوقات میں مزارِ غالبؔ پر حاضری دی اور اس حاضری کی روداد کسی خط، مضمون یا یادداشت میں محفوظ کردی۔ ان حضرات (خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر جے مورٹن، حامد علی خاں بار ایٹ لا، نادم سیتاپوری، مولوی بشیر الدین دہلوی، غلام رسول مہر) کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ اُن دنوں غالبؔ کی قبر شکست و ریخت سے دوچار تھی۔ اس کا نام ونشان باقی رکھنے کے لیے اس کے تحفظ کی تدابیر کرنا ناگزیر تھا، چنانچہ مرمّت مزارِ غالبؔ کی اپیل اخبارات کے ذریعے مشتہر کی گئی۔ رفتہ رفتہ اس سادہ سی اپیل نے ایک تحریک کی شکل اختیار کرلی۔

جیسا کہ سطورِ گذشتہ میں مذکور ہوا کہ اس تحریک کا آغاز ایک یورپین ڈاکٹر جے مورٹن ایم ڈی کے ایک انگریزی مراسلے بہ عنوان A NEGLECTED GRAVE سے ہوا جو روزنامہ 'پانیر' الہ آباد کی ۷ رجون ۱۹۱۱ء کی اشاعت میں شامل ہوا۔ اس خط کی تائید میں حامد علی خاں (ف ۱۹۱۸ء، بار ایٹ لا) کا ایک مراسلہ مکتوبہ ۷ رجون ۱۹۱۱ء ڈیلی پانیر کی غالباً ۱۲ رجون کی اشاعت میں شامل ہوا۔ بعد میں ان دونوں مراسلوں کا اردو ترجمہ 'معیار' لکھنؤ کی مئی ۱۹۱۱ء کی اشاعت میں شامل کیا گیا۔ ڈاکٹر جے مورٹن کے مراسلے کا خلاصہ اور اس کی تائید میں ایک طویل مراسلہ سیّد معین الدین شاہجہانپوری (ف ۱۹۴۷ء) نے ہفتہ وار 'ذوالقرنین' بدایوں (۲۸ رجون ۱۹۱۱ء) میں ''تربتِ غالب مظلوم و مرحوم'' کے عنوان سے طبع کرایا۔ اس مکتوب کی اشاعت کے بعد ''ذوالقرنین'' میں نظامیؔ نے مرمت مزارِ غالب کے بارے میں کئی بار توجہ دلائی۔

اُدھر مولانا محمد علی جوہرؔ (ف ۱۹۳۱ء) نے ڈاکٹر مورٹن کے مراسلے سے متاثر ہوکر اپنے اخبار ہفتہ وار 'کامریڈ' کلکتہ میں ''غالبؔ کا مزار'' عنوان سے ایک پُرجوش مضمون لکھا (مطبوعہ ۱۷ رجون ۱۹۱۱ء)۔ ۸ رجولائی ۱۹۱۱ء کی اشاعت میں مولانا محمد علی جوہر نے اسی عنوان سے ایک مضمون اور لکھا جس میں قوم سے چندہ دینے کی اپیل کی اور 'کامریڈ' کی جانب سے مزارِ غالب فنڈ کھولنے کا اعلان بھی کردیا۔ مولانا کی اس اپیل

کے بعد مزارِ غالب فنڈ میں چندہ موصول ہونا شروع ہوگیا۔ لیکن رفتار بہت سست رہی۔ ۸؍جولائی ۱۹۱۱ء سے ۲۵؍نومبر ۱۹۱۱ء تک پانچ ماہ کی لگاتار گزارشات کے نتیجے میں صرف 872 روپے ہی جمع ہو سکے۔ اس رقم سے فوری طور پر مزارِ غالب کی مرمت تو کرائی ہی جاسکتی تھی لیکن لوہارو خاندان کے بعض افراد کو یہ ناگوار خاطر ہوا کہ مزارِ غالب اور ان کے خاندانی قبرستان کی مرمت و درستگی چندے کی رقم سے ہو۔ انھوں نے اعلان کیا کہ یہ خدمت وہ خود انجام دیں گے، لیکن وہ یہ کام نہیں کر سکے۔ غلام رسول مہر نے لکھا ہے کہ مولانا محمد علی جوہرؔ نے اتنا کیا کہ سنگِ مرمر کی ایک لوح دوبارہ بنوا کر نصب کرادی (غالب، ص: ۳۳۹)۔

ماہنامہ 'ادیب' الہ آباد (اجرا جنوری ۱۹۱۰ء) نے بھی غالب میموریل فنڈ کھولا تھا اور ایک خاص رقم بھی جمع کی تھی، لیکن 'ادیب' کے مدیر منشی نوبت رائے نظر (ف ۱۹۲۳ء) کی ادارت سے علیحدگی کے بعد یہ رقم انڈین پریس الہ آباد کے حوالے کردی گئی۔ (نوٹ: العصر، مشمولہ 'ہماری زبان'، دہلی، یکم اگست ۱۹۷۷ء)۔

۱۹۱۶ء میں یہ تحریک ایک مرتبہ پھر دم پکڑ گئی، اس مرتبہ اس تحریک کو دم خم دینے والے نظامیؔ بدایونی تھے۔ انھوں نے اپنے اخبار ''ذوالقرنین'' میں ۷؍اگست ۱۹۱۶ء کو بہ عنوان ''مرزا غالب کے مزار کی مرمّت'' ایک نوٹ لکھا، یہ نوٹ حسبِ ذیل ہے:

> ''کئی مرتبہ ملک کے بعض دیگر معزز اخبارات پانیر وغیرہ اور خاص کر خود ذوالقرنین میں مرزا غالب مرحوم کی قبر کی مرمت کی آواز اٹھائی جاچکی ہے لیکن افسوس کہ اب تک اس کے متعلق کوئی عملی کارروائی نہیں ہوئی۔ ہمدرد مرحوم (صحیح کامریڈ) جب دہلی میں جیتا جاگتا موجود تھا اس وقت غالباً کچھ چندے کا سلسلہ بھی شروع ہوا تھا اس کا بھی کچھ عملی نتیجہ نہ نکلا۔ اس ہفتہ روزنامہ 'کسان' لاہور نے جناب خلیق دہلوی کی ایک پُر درد نظم لکھ کر اس مسئلے کو پھر چھیڑا ہے۔ مرزا مرحوم کا مزار جو ابھی بالکل بے نشان نہیں ہوا اور جو ایک مشہور اور مقدس

درگاہ کے احاطے کے اندر واقع ہے، اس کا مرمت ہوجانا کوئی بڑی بات نہیں اور نہ اس کے لیے کسی خاص چندے اور بڑے بڑے عطیوں کی ضرورت ہے۔ تمام ہندوستان میں دلدادگانِ کلامِ غالب کی تعداد اس وقت کچھ کم نہیں ہے۔ اگر وہ سب تھوڑا تھوڑا چندہ دیں جب بھی یہ کام آسانی سے پورا ہوسکتا ہے۔ میں اپنی طرف سے اردو دیوانِ غالب کے خاص ایڈیشن کی بقیہ ۳۰۰ جلدیں اس ضروری کام کے لیے اس طریقے سے پیش کرتا ہوں کہ وہ تمام اربابِ درد و احساس جو مرزا غالب جیسے اردو ادب کے محسن کی یاد کو زندہ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، اجازت دیں کہ ۸/عصہ (Rs 1.50) میں اردو دیوانِ غالب کا خاص ایڈیشن جو بجائے خود مرزائے مرحوم کی زندہ یادگار ہے اور جو نہایت اہتمام اور خوش سلیقگی سے عالی جناب سرراس مسعود صاحب بی. اے آکسن آئی ای ایس کی تحریک سے شائع کیا گیا ہے۔ کاغذ سفید چکنا، قلم جلی، ٹائٹل خوشنما مع مرزا کے مستند فوٹو کے۔ بذریعہ وی پی ان کے نام نامی پر بھیج دیا جائے اور جس وقت یہ سب کتابیں فروخت ہوجائیں تو کل روپیہ بعد وضعِ کمیشن و مصارفِ ڈاک وغیرہ حضرت خلیق دہلوی یا کسی دوسرے دوست کہ جو دہلی میں مقیم ہوں، سپرد کردیا جائے کہ وہ اس تاجدارِ سخن کے ٹوٹے ہوئے مزار کی جس کا نظارہ اہلِ نظر اور اہلِ دل کے لیے ایک عبرت ناک سین کا کام دیتا ہے، مرمت کراکے آثارِ سلف کی بقا و حفاظت کے فرضِ کفایہ کو انجام دیں۔

خاکسار ایڈیٹر ذوالقرنین بدایوں''

نظامی کا یہ نوٹ ہم عصر اخبارات و رسائل میں نقل ہوا۔ الناظر لکھنؤ، عبرت نجیب آباد نے ستمبر ۱۹۱۶ء کی اشاعتوں میں اسے شامل کیا۔ نظامی کے دیوانِ غالب (۱۹۱۵ء) کی تین سو جلدوں کی کل قیمت (بعد از فروخت) مزارِ غالب کی تعمیر کے لیے نذر کردینے

کے منصوبے کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ بعض دوسرے اخبارات نے بھی اس قسم کی چندہ اسکیموں کا اعلان کیا۔ ماہنامہ 'نظارہ' میرٹھ نے نومبر دسمبر ۱۹۱۶ء کی اشاعت میں ایک اعلان جاری کیا کہ جو حضرات 'نظارہ' میرٹھ کی نئی خریداری قبول کریں گے ان کے چندہ میں سے ایک روپیہ مزارِ غالب کی مرمت کے لیے مخصوص کر دیا جائے گا۔ (العلم، کراچی، غالب نمبر ۱۹۶۹ء، ص: ۱۴۹)

۱۴ر ستمبر ۱۹۱۶ء کو نظامی بدایونی نے ''ایڈیٹوریل نوٹس'' عنوان کے تحت 'ذوالقرنین' میں ایک طویل اداریہ لکھا، اس اداریے میں انھوں نے چند تجاویز پیش کیں۔ اداریہ کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

> ''مرمت مزارِ غالب کے متعلق ہم نے جو تحریک دیوانِ غالب کے خاص ایڈیشن کی کاپیاں دیگر ملک (مراد صوبہ) کے اکثر اخبارات کے ذریعہ پیش کی تھی اس نے تمام قدردانانِ کلامِ غالب کے دلوں میں حرکت پیدا کر دی ہے لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ بعض لوگ اس معاملہ میں اخبارات میں غلط تحریریں شائع کر رہے ہیں۔ ایک تحریر ہم عصر 'کسان' کے پاس کسی شخص نے بھیج دی کہ اس کام کے لیے دہلی میں ایک کمیٹی قائم ہوگئی ہے لیکن بعد کو یہ تحریر فرضی نکلی اور ہم عصر 'کسان' کو اس کی تردید چھاپنا پڑی ... البتہ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ نگرانی اور دیکھ بھال کے لیے حضرت خواجہ حسن نظامی اور ملّا واحدی صاحب سے بہتر دوسرے اشخاص دستیاب نہیں ہوسکتے۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کام کے لیے کمیٹی ضرور قائم ہو اور اس میں حضرت خواجہ صاحب، جناب ملّا صاحب، حضرت طالب، جناب خلیق صاحب اور جناب خلیقی ضرور شریک ہوں۔ اس طرح چندہ دہندگان کو بھی اطمینان رہے گا اور کام کرنے والوں کی مستعدی سے فائدہ اٹھانے کا بھی موقع ملے گا۔ اس سے پہلے اس تحریک میں جو رقمیں ضائع ہوچکی

ہیں ان کو دیکھتے ہوئے بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف گوشوں کے چندہ دینے والے اس معاملے کو کسی ایک فرد کے ہاتھ میں دینا پسند کریں۔

ہم کو جناب خلیق کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ پچھلے تحویلداروں سے رقم کا مطالبہ کیا جائے۔ اس وقت کوہ کندن و کار برآوردن کا موقع نہیں ہے، کرنا وہ چاہیے جس سے کوئی عملی نتیجہ پیدا ہو...

ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ دہلی میں حکیم حاذق الملک صاحب بہادر اس فنڈ کی نگرانی کا کام اپنے ذمہ لینے کے لیے تیار ہیں۔ اب صرف یہ ضرورت ہے کہ دو ایک صاحب مرمت و تعمیر و نگرانی کا کام اپنے ذمہ لے لیں۔ صرف ایک ہزار روپیہ کے کام کا فی الحال تخمینہ کیا جاتا ہے''۔ (ذوالقرنین، ۱۴ر ستمبر ۱۹۱۶ء)

حامد علی خاں لکھنوی (بار ایٹ لا) کا ایک مراسلہ ماہنامہ 'معیار' لکھنؤ (جنوری ۱۹۱۷ء) میں شائع ہوا۔ اس مراسلے پر 'معیار' کے مدیر عزیز لکھنوی (ف ۱۹۳۵ء) کا ایک تائیدی نوٹ ہے اور نوٹ کے آخر میں ان کے چند شعر بھی۔ اس مراسلے میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ دہلی میں مزارِ غالب کی مرمت کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دے دی گئی ہے جس کا خزانچی حکیم اجمل خاں کو بنایا گیا ہے۔ اس خط کے ذریعے عوام و خواص سے یہ اپیل بھی کی گئی ہے کہ وہ اپنا چندہ براہِ راست حکیم اجمل خاں محلہ بلّی ماران دہلی کو بھیج دیں۔

یہ تحریک جس زور و شور کے ساتھ برپا کی گئی تھی، ادب، صحافت اور قوم و ملّت کے ناموران نے جس طرح اس کو آگے بڑھایا، مثلاً حامد علی خاں لکھنوی بار ایٹ لا، مولانا محمد علی جوہر، خواجہ حسن نظامی، حکیم اجمل خاں، خلیق دہلوی اور بعض دوسرے افراد۔ ان حضرات کو عملی طور پر کیا مشکلات پیش آئیں جو وہ خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ رقوم جو ملک بھر سے جمع کی گئیں اس کو کہاں اور کس طور استعمال کیا گیا یہ سوالات ہنوز تشنۂ تحقیق ہیں۔

۱۹۱۹ء میں مولوی بشیر الدین دہلوی نے بڑی دل سوزی کے ساتھ اس تحریک کا ماتم کیا

ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''غالبؔ کے ایک نہیں دو نہیں، ہزاروں شاگرد تھے جن میں سے اب بھی بہت سے کھاتے پیتے خوش حال ہیں جن کو دعویٰ غالبؔ سے تلمّذ کا ہے۔ اگر تھوڑا تھوڑا بھی دیتے تو قبر کی یہ حالت نہ ہوتی۔ کچھ دن ہوئے باسی کڑھی میں اُبال آیا تھا، غلغلہ سنا تھا کہ غالبؔ کی قبر بن رہی ہے، چندہ ہو رہا ہے اور کچھ چندا ہوا بھی مگر جس طرح مسلمانوں کے اور کام اینڈ رہ جاتے ہیں یہ دفتر بھی گاؤ خرد ہو گیا''۔
>
> (واقعات دارالحکومت، دہلی، ج ۲، ص: ۸۷۲)

۱۹۳۲ء میں یہ تحریک ایک مرتبہ پھر سے سرگرمِ عمل ہوئی۔ نظامیؔ نے بھی ''مرزا غالب کے مزار کی تعمیر'' کے عنوان سے 'ذوالقرنین' کی ۲۸؍ اپریل ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں ایک تحریر لکھی، لیکن اولین دور کے تجربات کے پیشِ نظر یہ تحریک بہت سست رفتار رہی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کو مرکزی قیادت حاصل نہیں ہو سکی اور مختلف علاقوں میں یہ مختلف انداز میں کام کرتی رہی۔ نظامیؔ نے ابنائے قوم کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر اس تحریک کو تعاون دینے کی کوشش کی لیکن قیادت سے محروم یہ تحریک کسی طور کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکی۔

غالبؔ کے سلسلے میں نظامیؔ کی جملہ خدمات اپنے عہد اور اس عہد کے وسائل کے لحاظ سے تاریخ ساز ہیں اور غالب شناسی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

غالبؔ اور نظامی پریس

نظامیؔ بدایونی اور نظامی پریس نے کلامِ غالبؔ کی ترویج و اشاعت میں قابلِ ذکر حصہ لیا ہے۔ غالبؔ کی تصانیف 'تلامذۂ غالب' اور غالب سے نسبت رکھنے والے دوسرے افراد و اشخاص کی کتب بھی شائع کر کے غالبیات میں اضافہ کیا ہے۔ سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

"کلامِ غالب کی ترویج میں نظامی پریس بدایوں کے مالک نظامیؔ بدایونی کا بھی قابلِ قدر حصہ ہے"۔

(غالب مدح و قدح کی روشنی میں، ج/۱، ص: ۲۳۰)

اسی سے کچھ ملتی جلتی رائے کا اظہار مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"(نظامی بدایونی) نے دیوانِ غالب اردو سادہ اور باشرح کے متعدد بہترین نسخے شائع فرما کر ملک پر بہت بڑا ادبی احسان کیا تھا"۔

(دیوانِ غالب نسخہ بدایوں، نیا دور، لکھنؤ، جنوری ۱۹۷۱ء)

نظامی پریس جون ۱۹۰۵ء میں محلّہ سوتھا بدایوں میں قائم کیا گیا۔ ابتدا میں بغلی داب کے دو دستی پریس تھے۔ ۱۹۰۷ء میں مزید دو پریس اضافہ کیے گئے۔ ۱۹۲۰ء تک
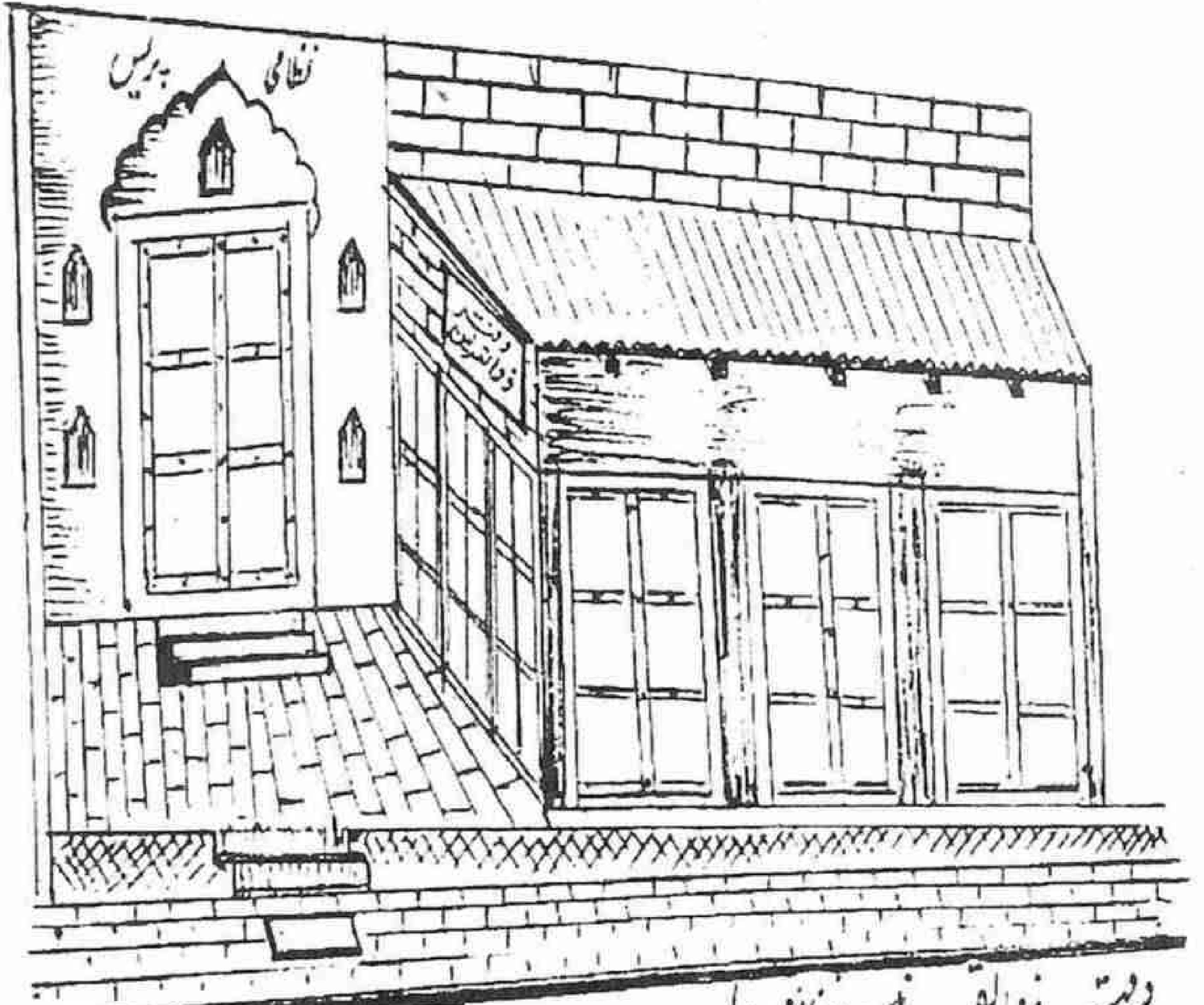
نظامی پریس بدایوں

(ماخذ: نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات، شمس بدایونی، دہلی ۱۹۹۵ء)

ان پریسوں کی تعداد آٹھ ہوگئی۔ ۱۹۲۹ء میں ریڈ کلف الیکٹرک لیتھو مشین لگائی گئی۔ نظامیؔ کے پوتے مونس نظامی صاحب فرماتے ہیں کہ دستی پریسوں میں ایک بہت عمدہ پریس 'نامی پریس کانپور' سے خریدا گیا تھا۔ اسی دستی پریس سے 'دیوانِ غالب' کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا (۱۹۱۵ء)۔

ادب اور مختلف علوم وفنون پر نظامی پریس سے کم وبیش پانچ ہزار اردو کتب چھپ کر شائع ہوئیں۔ تقریباً چار سو کتب ناشر کے طور پر بھی اس پریس نے شائع کیں۔ متعدد اشاعتی سلسلے بھی اس پریس نے قائم کیے، مثلاً:

نظامی پریس کی ایک آنہ لائبریری (۱۹۰۹ء تا ۱۹۳۰ء)

سلسلۂ آصفیہ (۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۵ء)

کلامِ اساتذۂ اردو (۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۰ء)

غالبؔ سے متعلق کتب کی اشاعت کو کسی خاص سلسلے کا عنوان نہیں دیا گیا۔ وہ ان تینوں سلسلوں کے تحت بھی شائع ہوئیں۔ مثلاً 'دیوانِ غالب' طبع پنجم ۱۹۲۳ء سلسلۂ آصفیہ کے تحت شائع ہوا۔ یہ دیوان معرا (سادہ) اور حاملِ فرہنگ ہے۔

'انتخاب غزلیاتِ غالب' مرتبہ سر شاہ سلیمان ۱۹۲۵ء میں سلسلۂ کلامِ اساتذۂ اردو کے تحت شائع ہوا۔

'مرثیہ مرزا غالب' از قلم حالیؔ پہلی مرتبہ ۱۹۱۵ء میں ایک آنہ لائبریری سلسلے کے تحت شائع ہوا۔

نظامی پریس نے جس طرح جدید ترتیب، صحتِ متن، مروّجہ معیاری املا، ظاہری دلکشی وزیبائی کو ملحوظ رکھتے ہوئے غالبؔ اور غالبیات کی نسبت سے سلسلہ وار کتب شائع کیں، وہ کلامِ غالب کی ترویج اور روایتِ غالبؔ کی توسیع کا سبب بنیں۔ بایں سبب نظامی پریس کی اس اشاعتی خدمت کو غالبیات کے فروغ کا ایک حصہ تصور کیا گیا۔ سطورِ ذیل میں نظامی پریس سے شائع ہونے والی کتب کا تعارف پیش کیا جارہا ہے:

۱- 'انتخاب غزلیاتِ غالب' مرتبہ سر شاہ سلیمان

سرشاہ سلیمان (ف ۱۹۴۱ء) کا مرتبہ غالبؔ کی غزلیات کا یہ انتخاب ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ یہ انتخاب میری نظر سے نہیں گزرا۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنی کتاب 'غالب اور عصرِ غالب' (ص: ۲۱۷) میں کتاب لاہور، غالب نمبر، فروری مارچ ۱۹۷۰ء (ص: ۴۲) کے حوالے سے اس کا اندراج کیا ہے۔

۲- 'مرثیۂ غالب' مولانا الطاف حسین حالیؔ

حالیؔ (ف ۱۹۱۵ء) کا معروف مرثیہ۔ نظامی پریس کی ایک آنہ لائبریری سلسلے کے تحت پہلی مرتبہ ۱۹۱۵ء میں ۸ صفحات پر طبع ہوا۔ اس پر نظامی کی تمہید ہے۔ دوسری مرتبہ ۱۹۲۷ء میں بھی یہ اسی سلسلے کے تحت شائع ہوا۔

۳- 'نکاتِ غالب' نظامی بدایونی

مرزا غالبؔ کی سوانح کو ان کے خطوط سے مرتّب کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے تین ایڈیشن شائع ہوئے:

طبعِ اول	۱۹۲۰ء	صفحات ۷۲	سائز $\frac{۲۰×۳۰}{۳۶}$ کتابی
طبعِ دوم	۱۹۲۴ء	// ۶۸	// //
طبعِ سوم	۱۹۵۹ء	// ۸۰	// //

۴- 'روحِ کلامِ غالب' مرزا عزیز بیگ مرزا

یہ غالبؔ کی ۱۳۶ غزلیات کی تضمینوں پر مشتمل ہے۔ تضمینیں بہ صورتِ خمسہ کی گئی ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں ۸/۱۷×۲۷ سائز کے ۲۸۶ صفحات پر طبع ہوئی۔ ابتدا میں آرٹ پیپر پر غالبؔ اور کتاب کے مصنف کا فوٹو بھی شامل ہے۔ نظامیؔ بدایونی کے مقدمہ نے اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کیا ہے۔

مرزا عزیز بیگ مرزاؔ (ف ۱۹۲۰ء) حسیب الدین سوزاںؔ سہارنپوری (تلمیذ غالبؔ) کے شاگرد ہیں۔

۵- 'دیوانِ معروف' نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ

معروفؔ (ف ۱۸۲۷ء) غالبؔ کے خسر تھے۔ انھوں نے دو دیوان یادگار

چھوڑے، جن میں سے ایک دیوان مرزا نصر اللہ خاں[1] صدر محاسب حکومت حیدر آباد کی کوشش سے ۱۹۳۵ء میں نظامی پریس سے طبع ہوا۔ دیوان کے آخر میں معروف کی تصنیف ''تسبیح زمرد'' بھی شامل ہے۔

اس نسخے کی صحت مولانا عبدالحامد قادری بدایونی (ف ۱۹۷۰ء) نے کی تھی اور انہی کے مقدمے کے ساتھ یہ نسخہ طبع ہوا تھا۔ دیوان کے آخر میں مرزا سعید الدین خاں طالب (ف ۱۹۲۵ء)، احسن مارہروی (ف ۱۹۴۰ء)، ضیاء القادری (ف ۱۹۷۰ء)، مجتہد الدین احمد عیش بدایونی (ف ۱۹۵۵ء) کی تقریظیں اور تبصرے شامل ہیں۔ سائل دہلوی (ف ۱۹۴۵ء)، ضیاء القادری، قمر بدایونی (ف ۱۹۴۱ء)، جامی بدایونی (ف ۱۹۶۵ء) کے تاریخی قطعات جو طباعت سے متعلق ہیں، شامل ہیں۔ مطبوعہ دیوان ۸/ ۲۹×۲۲ سائز کے ۲۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

۶۔ 'کلیاتِ شیفتہ وحسرتی' نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

شیفتہ (ف ۱۸۶۹ء) کے اردو و فارسی نثر و نظم کا کلیات ہے۔ یہ کلیات ۸/ ۲۹×۲۲ سائز کے ۴۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں دیوانِ اردو کے لیے ۱۲۴، دیوانِ فارسی کے لیے ۱۶۰، رقعاتِ فارسی کے لیے ۱۶۶ اور مقدمہ کے لیے ۹۰ صفحات مختص کیے گئے ہیں۔ مقدمہ نگار نظامی بدایونی ہیں۔ نظامی نے اس کلیات کو نواب حاجی محمد اسحاق خاں کی فرمائش پر ۱۹۱۶ء میں شائع کیا تھا۔

۷۔ 'عرفان عزیز' مرتبہ خصلت حسین صابری

یہ غالب کے شاگرد شاہ عزیز صفی پوری (ف ۱۹۲۸ء) کے کلام کا انتخاب ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں اور دوسرا ۱۹۴۸ء میں اسی پریس سے چھپ کر شائع ہوا۔

۸۔ 'رقعاتِ مدہوش' سخاوت حسین مدہوش

تلمیذ غالب خان بہادر سخاوت حسین مدہوش بدایونی (ف ۱۹۰۱ء) کے ۴۶ فارسی اور ۱۳ اردو رقعات کا مجموعہ ہے۔ طبع دوم ۱۹۶۳ء میں مع تعارف مدہوش کے نواسے حامد سعید خاں لودی کتابی سائز کے ۷۱ صفحات پر اسی پریس سے شائع ہوا۔

---

[1] مرزا نصر اللہ خاں ابن مرزا محمد سعید خاں ابن مرزا علی بخش خاں ابن مرزا الٰہی بخش خاں معروف۔

مرثیہ غالب

عکس، مرثیہ مرزا غالب

(مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں)

رقعاتِ مدہوش

مسمّٰی بہ

شرابُ الکوثر

معہ تعارف از

حاجی حامد سعید خان صاحب بدایونی

۱۹۶۳ء

عکس، رقعات مدھوش

(مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں)

مضمون اے ضمیر بیچ ہمہ اس کو سمجھیے گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

روح کلام غالب

المعروف بہ

تفسیر کلام غالب

یعنی مرزا اسد اللہ خاں غالب کے اردو دیوان کی تضمین

مصنفہ مرزا عزیز بیگ المتخلص بہ مرزا سہارنپوری شاگرد حضرت زار سہارنپوری ارشد تلامذہ مرزا غالب

حسب سعی

مرزا ظفر بیگ صاحب سہارنپوری

نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوا

(محمد حمید الدین پرنٹر)

سنہ ۱۹۳۵ء

قیمت فی جلد

عکس، روح کلام غالب

(مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں)

باب پنجم

بدایوں میں غالب کا احتساب و موازنہ

بہترین غزل گو

اثر خامہ

قاضی غلام امیر صاحب اسیر بدایونی

مختار عدالت

اُردو کے قدیم خادم رسالہ الناظر۔ لکھنؤ کے انعامی مقابلہ کا یہ مضمون

الناظر بابتہ اکتوبر و نومبر سنہ ۱۹۲۶ء میں شایع ہوا تھا

الناظر پریس واقع لکھنؤ میں طبع ہوا

پرنٹر: اسحٰق علی علوی

جون سنہ ۱۹۴۱ء

بار دوم

عکس سرورق، بہترین غزل گو

بیسویں صدی کے ابتدائی تین دہوں میں مغربی تعلیم یافتہ افراد نے غالب کا مطالعہ جن نئی جہتوں اور زاویوں سے کیا، اس نے غالب فہمی اور غالب شناسی کی ایک نئی فضا ہموار کی۔ اس فضا نے مشرقی تعلیم یافتہ افراد میں ایک ردعمل پیدا کیا۔ غالب شکن (۱۹۳۴ء) تصنیف اسی ردعمل کا نتیجہ تھی۔ لیکن غالب کی لگاتار بڑھتی مقبولیت وعظمت کے بعض اہل قلم صرف اس لیے شاکی تھے کہ یہ عظمت تمام تر غالب کے اردو کلام کے حوالے سے تھی۔ ان بزرگوں کی نظروں میں غالب فارسی شاعر کی حیثیت سے تو عظمت کے مستحق قرار دیے جاسکتے ہیں لیکن بحیثیت اردو شاعر، میرؔ، سوداؔ، مومنؔ اور ذوقؔ جیسے غزل گو شعرا کے ہوتے وہ اس عظمت کے جائز مستحق ہرگز قرار نہیں دیے جاسکتے۔ اسی سوچ کے تحت بدایوں میں بھی حسب ذیل تین تحریریں سپردِ قلم کی گئیں:

۱۔ بہترین غزل گو قاضی غلام امیر نقاد ۱۹۲۶ء (موازنہ ذوق وغالب)

۲۔ تبصرہ (یعنی مقدمہ مومن و غالب) منشی شاکر حسین نکہت سہسوانی، ۱۹۳۱ء

۳۔ مومن و غالب، اعجاز احمد معجز سہسوانی، ۱۹۳۱ء

مذکورہ صدر دو تحریروں کی حیثیت مقالے کی سی ہے اور آخر الذکر کی کتاب کی۔ ان تحریروں میں غالب کا رد نہیں کیا گیا بلکہ سنجیدگی کے ساتھ غالب کے کلام کا موازنہ مومن و ذوق کے کلام سے کر کے، غزل کے روایتی جائزے اور حالی، بجنوری و شارحین غالب کے بیانات کی روشنی میں منطقی استدلال کے ساتھ تجزیے کے عمل سے گزر کر ایک واضح نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تحریروں سے اتفاق کیا جائے یا اختلاف، لیکن مطالعہ غالب کے سلسلے میں اِن مصنفین کی سنجیدہ علمی کوشش کے اس عمل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان تحریروں کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ یہ غالب شکن (۱۹۳۳ء) کی اشاعت سے قبل منصۂ شہود پر آئیں، اور یہ تحریریں اپنے مصنفین کے علمی تفاخر، تعلّی آمیز نثر، استہزا و تمسخر سے بھی بے نیاز ہیں۔ جس کے سبب غالب شکن کو تنقیدی ادب میں کمزور خیال کیا گیا۔

سطور ذیل میں ان تحریروں کا تعارف اور کسی قدر ان کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

بہترین غزل گو

الناظر لکھنؤ نے جنوری ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں ایک عنوان دے کر انعامی مضمون لکھنے اور کامیاب مضمون کو شائع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ مضمون کا عنوان تھا "عہد میر تقی میرؔ کے بعد اِس وقت تک غزل گوئی میں کون شاعر سب سے زیادہ کامیاب ہوا ہے"۔ اس عنوان کے بعد مزید ہدایات و شرائط تھیں۔ قاضی غلام امیر نقاد امیرؔ بدایونی نے باوجود کبر سنی اس موضوع پر ایک مقالہ کی صورت میں اظہار خیال کیا۔ بقول خود ان کے مقابلہ کا ذوق یا انعام کے لالچ نے انہیں اس طرف متوجہ نہیں کیا بلکہ:

> آجکل دنیائے شاعری میں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی خودروی، زبان اردو کو شدید نقصان پہنچا رہی ہے اور میں مدت سے اسے محسوس کر رہا ہوں۔ ممکن ہے غزل گوئی اور غزل سرائی پر میری ناچیز تنقید ان حضرات کی رہنمائی کا باعث ہو۔ اسی خیال سے بحیثیت زبان

اردو کے ایک ادنیٰ خادم کے میں نے اس مضمون پر قلم اٹھانے کی جرأت کی ہے۔(ص:۱)

قاضی صاحب کا یہ مقالہ انعام کا مستحق ٹھہرا اور یہ الناظر لکھنؤ کی اکتوبر، نومبر ۱۹۲۶ء کی اشاعت میں شامل ہوا۔ بعد میں کتابی صورت میں پہلی بار ۱۹۳۱ء سے پیشتر شائع ہوا۔ (یہ ایڈیشن میری نظر سے نہیں گزرا) دوسری بار جون ۱۹۴۱ء میں الناظر پریس لکھنؤ سے کتابی صورت میں ۴۸ صفحات پر شائع ہوا۔ موخرالذکر اشاعت ہی میرے پیش نظر ہے۔

کتاب مذکور میں بہترین غزل گو ذوقؔ اور ذوقؔ کے بعد اردو غزل کا سب سے زیادہ کامیاب شاعر غالب کو قرار دیا گیا ہے (ص ۴۴)۔ لیکن بنیادی طور پر اس کتاب کی کیفیت ''موازنہ ذوق و غالب'' کی ہے۔

کتاب کا متن ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے (آخر کے ۴ صفحات اشتہاراتِ کتب کے لیے مخصوص ہیں) شروع کے ڈھائی صفحات تمہید پر مشتمل ہیں۔ صفحہ ۳ تا ۱۶ ذوق کی شاعری کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ صفحہ ۱۷ تا ۴۴ ''مرزا غالب کی شاعری'' عنوان کے تحت غالب کی شاعری زیر بحث لائی گئی ہے۔

تمہید میں انہوں نے اختصار کے ساتھ مقالہ لکھنے کا سبب، غزل کی تعریف، اُس کے موضوعات پر معروف غزل گو شعرا کے اسماء درج کر کے اس ضمن میں اہل دہلی و لکھنؤ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے ذوق پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ذوق کے متعدد اشعار درج کر کے ان کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ یہ خوبیاں کیفیت، لطافت، سلاست بیان و لطف زبان، تخیل، بندش، مضمون کی بلندی، قادرالکلامی، اور تشبیہ کی لطافت جیسی قدیم تنقیدی اصطلاحات ولفظیات سے ظاہر کی ہیں۔ غالب کے چند ہم مضمون اشعار درج کر کے دونوں کے پیرایہ بیان اور علوے خیال کو بھی دکھایا ہے۔ یہ حصہ ذوق پر مزید توجہ کا طالب تھا۔ اس گفتگو کے بعد ذوق کے ۱۴۹ اشعار بلا تبصرہ نقل کر کے محاورات و امثال نظم کرنے میں ذوق کی قادرالکلامی اور ملکہ شاعری پر، اپنے

قارئین کو متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

''مرزا غالب کی شاعری'' عنوان کے تحت قاضی صاحب نے دراصل ذوق کا غالب سے موازنہ کیا ہے۔ اور اس کو لکھنے میں اپنا پورا زور قلم صرف کر دیا ہے۔ اس حصہ کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس مقالہ کو لکھنے کا مقصد ہی دونوں کا موازنہ وتقابل کرنا تھا۔ قاضی صاحب نے اول حالی کے متعدد بیانات درج کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مرزا نے ریختہ گوئی کو کبھی بھی اپنا فن قرار نہیں دیا۔ بلکہ تفنّن طبع یا دوستوں کی فرمائش اور دربار مغلیہ کی تعمیل ارشاد میں بس یونہی اردو غزل کہہ لیا کرتے تھے۔ انہوں نے اردو کلام کی بابت غالب کے فارسی اشعار، میر کی پیشنگوئی اور مکتوب غالب بنام منشی نبی بخش سے بھی اپنے اس خیال کو تقویت دی ہے۔ انہوں نے حالی کے اس بیان کو غلط قرار دیا ہے کہ کسی خاص زمانہ میں مرزا نے اپنے طرز قدیم کو چھوڑ دیا تھا اور وہ سہل ممتنع میں اور قریب المعنی اشعار کہنے لگے تھے۔ ان کی بحث کا لبّ لباب یہ ہے کہ مرزا غالب نے اپنی شاعری کے ہر دور میں اغلاق و اہمال سے بھرپور شعر بھی کہے اور سادہ و سہل بھی۔ حالی کی ''یادگار غالب'' کے متعدد بیانات سے انہوں نے اپنے اس خیال کو مدلل کر کے جو نتیجہ نکالا ہے وہ یہ ہے:

> فی الحقیقت مرزا کو اردو غزل اور اردو شاعری کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگر مرزا کا یہ قصد ہوتا کہ وہ اردو زبان میں فارسی ترکیبوں کے اضافہ سے زبان اردو کو وسعت دیں گے تو بھی میرزا مبارکباد کا مستحق تھا۔ اگر میرزا چاہتا تو اپنی توجہ سے غزل اردو کو معراج کمال پر پہنچا سکتا تھا۔ لیکن میرزا نے فارسی شاعری کے جنون میں اردو شاعری سے شدید بیگانگی کا اظہار کیا۔ نثر اردو میں بھی کبھی اس بے التفاتی کا ثبوت دیا۔ جس کے نمونے آب حیات، ص ۴۸۳ پر آزاد مرحوم نے دیے ہیں۔ مثلاً ''منشی نبی بخش[1] تمہارے خط نہ لکھنے کا گلہ رکھتے ہیں۔ (گلہ دارند)

---

[1] منشی نبی بخش حقیر اکبرآبادی (ف ۱۸۶۰ء) غالب کے شاگرد اور مکتوب الیہ۔

منشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنا اور ہم کو یاد نہ لانا۔ (یاد نیا دردن) جو آپ پر معلوم ہے وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔ (ہر چہ برشما منکشف است بر من مخفی نماند) یہ غنیمت تھا کہ میرزا کے ہم عصر میرزا کے کلام کو کوئی وقعت نہ دیتے تھے۔ اگر یہ ساری جماعت میرزا سے متفق الرائے ہوجاتی تو اردو جو فارسی زبان سے نکلی تھی پھر فارسی زبان میں جذب ہوجاتی اور آج ادب اردو کا نام ونشان بھی باقی نہ ہوتا۔" (ص ۲۰،۲۱)

اس نتیجہ تک پہنچ جانے کے بعد انہوں نے غالب پر لکھے گئے سرمایہ کتب کا جائزہ لیا ہے۔ اُس دور میں لکھی گئی شروح، شوکت میرٹھی، نظم طباطبائی، حسرت موہانی، سہا مجددی، بیخود موہانی کا تذکرہ اور ان پر تبصرہ کرتے ہوئے شرح طباطبائی میں غالب کے سہل کلام کے جو بلند و بالا مطالب درج ہوئے ہیں ان کی گرفت کی ہے اور ان مطالب کو لفظوں سے بعید بتایا ہے۔ مثال میں آٹھ شعر مع مطالب شرح طباطبائی سے درج کیے ہیں اور ان پر جرح کی ہے۔

قاضی صاحب نے اپنی اس بحث کو منطقی بنانے کے لیے کلام غالب کی دوطور پر تقسیم کی ہے۔ مشکل کلام (ص:۲۶) اور آسان کلام (ص:۳۱)۔ انہوں نے دیوان اردو کے نصف حصہ کو مشکل کلام کے تحت دکھایا ہے جسے وہ دوراز معانی یا معانی سے خارج قرار دیتے ہیں اور نصف کلام کو آسان کلام کے زمرے میں رکھا ہے لیکن اسے بھی وہ اردو شاعری کے مروجہ میلاناتِ قواعد، محاورہ و روزمرہِ اردو کے خلاف پاتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں:

"مرزا غالب کا وہ کلام جس کو بے معنی کہا جاتا ہے ہر قسم کی تنقید سے مستغنی ہے۔ شارحین دیوان غالب خواہ میرزا کی ہمدردی میں یا اپنی اعلیٰ ذہنیت کے اظہار میں متواتر کوشش فرمارہے ہیں کہ میرزا کے اس کلام کو معانی سے ہم آغوش کریں۔ ممکن ہے کہ کسی زمانے میں کسی حد

تک کوئی شارح کامیاب ہوجائے لیکن میں میرزا کے اس کلام کو اگر
اس میں معانی مستور بھی ہوں بے نقاب کرنے کی کوشش نہیں کروں
گا۔...قارئین کرام اور ناقدین عظام خود فیصلہ فرمائیں کہ یہ مشکل کلام
اگر معانی سے بیگانہ بھی نہیں ہے تو بھی میرزا کو غزل اردو کا کامیاب
شاعر ثابت کرسکتا ہے یا نہیں۔(ص:۲۶)

خواجہ (حالی) کی رائے میں میرزا کا آخرالذکر کلام جو بے راہ
روی چھوڑ کر لکھا گیا میرزا کی شاعری کا مایہ ناز ہے، وہ نزاکتوں کا مخزن
ہے۔ عام خیالات و محاورات سے علیحدہ ہے مضامین کے لحاظ سے
اچھوتا ہے...

مجھے افسوس ہے کہ آسان کلام میں عموماً وہ خوبیاں نہیں ہیں جن کو
خواجہ نے اپنے حسن ظن سے میرزا کے کلام میں موجود فرض کرلیا ہے۔
میرزا کے کلام سے تخمیناً دو سو اشعار میں ایسے منتخب کر چکا ہوں جن کی
بندش اور تخیل عامیانہ ہے۔ مضامین پامال شدہ ہیں۔اور ندرت و
جدّت کا کہیں پتا تک نہیں ہے۔'' (ص:۳۰)

اس کے بعد قاضی صاحب نے تقریباً ۱۳۹ اشعار درج کر کے ان پر نقد کیا ہے اور
ان کو کمزور قرار دیا ہے۔

قاضی صاحب کا قلم سطور بالا تک سنجیدہ رہا۔اس بحث کے اندراج کے بعد یکا یک
ان کا قلم مناظراتی رنگ اختیار کر گیا اور انہوں نے غالب پر لکھنے والوں کو بیک قلم
''مرزا نواز جماعت'' کے لقب سے ممیّز کرڈالا، اس مرزا نواز جماعت کو انہوں نے تین
قسم کے لوگوں پر مشتمل دکھایا ہے:

قسم اول: وہ لوگ جو میرزا کے کلام کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں مگر شریف
النفس ہیں۔ لہٰذا صرف میرزا کے کلام کی خوبیوں کو دیکھتے ہیں۔ عیبوں پر پردہ ڈالتے
ہیں۔ان میں قابل ذکر مولانا حالی ہیں۔

قسم دوم: جو میرزا کے شدید عقیدت مند ہیں اور میرزا کو بہترین شاعر مانتے ہیں مگر زبان اردو کے بھی بہی خواہ ہیں۔ لہٰذا مرزا کی لغزشوں کو تاویلات و تمثیلات سے حق بجانب ٹھہراتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں بالخصوص بیخود موہانی کی شخصیت قابل تذکرہ ہے۔

قسم سوم: میں وہ اشخاص ہیں جنہوں نے یورپ یا ہندوستان میں مغربی علوم حاصل کیے۔ مگر شاعری کے دلدادہ ہیں اور غالب کو شیکسپیر اور گیٹے کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کا علم بردار انہوں نے ڈاکٹر بجنوری کو قرار دیا ہے۔

بعد ازاں انہوں نے نسخہ حمیدیہ (ص ۲۹ تا ۴۲) اور بجنوری کی محاسن کلام غالب (ص: ۴۲ تا ۴۴) پر بھی بھرپور تنقید کی ہے۔ انہوں نے غالب کے فارسی شعر:

غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

''میرزا تو نہایت لطیف طرز میں یہ کہہ رہا ہے کہ فن سخن کو دین فرض کرلیں تو میرا دیوان فارسی کتاب الہامی ہے۔ مگر ڈاکٹر بجنوری نے بغیر کسی شرط اور قید کے استعارتاً نہیں بلکہ حقیقتاً مقدس وید اور دیوان غالب (اردو) کو ہندستان کی الہامی کتاب قرار دیا... میرزا نے اپنے کلام فارسی کو کتاب ایزدی کہہ کر اس کی فوقیت میں مبالغہ کیا تھا لیکن ڈاکٹر مرحوم نے میرزا کے کلام اردو کو الہامی قرار دے کر میرزا کو پیغمبر سخن کہہ دیا۔'' (ص: ۴۰)

اس تمام پُر زور و پُر اثر تنقید کے بعد انہوں نے آخر میں لکھا:

''قارئین کرام! آپ کا تعارف مرزا نواز جماعت سے ہوگیا۔ اس جماعت کی جدوجہد نے نثر اردو پر بھی زبردست اثر کیا ہے اور عجب نہیں کہ وہ بھی الہام (اہمال) کا درجہ حاصل کرلے... ان حالات کو دیکھتے ہوئے ایک خادمِ زبان اردو کا فرض تھا کہ وہ عام و خاص کو

ان خطرات سے آگاہ کردے جو زبان اردو کی ترقی میں سدّ راہ ہیں۔
ورنہ میرزا غالب کو دنیائے شاعری سے رخصت ہوئے ۵۷ برس
ہو چکے۔ مرحوم کے کلام پر اس قدر سخت تبصرے کی ضرورت نہیں تھی۔''
(ص: ۴۳، ۴۴)

قاضی غلام امیر نقاد ولد غلام شبیر۔ نسبًا شیخ صدیقی حمیدی تھے۔ نام کے ساتھ نقاد کا ایزاد اسی طرح تھا جس طرح احمد شاہ بخاری کے نام کے ساتھ پطرس کا اضافہ۔ تخلص ان کا امیرؔ تھا۔ رؤسائے بدایوں میں شمار تھا۔ نغز گو شاعر تھے۔ الناظر (لکھنؤ)، تسنیم (آگرہ)، نقیب (بدایوں) میں ان کا کلام نظر سے گزرا۔ جنگ بلقان کے سلسلہ میں ۱۹۱۲ء میں ان کی ایک نظم ''پھیری والے سوداگر کی صدا'' بڑی مقبول ہوئی اور ترکی (Turkey) کے لیے چندہ جمع کرنے میں بہت کام آئی۔ اس نظم کا پہلا شعر ہے:

ترکی کے تمسّکات لے لو، لے لو
جنت کے قبالجات لے لو، لے لو

بعد میں یہ ہمدرد (دہلی) میں بھی شائع ہوئی۔ (طنزیات و مقالات، ص: ۶۹)

قاضی صاحب میر محفوظ علی (ف ۱۹۴۳ء) کے خاص دوستوں میں تھے (ایضاً، ص ۴۳) علوم اسلامی، فارسی و اردو ادب پر فاضلانہ نگاہ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ تسنیم (آگرہ) میں کسی موضوع پر جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی (ف ۱۹۶۷ء) سے بحث چھڑ گئی تھی جو کئی ماہ چلی۔ ان کی مطبوعہ کتب کا علم نہیں ہو سکا۔ بہترین غزل گو کے آخر میں ان کی دو کتابوں کا اشتہار ملتا ہے:

۱۔ اسلام بجواب ترک اسلام

عبدالغفور دھرمپال جی برہمچاری کی کتاب 'ترک اسلام' کا جواب

۲۔ ریویو

سوامی دیانند جی مہاراج کی سوانح عمری مع فلسفیانہ تنقید

۳۔بہترین غزل گو

مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ، بار دوم ۱۹۴۱ء، بار اول ۱۹۳۱ء، سے پیشتر قاضی صاحب عدالت مال میں وکیل مختار تھے۔ ۱۹۴۳ء میں تقریباً ۸۳ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ (تذکرہ شعرائے بدایوں ج ۱/ص: ۱۱۵)

تبصرہ

سید اعجاز احمد معجز سہسوانی کی کتاب ''مومن و غالب'' کا پہلا ایڈیشن نظامی پریس، فیض آباد سے ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب پر مولانا شاکر حسین نکہت سہسوانی کا ۱۲ صفحات پر مشتمل مقدمہ بہ عنوان ''تبصرہ'' شامل ہے۔ تبصرے پر تاریخ اتمام ۱۵/ اکتوبر ۱۹۳۱ء درج ہے۔ اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن ۱۹۳۳ء میں اسے شامل نہیں کیا گیا۔ یہ مقدمہ کئی اعتبار سے توجہ کا مستحق ہے۔ غالب اور کلام غالب کے ضمن میں اس مقدمہ پر ہنوز توجہ نہیں دی گئی۔

اس مقدمہ میں مقدمہ نگار نے موازنہ کلام کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا مولانا محمد حسین آزادؔ کے سر باندھا ہے۔ اور تصنیف (موازنہ انیس و دبیر) کی صورت میں موازنہ کو شبیہ کامل دینے کا اعزاز انہوں نے شبلی کو دیا ہے۔ اس مختصر تمہید کے بعد انہوں نے بدایوں کے دو موازنہ نگار، قاضی غلام امیر نقاد اور اعجاز احمد معجز سہسوانی کا ذکر کیا ہے۔ اول الذکر نے غالب کا موازنہ ذوق سے اور موخر الذکر نے مومن سے کر کے غالب کو غزل کے میدان میں باوجود کمال سخنوری کمتر دکھایا ہے۔ مقدمہ نگار ان دونوں حضرات کی کوششوں کو ''تحفہ عجوبہ'' کے زمرے میں رکھتے ہیں اور اس کی بنیادی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ اصولاً موازنہ کلام کے لیے جو باہمی نسبت و تعلق درکار ہے وہ کلام غالب اور کلام ذوق و مومن میں متحد نہیں۔ ان کے خیال میں دو شاعروں کے کلام میں موازنہ و مقابلہ کے لیے تین نسبتوں کا مشترک پایا جانا ضروری ہے۔ اول نسبتِ حرفت، دوم تساویِ مذاق، سوم اتحادِ طریق و اختلاف یا اتفاقِ مقصد۔ مقدمہ نگار کے بقول:

''صحت نسبت حرفت کے یہ معنی ہیں کہ ایک اردو لکھنے والا دوسرے اردو لکھنے والے اور فارسی سخن سرا دوسرے فارسی سخنور کا اور ایک ناظم یا ناثر دوسرے ناظم یا ناثر کا حریف صحیح ہے اور

تساویِ مذاق یہ ہے کہ دونوں کہنے والوں کا رنگ سخن یکساں ہو۔ اگر ایک شخص رعایت لفظی کا دلدادہ ہے اور دوسرا صفائیِ زبان و بندش محاورات پر آمادہ، یا ایک معاملہ بند ہے اور دوسرا معانی پسند، تو ان دونوں میں مساوات مذاق مفقود ہے۔ حال و قال و خیال جو تین حالتیں شعر کے لیے مخصوص سمجھی گئی ہیں اگر ان میں سے کسی ایک صنف کے دونوں قائل یا پابند ہیں تو ان کو مساوی المذاق کہا جائے گا۔

اختلاف طریق و اختلاف مقصد کی صورت یہ ہے کہ دو شعر کہنے والے کسی ایک ہی صنف کلام میں خواہ وہ مدح ہو یا قدح۔ تعزیت ہو یا تہنیت یا اس کے سوا اور کچھ، ہم طرح ہو کر اپنے اپنے مضامین ادا کرنے میں روانی طبع کے جوہر دکھائیں۔ اگر ایک ہی مضمون پر اسی طرح مناسبتِ الفاظ و طرز ادا کی نمائش کی جائے گی تو یہ اتحاد طریق و اتفاق مقصد ہے۔ جس میں نیک و بد کی تمیز کر لینا نہایت آسان کام ہے۔'' (ص: ۲۔۳)

کلام انیسؔ و دبیرؔ میں وہ مذکورہ نسبتوں کو پاتے ہیں لہٰذا ان کے درمیان موازنے کو درست قرار دیتے ہیں لیکن غالبؔ، مومنؔ اور ذوقؔ کے کلام میں وہ ان نسبتوں کو مشترک نہیں پاتے لہٰذا ان کے مابین موازنہ و تقابل کو اصولی طور پر غلط قرار دیتے ہیں۔

اس اصولی بحث کے بعد وہ مرزا غالب کے اردو کلام کا جائزہ لیتے ہیں۔ غالب کو وہ اصلاً فارسی زبان کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ مرزا کے ابتدائی کلام کے مہمل اور بے معنی ہونے پر وہ حالی کی رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو کلام کی بابت غالب کے اپنے بیانات ان کی نظم و نثر سے اخذ کر کے درج کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ غالب کے اشعار

کا شماریاتی مطالعہ کرتے ہیں۔ غالب کے ۱۸۰۰ ابیات میں نصف کلام کو ادق، مشکل اور خارج از معانی ہونے کے سبب مطالعہ سے خارج سمجھتے ہیں، جن کا مفہوم پانے میں بقول بجنوری ''ذہن مطلقاً قاصر ہے''۔ ایسی صورت میں غالب کو سندِ پیمبری دینا کہاں تک درست ہے؟ انہوں نے صاف صاف لکھا ہے:

ایشیائی مکتبوں میں پڑھنے والوں کی ہرگز یہ تاب و طاقت نہیں کہ فن اشعار کے معنیٰ حل کرنے میں وہ (درماندہ ہوں) ان کے کہنے والوں کو محض اس بنا پر کہ اذہان ان کا مفہوم پانے سے مطلقاً قاصر ہیں۔ مرسل و ملہم بنادیں (ص:۵،۶)

غالب کا وہ کلام جو انہوں نے از خود دیوان متداول سے خارج کر دیا تھا اسے دریافت کر کے اس سے غالب کا اعجاز ثابت کرنے پر بھی انہوں نے اعتراض کیا ہے۔ انہوں نے بجنوری کے بعض بیانات کی سخت گرفت کی ہے اور ان کو باقاعدہ اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔ بجنوری کے اس بیان:

''لیکن واقعہ یہ ہے کہ قواعد منطق کا خارجی پہلو ہے اور شاعری منطق سے آزاد ہے۔''

کو درج کر کے لکھا ہے:

''یاللعجب! ارسطو تو شاعری کو قیاسِ منطقی کے آٹھ شعبوں میں سے ایک شعبہ قرار دے اور مقدمات تخئیلہ کو قیاسِ شعری سے تعبیر کرے اور یورپ کا اعلیٰ تعلیم یافتہ اس کو منطق سے بالکل آزادی عطا فرمائے۔ واقعی یہ بھی عجیب منطق ہے۔'' (ص:۶)

آگے چل کر انہوں نے غالبؔ کے نصف کلام تقریباً ۷۳۰ (سات سوتیں) ابیات کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے:

''باقی رہا نصف کلام تقریباً ۷۳۰ ابیات اس میں ایک ربع ایسے شعر ہیں جو ہر طرح کی تعقیدات اور عامیانہ مذاق و سستیِ بندش و

مضامینِ پائمال کی قید شدید میں جکڑے ہوئے ہیں۔... اگر مرزا صاحب کے ساز و برگ شاعری سے ان کو بھی مستثنیٰ کردیا جائے تو پھر کیا کائنات باقی رہتی ہے۔ صرف ساڑھے پانچ سو ابیات۔ جن کی حالت یہ ہے کہ ان میں بھی بہت سے ادھر ادھر سے مانگے تانگے ہوے ہیں اور جن کے لکھنے میں مرزا صاحب نے سوا ے روشنائی کے اور کاغذ کے اپنی گرہ سے کچھ خرچ نہیں کیا۔ بلکہ افراسیابی نژاد ہونے کی وجہ سے محض ترکانہ غارت گری پر ہی اکتفا فرمائی ہے۔" (ص:۶،۷)

مقدمہ نگار نے فارسی و اردو کے ۱۲ ہم مضمون اشعار درج کرکے یہ ثابت بھی کیا ہے کہ مرزا نے ان اشعار کے مضامین کو اپنے اشعار میں موزوں کیا۔ اسی قبیل کے وہ ۱۵۰ اشعار مزید پیش کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جن کو شرعاً و عرفاً وہ غالب کی ملکیت قرار نہیں دیتے بلکہ ان کو وہ "مال مغروقہ" کہتے ہیں۔ اس طرح وہ غالب کا راس المال صرف ۴۰۰ ابیات ہی قرار دیتے ہیں اور اس مختصر تعداد کی بنیاد پر وہ غالب کو خدائے سخن کہنے کے حق میں نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اب ان کو حسن عقیدت سے کوئی صاحب آریہ کے چار دیدوں کی طرح الہامی تصور فرمائیں یا اعجاز سخن سرائی سے تعبیر کریں۔ آزاد و مختار ہیں۔ مگر حقیقت شناس جانتے ہیں کہ جس نمائش گاہِ سخن میں لوگ ہزاروں انمول جواہر کلام کے ڈھیر لگائے بیٹھے ہوں وہاں ان معدودے چند مروارید ناسفتہ کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے۔" (ص:۸)

مقدمہ نگار نے غالب کے اردو اشعار پر اپنے اعتراضات کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے ان کے فارسی کلام کو اُن خامیوں (مثلاً دور از معانی، یا بے معنی اشعار، دوسرے شعرا کے مضامین پر دست درازی، تعقید، عامیانہ مذاق وغیرہ) سے پاک صاف قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں اگر غالب کا رنگ طبیعت یہی ہوتا تو فارسی میں بھی اس کا اظہار ہوتا۔ اس تمام بحث کے بعد آخر میں انہوں نے نتیجہ نکالا ہے:

''لوگ ان کو اردو غزل اور اشعار کی فرمائش سے مجبور کرتے ہوں گے اور وہ چونکہ اس کے لیے پیدا نہیں ہوئے تھے اور فطرتاً خوش مذاق، دل لگی کے آدمی تھے اس لیے انہوں نے اس مہم کو اس طرح انجام دیا کہ سننے اور دیکھنے والے تمام عمر بھول بھلیوں میں پھنسے رہیں اور مرزا صاحب کے دبدبہ قادرالکلامی و سطوت شاعری کی وجہ سے جو ان کو زبان فارسی میں حاصل تھا۔ منھ کی کھانے کی خوف سے دم نہ مار سکیں۔..... بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ مرزا صاحب نے نہ کبھی فارسی کے سوا اردو شاعری کا دعویٰ کیا اور نہ کبھی فطری خواہش سے اس کی جانب توجہ کی اور نہ ان کے کلام سے کوئی توجہ ثابت ہوتی ہے۔ جب یہ حالت ہے تو استاد ذوق جیسے محاورہ نگار تمثیل گو اور حکیم مومن خاں جیسے بلند خیال معاملہ بند کے کلام سے مرزا کے اردو کلام کا موازنہ کرنا جس میں پہلی ہی شرط موازنہ مفقود ہے، کیا معنی رکھتا ہے؟ اور یہ کیا انصاف کی بات ہے کہ مرزا بیچارے کو خواہ مخواہ ڈھکیل ڈھکال کر اکھاڑے میں لاکر کھڑا کر دیا جائے اور دو مسلّم پکیتیوں سے زبردستی مقابلہ کرا کر پچھڑوا دیا جائے اور تماشائیوں کو تالیاں بجانے کا موقع ہاتھ آئے۔''

(ص:۱۱، ۱۲)

اس مقدمہ میں معجز کی کتاب ''مومن و غالب'' پرسرے سے گفتگو ہی نہیں کی گئی۔ اس مقدمہ میں کئی باتیں ایسی ہیں جن پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔ مثلاً:

- غالب کی مشکل پسندی سے کیا ان کی اردو شعر گوئی کی نفی کی جاسکتی ہے؟
- موازنہ دو مساوی المذاق چیزوں کے درمیان ہی ہوتا ہے لیکن مساوی المذاق ثابت کرنے کا معیار کیا ہے؟ کیا غزل کے اسالیب، طرز اور فکری رجحانات کے اختلافات سے دو غزل گو آپسی موازنے سے محروم ہو جائیں گے؟ میرؔ و سوداؔ، انشاؔ و مصحفیؔ، ناسخؔ و آتشؔ وغیرہ کے مابین موازنے کی مثالیں کن بنیادوں پر کھڑی ہیں؟

☐ مثنوی، قصیدہ، مرثیہ وغیرہ کا موازنہ صنفوں کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ غزل کا صنفی بنیاد پر موازنہ کیوں نہیں کیا جاسکتا؟

بجنوری پر ان کی تنقید بامعنی ہے۔ اس میں منطقی استدلال ہے لیکن گہرائی نہیں ہے۔ دراصل مقدمہ نگار نے مکاتیب غالب کے ان حصوں کو اپنے پیش نظر نہیں رکھا جن میں غالب نے اپنے اردو کلام کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ غالب کی شاعری پر گفتگو کرتے وقت ان مکاتیب کا مطالعہ ناگزیر تھا۔

بہرکیف یہ مقدمہ یا تبصرہ عبدالرحمٰن بجنوری اور ڈاکٹر سید محمود غازیپوری کے مقدموں کی طرح مشہور تو نہیں ہوسکا لیکن یہ بھی اپنے آپ میں ایک یادگار مقدمہ ہے۔ اُس دور میں غالب پرستوں کے بلند بانگ آہنگ پر یہ مقدمہ اگر مشہور ہوتا تو یقیناً ایک کاری ضرب خیال کیا جاتا۔ اس میں خیال کا تسلسل، بیان کا منطقی ربط، بلند آہنگی اور مقدمہ نگار کی خود اعتمادی صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ قاضی غلام امیر نقاد اور سید اعجاز احمد معجز سہسوانی نے کلام اردو کے حوالے سے تقابل وموازنے اور احتساب کے جس دائرے میں غالب کو لا کھڑا کیا تھا اس دائرے کو اپنے منطقی استدلال، بلند آہنگ زور بیان سے توڑنے میں بہرحال یہ مقدمہ کامیاب رہا۔

منشی محمد شاکر حسین نکہتؔ سہسوانی ولد منشی صابر حسین صباؔ سہسوانی (ولادت ۲۹ رجون ۱۸۷۱ء۔ بمقام رامپور — وفات ۲۳ ردسمبر ۱۹۵۲ء، بمقام سہسوان)۔ مقدمہ نگار نے عربی و فارسی، حدیث وتفسیر کا درس بھوپال کے نامی گرامی علما سے لیا تھا۔ اردو وفارسی نظم ونثر پر قادر تھے۔ اردو دیوان ڈاکٹر حنیف نقوی (بنارس) کی ملکیت میں ہے۔ صاحب حیٰوۃ العلما نے ان کی بابت لکھا ہے:

> آپ قابل ذی استعداد فخر خاندان زکی الطبع اور عربی فارسی اردو کی نظم، انشا نگاری پر قادر ہیں۔ فارسی قصائد میں قاآنی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اردو ریختہ میں عمدہ دیوانِ غزل مرتب ہے۔... نازک خیال

مضمون آفریں شاعر ہیں... مختصر کتب خانہ علوم وفنون بھی جمع کیا ہے... آپ کے خاندان میں مدت مدید سے قابل اہل قلم نظم ونثر فارسی منشیانہ وشاعرانہ لکھنے والے محقق نام آور پیدا ہوئے ہیں... اپنے خیال ورائے کے دھنی اور پختہ ہیں۔ ہر باب میں خودداری وقار و امتیازِ خاص کا بہت لحاظ رکھتے ہیں۔ (حیوٰۃ العلما، ص: ۱۲۴)

ان کی کسی تصنیف کا پتا نہیں چل سکا۔

(سلسلہ مطبوعات سرسید بک ڈپو نمبر ۶)

مومن و غالب

دونوں اُستادوں کے کلام پر محققانہ تبصرہ
اور
ان کے منتخب اشعار کا موازنہ

از

مولانا حکیم سیّد اعجاز احمد معجز سہسوانی
منشی فاضل و مولوی فاضل پنجاب

مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ
(جملہ حقوق محفوظ) قیمت عمر

عکس سرورق، مومن و غالب

مومن و غالب

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۱ء میں مطبع نظامی فیض آباد میں ۶۴ صفحات پر مع مقدمہ منشی شاکر حسین نکہت سہسوانی (ف ۱۹۵۲ء) چھپ کر دائرہ علمیہ فیض آباد کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ کتاب کا سرورق یہ ہے:

''وَلَعَبدٌ مُومِنٌ خَیرٌ مِن مُشرِکٍ وَلَو أعجَبَکُم / مومن و غالب / دونوں استادوں کے کلام پر محققانہ تبصرہ، اور ان کے منتخب اشعار کا موازنہ / از مولانا حکیم سید اعجاز احمد معجز سہسوانی / منشی فاضل و مولوی فاضل پنجاب / مطبوعہ / نظامی پریس، ادیب منزل، فیض آباد / جملہ حقوق محفوظ۔

اختتام کتاب پر تاریخ اتمام جون ۱۹۳۱ء درج ہے۔ دائرہ علمیہ کے عنوان سے آخری صفحے پر احمد رشید زیبا کی ایک صفحے کی تحریر ہے جس میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ دائرہ علمیہ کی یہ پہلی کوشش ہے۔ اس کے بعد مصنف کی دوسری کتاب 'شعر العرب' شائع ہوگی۔ آخر میں مولوی سید جمیل احمد جمیل سہسوانی (ف ۱۹۳۵ء) تلمیذ منیر شکوہ آبادی کا کہا ہوا قطعہ تاریخ ہے جو حسب ذیل ہے:

در عرصہ ریختہ کلام مومن گردید چو گُش زُنِ مقال غالب
اندر نظرِ مؤرخانِ نقاد <u>پاکیزہ کلام مومن آمد غالب</u>

۱۳۵۰ھ(۱۹۳۱ء)

سرورق پر درج آیت قرآنی (البقرہ: آیت ۲۲۱) کا ترجمہ یہ ہے:

''اور غلام مسلمان بہتر ہے مشرک سے اگر چہ وہ تم کو بھلا لگے۔''

آیت مذکورہ کے ترجمے اور دائرہ علمیہ فیض آباد کی جانب سے اس کی اشاعت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ''مومن و غالب'' کی تصنیف کا محرک شاید جذبہ ردِ شیعت بھی رہا ہوگا۔ کیوں کہ فیض آباد اُن دنوں شیعت کا مرکز تھا۔ اور مصنف مذہباً سلفی تھے۔ ردِ شیعت بھی ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ ان کا تحریر کردہ رسالہ 'اعیادِ ثلاثہ' (مطبوعہ ۱۹۳۸ء) اس کی بین مثال ہے۔ نیز 'طبع ثانی کے سرورق سے' آیت مذکورہ کو حذف کرنا بھی اس خیال کو تقویت دیتا ہے۔

اس کتاب کے بعد کے ایڈیشنوں کے بارے میں اختلاف ہے۔ ڈاکٹر محمد انصاراللہ نے ۱۹۳۳ء اور ۱۹۶۹ء میں سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے اس کے دو ایڈیشنوں کا چھپنا لکھا ہے (غالب ببلیوگرافی، ص: ۲۷)۔ جب کہ ڈاکٹر حنیف نقوی کا خیال ہے:

''دوسری بار اسے سرسید بک ڈپو علی گڑھ نے اپنے سلسلہ مطبوعات (نمبر ۶) کے تحت سرفراز قومی پریس لکھنؤ سے چھپوا کر شائع کیا۔ اس دوسرے ایڈیشن پر اس کا سال طباعت درج نہیں۔ لیکن محرر سطور کے علم کے مطابق یہ ۱۹۵۵ء کے اواخر میں یا ۱۹۵۶ء میں جولائی سے قبل کسی وقت شائع ہوا تھا۔''

(تذکرہ شعرائے سہسوان۔ ایک تعارف۔ مشمولہ رضا لائبریری جرنل رامپور، شمارہ ۴۔۵، ص: ۳۲۰)

راقم الحروف کے پیش نظر یہی سرسید بک ڈپو علی گڑھ کی جانب سے شائع شدہ ایڈیشن ہے۔ جو ستر صفحات کو محیط ہے۔ اس پر پیش لفظ، دیباچہ یا عرض مصنف قسم کی کوئی تحریر موجود نہیں۔ طبع اول میں شامل مقدمہ (از نکہت سہسوانی) بھی شامل نہیں۔ اس لیے

یہ کہنا مشکل ہے کہ اس پر مصنف نے نظر ثانی کی یا نہیں۔ اور یہ بھی میں سر دست طے نہیں کر سکا کہ یہ طبع دوم ہے یا طبع سوم۔

ڈاکٹر حنیف نقوی نے اپنے ایک مطبوعہ مراسلے میں ڈاکٹر محمد انصار اللہ کی فراہم کردہ ۱۹۳۳ء کی اشاعت کی اطلاع کو یکسر غلط اور ۱۹۶۹ء میں اشاعت ثانی کو مشکوک قرار دیا ہے (بازگشت مشمولہ سہ ماہی فکر و تحقیق، دہلی۔ جنوری تا مارچ ۲۰۰۵)۔ حنیف نقوی کے بیان کو اگر معتبر قرار دیا جائے تو سرسید بک ڈپو علی گڑھ کی جانب سے شائع شدہ ایڈیشن (۱۹۵۵ء یا ۱۹۵۶ء) ہی کو طبع دوم تسلیم کرنا ہوگا۔ طبع دوم کا سرورق یہ ہے:

"(سلسلہ مطبوعات سرسید بک ڈپو۔ نمبر ۶) / مومن و غالب /
دونوں استادوں کے کلام پر محققانہ تبصرہ / اور / ان کے منتخب اشعار کا
موازنہ / از / مولانا حکیم سید اعجاز احمد معجز سہسوانی / منشی فاضل و مولوی
فاضل پنجاب / مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ / (جملہ حقوق محفوظ) / قیمت عہ /"

اس کتاب کے مصنف سید اعجاز احمد معجز سہسوانی (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۶۳ء) علوم مشرقی کی آخری یادگار تھے۔ یہ کتاب جو مومن و غالب کے موازنے پر مشتمل ہے، ماقبل کی دونوں تحریروں کی بہ نسبت مفید مطالعہ ہے۔ اس کا مصنف زیادہ سنجیدگی، متانت اور حفظ مراتب کا لحاظ رکھتے ہوئے خالص علمی و ادبی معیار پر اس موازنے کو انجام دینے میں کامیاب ہوا۔ کتاب حسب ذیل عنوانات پر منقسم ہے:

تمہید (بدون عنوان)	ص: ۱ تا ۸
مومن	ص: ۸ تا ۱۰
کلام مومن کی خصوصیات	ص: ۱۱ تا ۳۵
موازنہ	ص: ۳۵ تا ۳۹
غالب	ص: ۴۰ تا ۴۹
مومن و غالب	ص: ۵۰ تا ۷۰
قطعۂ تاریخ	مولوی جمیل احمد جمیل سہسوانی، ص: ۷۰

ان عنوانات کے کہیں کہیں ذیلی عنوانات بھی دیے گئے ہیں۔ کہیں نمبر دے کر اور کہیں درمیان میں لائن دے کر عنوانات کے دائرے کو وسیع کیا گیا ہے۔

تمہید میں مصنف نے شعر و شاعری کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے غزل پر نقد کیا ہے اور غزل گو شعرا میرؔ، دردؔ، سوداؔ، ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ، ناسخؔ و آتشؔ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہم غزل کے حقیقی معنی پر نظر کرتے ہوئے یہاں صرف دو نازک خیال سحر کار شاعروں سے بحث کرتے ہیں۔ یعنی حکیم مومن خاں مومنؔ و مرزا نوشہ غالب کے کلام پر نقد کر کے دونوں کی قدرت شاعری و دقت آفرینی کا موازنہ اور بلندی تخیل کا پایہ ارباب فہم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین بچشم انصاف ملاحظہ کر کے عمدہ نتیجے پر پہنچیں گے۔'' (ص:۸)

''مومن'' عنوان کے تحت انہوں نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ (ف۱۸۶۹ء) کے دو اقتباسات مومنؔ کی شاعری کے متعلق پیش کیے ہیں۔ ایک ''تذکرہ گلشنِ بے خار'' سے اور ایک ''کلیات مومن'' کے دیباچہ سے، اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے:

''جب حالی کی 'یادگار غالب' نے اہل ذوق کو مرزا کے کلام کی طرف متوجہ کیا تو اس کے مشکل اشعار کے عقدے حل کرنے کو ایک جماعت اہل علم و فن کی تیار ہو گئی... جس سے مرزا کے رشک فارسی ریختہ کی قدر و قیمت بلند ہوئی... لیکن حکیم مومن خاں مرحوم کے دقیق مضامین اور بلند خیاالات اب تک زیر نقاب ہیں۔ کسی نکتہ شناس نے ان کے کلام کے دقائق و لطائف اور نازک معانی کی توضیح نہیں کی۔ جس سے اشعارِ مومن کے وجوہِ محاسن و نکات بلاغت خواص سے عوام تک پہنچتے.... ہم ان کی غزل پر بحیثیت ایک نقاد کے تبصرہ لکھتے ہیں۔ جن سے ان کے محاسن تغزل پر روشنی پڑے گی۔'' (ص:۱۰)

اگلے عنوان "کلام مومن کی خصوصیات" کے تحت انہوں نے مومن کے شعری موضوعات، زبان کے اوصاف، دوسرے غزل گو شعرا سے منفرد کرنے والے ان کے شعری رویّے پر وضاحت وصراحت سے روشنی ڈالی ہے۔

"موازنہ" عنوان کے تحت مومن کے بعض اشعار کا فارسی شعرا کے ساتھ تقابل کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مومنؔ غزل کے مخصوص کینوس یعنی تغزل میں بعض فارسی شعرا پر بھی سبقت لے گئے ہیں۔

"غالب" عنوان کے تحت انہوں نے غالب کی اردو شاعری پر جو اظہار خیال کیا ہے اس کا انداز گذشتہ دو تحریروں (یعنی قاضی غلام امیر، اور نکہت سہسوانی) جیسا ہی ہے۔ انہوں نے بھی یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مرزا کو خود ہی اردو شاعری سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے یہاں جو سَقطات پائے جاتے ہیں فارسی ترکیبوں سے گرانبار جو مغلق اشعار ملتے ہیں، فارسی اشعار کے مضامین پر مشتمل جو اشعار ان کے یہاں نظر آتے ہیں، اس کا سبب ہی یہ ہے کہ خود انہوں نے اور ان کے معاصر اساتذہ اردو نے بھی ان کے کلام ریختہ کو خاص وقعت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ غالب فارسی شاعری کے سبب صاحب کمال بنے نہ کہ اردو شاعری کے سبب۔ وہ لکھتے ہیں:

> "مرزا کے کمال سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ لیکن ان کا سرمایہ ناز فارسی شاعری ہے۔ اور اسی لحاظ سے وہ صاحب کمال سمجھے گئے ہیں۔ ان کی جدت پسند طبیعت عامۃ الورود مضامین اور معمولی خیالات سے کنارہ کش تھی۔ متداول ترکیبوں اور مبتذل اسالیب بیان سے ہمیشہ بچتے تھے۔ لیکن اردو شاعری ان کے تخیل کی دلکشا جولان گاہ نہ تھی۔ اس کو ان کے کمال کا آئینہ سمجھنا مرزا کی قدر و قیمت کو بٹا لگانا ہے۔"
>
> (ص: ۴۰)

> "اس منتخب (کلام) میں بھی زیادہ تر ایسے اشعار ہیں جن کو نہ فارسی کہا جاسکتا ہے نہ اردو۔ بلکہ اکثر شعر معمے اور چیستان ہیں۔

فصاحت سے بیگانہ۔ غیر متعارف ترکیبوں سے مملو اور معانی کے لحاظ
سے بھی کوہ کندن وکاہ برآوردن کے مصداق ہیں۔ شارحین کا جگر خون
ہوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ لیکن اس ناموس طریقے سے علیحدہ ہوکر جو سلیس
اشعار کہے ہیں ان کی دل فریبی میں کلام نہیں۔ مگر افسوس ہے ایسے
اشعار کی تعداد بہت قلیل ہے۔'' (ص: ۴۱)

''ہم نے مرزا غالب کے سقطات کا استیعاب نہیں کیا نہ ہمارا یہ
مقصد ہے کہ مرزا پر طعن و اعتراض کرکے ان کی کسر شان کریں۔ بلکہ
باوجود ان کمزوریوں کے ان کی شاعری کا پایہ ہماری نظر میں بہت سے
مشاہیر سخنوروں سے بلند ہے اور ہم کو ان کے کمال کا دل سے اعتراف
ہے لیکن ابنائے عصر کی کوتاہی نظر پر تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے مرزا
غالب کے کمال کا نمونہ ان کی اردو شاعری کو قرار دے کر ان کے بلند
مرتبے کو پست کرنے کی کوشش کی ہے۔'' (ص: ۴۴)

آخری عنوان ''مومن و غالب'' سراسر موازنے پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے
دونوں شعراء کے ۱۷ متحد المعنیٰ یا قریب المعنی اور کم وبیش ۴۴ ہم قافیہ و ہم ردیف اشعار
کو بالمقابل رکھ کر مومن کے اشعار کی محاسن شعر کے لحاظ سے برتری اور غالب کے اشعار
کی کمتری کی تفصیلات پیش کی ہیں۔ اگر چہ اس بحث میں مصنف نے اعلیٰ سخن فہمی کا ثبوت
دیا ہے اور اشعار کے نازک پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے اور اس طرح اپنی علمیت اور
استدلالی قوت کو بھی منوالیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مصنف کے نقد میں ترجیحات
انہی اصول وقواعد شاعری اور نظریات کو حاصل رہیں جن سے ہمارے اردو تذکرہ نگار
بالعموم کام لیتے رہے۔ اس موازنے میں حالی وشبلی کی روشن خیالی و وسعت ذہنی، لفظوں
میں پوشیدہ معانی کی تہوں کو کھولنے، شعری ضرورت یا شاعر کے اپنے اختیار کردہ منفرد
اسلوب وطرق استعمال پر غور کرنے، اسے اس کے جملہ ادبی کارناموں کے پس منظر میں
دیکھنے کا رجحان نہیں ملتا۔

غالبؔ کا مومنؔ و ذوقؔ سے تقابل کیا جاتا رہا ہے۔لیکن صحیح نتائج اخذ کرنے میں عام طور پر مصنف کی پسند و ناپسند کو بڑا دخل ہے۔ راقم الحروف کو ذاتی طور پر مصنف کی اس بات سے اتفاق ہے کہ جس طرح غالب کو ان کے اشعار کے مغلق مضامین حل کرنے کے لیے شارحین و ناقدین کی ایک بڑی جماعت ہاتھ لگی اس طرح سے مومنؔ کے نازک معانی کی توضیح اور دقیق مضامین وخیالات کی تصریح کرنے کے لیے کوئی جماعت تیار نہیں ہوسکی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کے دقائق و لطائف اب تک زیر کتاب ہیں۔ اور ان کے نکات بلاغت عوام تک نہیں پہنچ سکے۔ (ص:۱۰)

دراصل اشعار کی تفہیم کا تعلق ہر عہد کے مخصوص علم و فضل، تہذیبی زندگی اور اجتماعی سوچ سے ہے۔ یہ عہد غالب کا ہے۔ میرؔ پر توجہ دی جارہی ہے۔ قاضی افضال حسین کی کتاب ''میر کی شعری لسانیات''، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی ''اُسلوبیات میر'' اور شمس الرحمٰن فاروقی کی ''شعر شور انگیز'' نے میر کی عظمت میں اضافہ کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مستقبل کا کوئی عہد مومن و ذوق کی تفہیم کے لیے مخصوص ہو اور اُن کی شاعری اُس دور کی اجتماعی سوچ کے لیے وجہ نشاط ہو۔

''مومن و غالب'' کی اشاعت سے قبل نگار لکھنؤ کا ''مومن نمبر'' جنوری ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا۔لیکن کتاب مذکور میں اس کا حوالہ نظر نہیں آیا۔ یہ نمبر مومن کی شاعرانہ حیثیت کو مستحکم کرنے میں بھی اہم ثابت ہوا۔ مومنؔ کے لیے نیاز کا یہ جملہ:

> ''اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعرائے متقدمین ومتاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میرؔ) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تأمل کہوں گا مجھے کلیاتِ مومن دیدو۔ اور باقی سب اٹھا لے جاؤ۔'' (نگار مومن نمبر،ص:۲)

مومن کی شاعرانہ عظمت کے لیے دہرایا جاتا رہا۔ اس نمبر میں مولانا عبدالباری آسی (ف ۱۹۴۶ء) نے (جو میرؔ کا کلیات بھی ترتیب دے چکے ہیں) ''موازنہ مومن و

غالب'' عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا۔ جس میں معجز سہسوانی کی طرح غالب و مومن کے ہم قافیہ و ہم معنی اشعار کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر ان کی خوبیوں و کمیوں کو اجاگر کیا تھا۔

اس پس منظر میں کہا جاسکتا ہے کہ غالب پرستی کے رجحان کے فروغ کے ساتھ ساتھ غالب کے معاصر مومن کی شاعرانہ عظمت کو بھی اِسی دور میں محسوس کیا جانے لگا تھا۔ نگار کا مومن نمبر (۱۹۲۸ء)، مومن و غالب (۱۹۳۱ء)، شرح قصائد مومن (پروفیسر ضیاء احمد۔ لکھنؤ ۱۹۲۵ء)، شرح دیوان مومن (ضیاء احمد۔ الٰہ آباد ۱۹۳۴ء) اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ لیکن اسے کیا کیا جائے کہ کلامِ غالب اور شخصیت غالب ہی جمہور کی نظروں کا سرمہ بنی۔

اس کتاب کے مصنف معجز سہسوانی ولد سید محمد عبدالباری محدّث ۸ مارچ ۱۸۷۷ء کو سہسوان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی۔ بھوپال جاکر مولانا محمد بشیر محدث، مولانا عبدالحق کابلی اور شیخ حسین عرب محدّث وغیرہ سے اکتسابِ علم کیا۔ ۱۸۹۸ء میں نامی پریس میں ملازم ہوگئے۔ ایک سال بعد سینٹ جانس کالج آگرہ سے ملحق ایک اسکول میں بحیثیت عربی استاد کے تقرر ہوگیا۔ یہ ملازمت عارضی تھی۔ میعاد ملازمت ختم ہوجانے کے بعد بسولی (ضلع بدایوں) میں مطب کیا۔ ۱۹۱۹ء میں وثیقہ عربک کالج فیض آباد کے وائس پرنسل بنے جہاں سے ۱۹۴۶ء میں سبکدوش ہوئے۔ عمر کا باقی حصہ وطن میں بسر کیا۔ ۷ جنوری ۱۹۶۳ء کو وفات پائی۔

معجز بنیادی طور پر عربی و فارسی کے عالم تھے۔ تصانیف کا ایک قابل قدر ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ اکثر دستبردِ زمانہ کی نذر ہوگئیں۔ چند تصانیف کے مسودات ڈاکٹر حنیف نقوی کی ملکیت میں ہیں۔

معجز شاعر بھی تھے۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں دیوان مرتب کیے۔ اردو میں حسب ذیل کتب کی اشاعت کا علم ہوسکا۔

ناول: پردۂ راز (مطبوعہ آگرہ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۴ء کے درمیان)،
جاریہ عرب (مطبوعہ بریلی۔ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۰ء کے درمیان)
شاعری: معجز نما، دیوانِ غزلیات (بدایوں ۱۹۱۰ء)،
نیرنگ امامت۔ مسدس (لکھنؤ سنہ اشاعت ندارد)
تنقید: مومن و غالب (فیض آباد ۱۹۳۱ء) نقد و انتقاد، (مضامین لکھنؤ ۱۹۶۱ء)
متفرقات: ابن سبا (لکھنؤ ۱۹۱۹ء) اعیاد ثلاثہ (مطبوعہ ۱۹۳۸ء)

صاحب حیوٰۃ العلماء نے ان کے حالات و علمی فتوحات پر تقریباً ۶ صفحات (صفحہ ۲۲۷ تا ۲۳۳) رقم کیے ہیں اور ان کی عربی و فارسی کتب کے اسماء درج کیے ہیں۔ انہوں نے معجز کے علم و فضل کی بابت لکھا ہے:

''علوم ادبیہ فارسی و عربی و منطق و حکمت و کلام و سیر میں بالخصوص دستگاہِ کامل ہے... استحضاء غرائب لغات و محاورات عرب و حلّ اشعار مشکلہ میں عدیم النظیر ہیں... شعرائے جاہلین و محضرین کے تتبع میں بے شمار عربی قصائد وعزا تصنیف کیے۔ انشا پردازی عربی و فارسی میں عجیب ملکہ خداداد پایا ہے... فارسی قصائد آپ کے انوری و ظہیر کے کلام کا مقابلہ کرتے ہیں۔ غزل میں کہیں حافظ اور کہیں نظیری کا رنگ ہے۔''

(ص: ۱۲۸۔۱۲۹)

ڈاکٹر حنیف نقوی نے ان کی تصنیف کے ایک قلمی نسخے کا تعارف کراتے ہوئے ان کی بابت لکھا ہے:

''مولانا حکیم اعجاز احمد ان کثیر الجہات اور جامع الصفات ہستیوں میں سے تھے جن کی نمود کے امکانات قدیم نصاب تعلیم اور طریقہ تدریس کے زوال کے ساتھ تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ ان کی شخصیت میں بیک وقت ایک عالم، ایک طبیب، ایک استاد، ایک شاعر، ایک ناول نگار، ایک مورخ اور ایک ناقد کی خصوصیات جمع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ بہ اعتبار موضوعات ان کی تصانیف کا دائرہ خاص وسیع ہے۔''

(رضا لائبریری جرنل رامپور، ص ۳۱۹، حوالہ سابق)

مولوی اعجاز احمد معجز سہسوانی

(ماخذ: یہ عکس ان کے فوٹو سے کرا کر ڈاکٹر حنیف نقوی نے عنایت کیا)

باب ششم

بدایوں میں غالب شناسی

بدایوں میں غالب شناسی

بیسویں صدی کے اوائل میں اردو تنقید و تحقیق پر توجہ کے ساتھ ہی غالب کا مطالعہ بھی نئی جہت سے کیے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ یادگار غالب (طبع اول ۱۸۹۷ء۔ کانپور) اور شرح طباطبائی (طبع اول ۱۹۰۰ء) کی اشاعت کے بعد یہ رجحان بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوا کہ یورپ کی طرح زبانِ اردو کا بھی ایک عظیم اور مثالی شاعر ہو۔ جسے یورپین زبانوں کے عظیم شعرا کے بالمقابل کھڑا کیا جا سکے۔ چنانچہ جہاں کلام غالب میں نئے علوم و فلسفہ کے اثرات کی جستجو کی گئی، وہیں ان کے دیوان کی ایک قابل قدر اشاعت پر بھی توجہ دی گئی۔ غالب کے مزار کی تعمیر نو کی تحریک کا آغاز بھی انہی دنوں ہوا۔ دراصل یہ ساری کوششیں نتیجہ تھیں نئی تعلیم یافتہ نسل میں قومی احساس کے سربلند ہونے کا۔ اپنی تہذیب، اپنے تشخص کو محفوظ رکھنے کے جذبہ و احساس کا۔ چنانچہ دلدادگان تہذیب جدید اور وارفتگان ادب لطیف کے لیے رفتہ رفتہ غالب ایک پسندیدہ موضوع بن گئے۔ اس طرح غالب شناسی، غالب فہمی، ادب کا ایک حصہ بن گئی۔

یہ سوال ہنوز قائم ہے کہ غالب شناسی کا دروازہ کس نے وا کیا؟ عام طور پر اس کا

سہرا کبھی حالی اور بیشتر بجنوری کے سر باندھا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیسوی صدی کے دوسرے دہے میں جب غالب شناسی کی اصطلاح بھی وجود میں نہ آئی تھی، غالب شناسی کی خشتِ اول نظامی بدایونی نے رکھی۔ ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے درست لکھا ہے:

''غالب شناسی کی خشت اول نظامی پریس کے مالک و بانی اور اخبار ذوالقرنین (بدایوں) کے مدیر مولوی نظام الدین حسین نظامی بدایونی نے رکھی۔'' (غالب اور عصر غالب، ص: ۱۹۲)

غالب شناسی یا غالبیات کے مطالعے کے سلسلے میں بدایوں میں یہ تین نام میرے پیشِ نظر ہیں:

۱۔ نظام الدین حسین نظامی بدایونی (۱۸۷۲ — ۱۹۴۷ء)

۲۔ پروفیسر آل احمد سرور (۱۹۱۱ء — ۲۰۰۲ء)

۳۔ پروفیسر حنیف نقوی (۱۹۳۸ء — بقید حیات)

یہ تینوں نام ادب میں معروف و مشہور ہیں اور غالب سے متعلق ان کے کام سے بھی ادبی حلقے کسی حد تک واقف ہیں، لیکن غالب شناسی کے حوالے سے ان کی مجموعی خدمات کیا ہیں؟ انہوں نے غالبیات کے مطالعے میں کیا اضافے کیے ہیں؟ ان کی تحریروں سے غالب فہمی میں کیا کوئی روشنی کی کرن دکھائی دی؟ اس باب میں اسی زاویے سے ان اکابر کا تعارف و مطالعہ مقصود ہے۔

نظامی بدایونی کی غالب شناسی پر اس کتاب کے باب چہارم میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ لہٰذا بار دگر ان کا تذکرہ و تعارف پیش کرنا صحیح نہ ہوگا۔ البتہ اردو شعر و ادب کی تاریخ میں غالب شناسی کی روایت کو زندہ اور فعال بنانے میں ان کی اولیت کا ذکر بار بار کیا جاتا رہے گا۔ اسی لیے اس تمہید میں بھی ان کا ذکر آ گیا۔ سطور ذیل میں پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر حنیف نقوی کی غالب شناسی و غالب فہمی پر گفتگو کی جا رہی ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور

پروفیسر آل احمد سرور

(۹ر ستمبر ۱۹۱۱ء — ۹ر فروری ۲۰۰۲ء)

پروفیسر آل احمد سرور اردو تنقید کی تیسری نسل کے قدآور نقادوں کے آخری روشن چراغ تھے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا، وہ ایک خوش گو شاعر تھے لیکن ادب میں وہ ایک ناقد کی حیثیت سے جگہ بنانے میں کامیاب رہے۔ انہوں نے تنقید میں سائنٹفک طور گفتگو اختیار کر کے تقلید سے گریز کیا اور مبادیات کی وجہیں تلاش کیں۔ انہوں نے حالی و شبلی، بجنوری و عبداللطیف کے عہد مابعد میں عملی تنقید کی جگہ دانشمندانہ تنقید کو اختیار کیا۔ ان کی دانشمندانہ تنقید میں تجزیے کے ساتھ حقیقت پسندانہ ایمائیت و اشاریت ہے۔ وہ ترقی پسندی کے عروج کے زمانے میں بھی کسی مینوفسٹو کے پابند نہیں ہوئے۔ وہ غیر مقلد ہوتے ہوئے بھی کلاسیکل ادب کی تنقید سے وابستہ رہے۔ انہوں نے اپنے قلم کو کسی تنگنائے میں بند نہیں کیا۔ ترقی پسند تحریک کے زوال کے بعد جب جدیدیت کا دور آیا، اس وقت بھی وہ اس کے علَم بردار نہیں بنے۔ حقیقت یہ ہے کہ آل احمد سرور کسی فرد یا نظریے کے پابند نہیں ہوئے۔ موقع بہ موقع دانشمندانہ باتیں کہتے

رہے۔ آل احمد سرور کے ساتھ کسی نظریاتی تنقید کو وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔

سرور صاحب کے اسلوب میں بھی غضب کی ذہانت پوشیدہ ہے۔ ان کو بڑی باتیں چھوٹے الفاظ و سطور میں کہنے کا ملکہ ہے۔ انہوں نے نثر میں ایمائیت، اشاریت اور ظاہری و معنوی لفظی بازی گری سے بھی کام لیا، کبھی کبھی قاری ان کی نثر کے رومان میں اصل موضوع و فکر کو بھول جاتا ہے... یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا قاری اسلوب کے نشاط کی وجہ سے تنقید کی خشکی میں خود خشک نہیں ہوتا۔

مذکورہ سطور راقم الحروف کے مضمون ''عصر حاضر کا دانش مند ناقد ادب'' (مشمولہ ہماری زبان دہلی، یکم تا ۲۸ اپریل ۲۰۰۲۔ سرور نمبر) سے ماخوذ ہیں۔ ان کو ابتدا میں درج کرنے کا منشا یہ ہے کہ غالب سے متعلق سرور صاحب کے جملہ ادبی کام کو بھی دانشمندانہ تنقید کے زُمرے میں شمار کرنا چاہیے۔

سرور صاحب غالب کے اعلیٰ درجہ کے نقاد ہیں۔ اس کا احساس بھی اب ہونے لگا ہے۔ چنانچہ ''غالب اور سرور'' یا ''سرور اور غالب'' عنوان سے ہم عصر رسائل میں دو تین مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن یہ کسی ایک فکری زاویے تک محدود ہیں۔ سرور صاحب کے غالب سے متعلق کُل سرمایہ تحریر کا جائزہ ہنوز نہیں لیا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں غالب سے متعلق ان کی جملہ تحریروں اور تمام اشاعتوں کا ایک اشاریہ باب ہفتم میں پیش کر دیا گیا ہے۔ غالب شناسی و غالب فہمی کے تحت ان کی تنقیدات کا اجمالی تعارف و جائزہ سطور ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر سرور کو غالبؔ اور اقبالؔ سے خصوصی شغف رہا ہے۔ انہوں نے اپنی نصف صدی سے زائد پر مشتمل ادبی زندگی میں دونوں عظیم شعرا پر متعدد مضامین لکھے۔ غالب پر انہوں نے ۱۹۴۱ء میں پہلا مضمون بہ عنوان ''غالب'' لکھا اور آخری مضمون میری معلومات کی حد تک ۱۹۹۱ء میں بہ عنوان ''ہندستانی نشاۃ الثانیہ اور غالب'' لکھا۔ گویا نصف صدی انہوں نے غالب پر غور و خوض کیا اور وقفے وقفے سے اپنے خیالات سے

ادب کے قارئین کو آگاہ کرتے رہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے:

''سرور صاحب نے بہت سے موضوعات پر لکھا ہے لیکن اقبال اور غالب پر انہیں غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔ اردو کے ان عظیم شاعروں پر بہت کم لوگوں کی اتنی گہری نظر ہے، جتنی سرور صاحب کی ہے۔ دراصل مختلف النوع موضوعات کی بھیڑ میں سرور صاحب کی یہ خصوصیت اور یہ غیر معمولی مہارت دب کر رہ گئی ہے۔ ان کے مضامین اور کتابیں غالبیات اور اقبالیات میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر ان دونوں میدانوں میں سرور صاحب کے کام کا جائزہ لیا جائے تو وہ غالب کے اعلیٰ درجے کے نقاد اور صف اول کے ماہر اقبال قرار پائیں گے۔'' (آل احمد سرور: شخصیت اور ادبی خدمات، ص: ۷)

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی اطلاع کے بموجب سرور صاحب اپنے ان مضامین کو خود مرتب کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے:

''آل احمد سرور کی غالب سے متعلق نگارشات کی تدوین و ترتیب کا کام مدت سے میرے پیش نظر ہے۔ لیکن چند در چند مصروفیات کے باعث ٹلتا چلا آ رہا ہے۔ سرور صاحب لاہور آئے تو میں نے غالب کے بارے میں مضامین کی طرف ان کی توجہ دلائی جواباً انہوں نے مجھ سے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ کام میں ہی خود کیوں نہ انجام دوں۔ اب اس بات کو دس برس سے زیادہ ہو گئے۔ متفرق مضامین کے علاوہ غالب پر مستقل ایک کتاب کی تالیف بھی سرور صاحب کی آرزوؤں میں سے ایک ہے۔

آل احمد سرور نے سید حسین ریسرچ پروفیسر (شعبہ اردو علی گڑھ) کی حیثیت سے دسمبر ۱۹۵۵ء تا اپریل ۱۹۵۸ء غالب کے اردو دیوان کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ یہ ترجمہ ابھی چھپا نہیں ہے۔ اس کا مسودہ

عطاء اللہ خاں درّانی (امریکہ) کے پاس ہے۔"

(پروفیسر سرور: شخصیت اور ادبی خدمات، ص ۷۸ تا ۸۱)

سرور صاحب نے غالب اور غالبیات کے حوالے سے کم و بیش چالیس تحریریں یادگار چھوڑیں، جن کی نوعیت حسب ذیل ہے:

- غالب کی شخصیت، عہد اور فکر و فن پر ایک درجن کے قریب اعلیٰ قسم کے تنقیدی مضامین لکھے۔
- غالب کے ناقدین (حالی، ڈاکٹر سید عبداللطیف، شیخ محمد اکرام، غلام رسول مہر، مولانا عرشی) کا چار مضامین میں علیحدہ جائزہ لیا۔
- دو مضامین کی صورت میں غالب کے اشعار کا انتخاب پیش کیا۔
- غالب سے متعلق کتب پر سات دیباچے اور چھ تبصرے لکھے۔
- غالب پر ۳ ریڈیو ٹاک لکھیں
- غالب صدی تقریبات ۱۹۶۹ء کے دوران غالب شناسی کو رواج دینے کے لیے ۶ تحریکی مضامین لکھے۔

ان کے علاوہ غالب پر دو کتب اور دو نمبر مرتب کیے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے سکریٹری شپ کے دوران (۱۹۵۶ء تا ۱۹۷۴ء) غالب پر اعلیٰ درجہ کی ۹ کتب شائع کیں۔ سرور صاحب کا ایک ایک مضمون متعدد رسائل و کتب میں نقل کیا جاتا تھا۔

غالب اور غالبیات بہ الفاظ دیگر غالب شناسی کے حوالے سے سرور صاحب کے جملہ کارِ ادب کا اشاریہ میرے پیش نظر ہے لیکن زیر نظر کتاب میں شرح و بسط کے ساتھ اس کا تنقیدی جائزہ صفحات کی تنگ دامانی کے سبب میرے لیے ممکن نہیں۔ لہٰذا غالب پر ان کی تنقید کے نمایاں پہلوؤں کی نشاندہی کی جا رہی ہے۔

سرور صاحب کے وہ مضامین جو مطالعہ غالب میں عموماً رہنما بنے اور غالب شناسی و غالب فہمی کو مروج و مقبول بنانے میں ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حسب ذیل ہیں:

۱۔ غالب — سال تصنیف (قیاساً) ۱۹۴۱ء

۲۔ غالب عہد اور شاعری — سال تصنیف (قیاساً) ۱۹۴۱ء

۳۔ خطوط میں شخصیت (غالب) — سال تصنیف (قیاساً) ۱۹۴۲ء

۴۔ غالب کی عظمت — سال تصنیف (قیاساً) ۱۹۴۹ء

۵۔ غالب کا ذہنی ارتقاء — سال تصنیف (قیاساً) ۱۹۵۲ء

۶۔ اردو غزل: میر سے غالب تک — سال تصنیف (قیاساً) ۱۹۵۳ء

۷۔ غالب اپنی شخصیت کے آئینہ میں — سال تصنیف (قیاساً) ۱۹۵۵ء

۸۔ غالب کی شاعری کی معنویت - سال تصنیف (قیاساً) ۱۹۶۹ء

۹۔ غالب اور جدید ذہن — سال تصنیف (قیاساً) ۱۹۶۹ء

۱۰۔ پورے غالب — سال تصنیف (قیاساً) ۱۹۶۹ء

۱۱۔ ہندستانی نشاۃ الثانیہ اور غالب — سال تصنیف (قیاساً) ۱۹۹۱ء

ان مضامین میں سرور صاحب نے نئی اور چونکا دینے والی باتیں نہیں کہی ہیں جیسا کہ ان کے دور کے بعض ناقدوں نے غالب کے بارے میں ایسی باتیں کہہ کر مدتوں بحث و تمحیص کا بازار گرم رکھا ہے۔ سرور صاحب نے انتہائی سنجیدگی، ذمہ داری، اعتدال و توازن کے ساتھ غالب کا مقام و مرتبہ متعین کرتے ہوئے، عصر حاضر میں اس کے کلام کی معنویت پر غور وخوض کیا ہے۔ ماضی میں اس کے معاصرین نے اسے کس طور سمجھا، وفات کے بعد اس کے عقیدت مندوں نے اسے کس طور سمجھنے کی کوشش کی، وہ ان دونوں پہلوؤں پر نگاہ ڈالتے ہیں اور غالب کی حقیقی عظمت ماضی وحال کے فنی اکتسابات کی روشنی میں تلاش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے مذکورہ بالا مضامین کے ذریعے کوشش کی ہے کہ اردو شاعری کے تاریخی، وجمالیاتی پس منظر میں غالب ایک عجوبہ مخلوق نہ سمجھے جائیں بلکہ وہ اسی ادبی وشعری تاریخ کا حصہ سمجھے جائیں جو ایک روایتی تسلسل کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے اور جس سے ہم اور ہمارا عہد بھی وابستہ ہے۔ البتہ غالب نے اُس عہد

اور اُس عہد کی روایت کو کس حد تک متاثر کیا؟ کس حد تک اس سے انحراف و تقلید کی؟ کس حد تک اس کی توسیع میں حصہ دار بنے؟ دراصل یہی مطالعہ کا موضوع بننا چاہیے۔

سرور صاحب نے غالب کا مطالعہ اسی طور کیا ہے۔ ان کا مطمح نظر غالب کو اس کے اصل فریم میں دیکھنا ہے۔ افراط و تفریط سے بچتے ہوئے غالب کے اکتساباتِ شعری سے اس کی اصل حیثیت و معنویت کو منظر عام پر لانا ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ انہوں نے غالب کا مطالعہ کسی آئیڈیالوجی یا نظریے کی بنیاد پر نہیں کیا اور نہ ہی کسی تنقیدی خانے میں رکھ کر ان پر کسی ایک زاویے سے روشنی ڈالی بلکہ انہوں نے غالب کو ماضی و حال کے مختلف زاویوں سے دیکھا اور پرکھا۔

سرور صاحب نے غالب کے جن بے شمار پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے اگر ہر مضمون کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے تو یہ تحریر ایک طویل مقالہ کی صورت اختیار کر لے گی۔ لہٰذا ان کے متعدد مضامین سے مختصر اقتباسات درج کر کے ان کے مجموعی نقطۂ نظر پر روشنی ڈالی جا رہی ہے: پہلا مضمون غالب مشمولہ ''نئے اور پرانے چراغ'' سے چند اقتباسات:

☆ ''دنیا کے لذائذ سے ممتتع ہونا، اپنی ذات کو آگے رکھنا، اپنی دنیا الگ بنانا غالب نے اپنے ماحول سے سیکھا۔''

☆ ''فارسی ترکیبیں، فارسی انداز بیان، نازک خیالی بلکہ خیال بندی مصنوعی اور بعض جگہ بے کیف دماغی ورزش ان سب کا پتا ان کے پہلے دور کی شاعری میں ملتا ہے۔''

☆ ''میر کے رنج والم میں اگرچہ ایک مرض کی سی کیفیت ہے مگر اس کی بنیاد صداقت پر ہے۔ غالب کا رنج والم ایک قسم کی دماغی عیاشی ہے۔''

☆ ''غالب نے کسی نئی صنف سخن کی بنیاد نہیں ڈالی، نہ کوئی نیا موضوع اردو شاعری کو بخشا۔ انہوں نے جو تصرفات کیے وہ معنوی ہیں۔''

☆ ''ان کا کوئی فلسفۂ زندگی بھی نہ تھا جسے وہ اپنی غزلوں میں پیش کرنا چاہتے ہوں۔ وہ قنوطی تھے نہ رجائی۔''

☆ ''ان کے خاص خاص رجحانات ان کے کلام سے نہیں ان کے خطوط سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بعض مضامین کی تکرار سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ ان کے مستقل تاثرات ہیں لیکن ان کی بھول بھلیاں میں ایک واضح نقطۂ نظر کی کارفرمائی نہیں ملتی۔''

☆ ''غالب کے قصر شاعری کی بنیاد جدت طرازی پر ہے۔ اس جدت طرازی میں جدت تخیل، جدت طرز ادا، جدت استعارات، جدت تشبیہات، جدتِ محاکات، جدت الفاظ سب آجاتے ہیں۔ اردو غزل میں غالب ایک نیا خیال، ایک نیا تکلف، ایک نیا گوشہ فکر، ایک نیا ذہن، ایک نیا شعور لائے ہیں۔''

☆ ''غالب کے کلام کی ایک اور خصوصیت بلاغت ہے... یہی وجہ ہے کہ... کہیں تو تشبیہات و استعارات سے اس بلاغت کے لطف کو دوبالا کیا ہے اور کہیں سیدھے سادھے الفاظ میں وسیع سے وسیع مضامین کا احاطہ کرلیا ہے۔''

☆ ''غالب کی مقبولیت کا باعث ان کا تصوف نہیں بلکہ اس کے نفسیاتی حقائق ہیں۔''

مضمون ''غالب کی عظمت'' سے چند اقتباسات:

☆ ''اردو میں پہلی بھرپور، رنگارنگ شخصیت غالب کی ہے... اسی شخصیت کے اثر سے ان کی شاعری پہلودار اور تہہ دار ہے۔''

☆ ''غالب نے جب شاعری شروع کی تو نہ تو ان پر مذہب کے گہرے اثرات تھے نہ تصوف کے۔ ان کی بے چین اور شوخ طبیعت جو فارسی سے اسی طرح متاثر ہوچکی تھی جس طرح کوئی اپنی مادری زبان سے ہوتا ہے۔ رنگین خوابوں کی دلدادہ ہوگئی۔''

☆ ''غالب جب جوان ہوئے اور شعر کہنے لگے تو اپنے گردوپیش میں انہیں ذہنی آسودگی نہ ملی، اپنے اشعار میں ملی۔ ان اشعار میں کوہ کندن و کاہ برآوردن بھی ہے۔ الہام بھی اور اہمال بھی لیکن ان سے غالب کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔''

☆ ''ان کے یہاں مذہبیت نہ گہری ہے نہ زیادہ اہم.... ہاں ان کے یہاں جو وسیع المشربی ہے وہ ان کی انسان دوستی کو ظاہر کرتی ہے۔''

☆ ''عورت اور شراب ان کے نشاط زندگی کو بڑھاتے ہیں یہ ان کی زندگی نہیں ہیں۔ اردو شاعری میں ان کی مہذب رندی ایک نئی روایت کا آغاز کرتی ہے۔''

☆ ''غالب کی اردو فارسی شاعری کے بنیادی تصورات علیحدہ علیحدہ نہیں ہیں دونوں میں ایک فلسفیانہ مزاج ملتا ہے۔ کوئی گہرا فلسفہ نہیں ملتا۔''

☆ ''وہ فلسفیانہ ذہن رکھتے ہیں ان کا مزاج جذبے سے بڑھ کر فکر کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ تحلیلی نظر رکھتے ہیں انہوں نے اردو شاعری کو ایک ذہن دیا۔ یہ ذہن اپنے زمانے کے تہذیبی اثرات سے باخبر ہے۔ فلسفے اور تصوف کے مسائل کو جانتا ہے۔ مذہبی اور اخلاقی قدروں سے آشنا ہے مگر ان میں سے کسی کا پوری طرح پابند نہیں ہے۔''

☆ ''ان کا حکیمانہ اور شاعرانہ استدلال بکھری ہوئی منتشر اور پراگندہ تصویروں میں کوئی ربط اور معنی ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ اس انداز نظر، اس گرمی اندیشہ، اس اشارت اور عبارت سے ہمیں ذہنی تسکین میسر آتی ہے۔ اور اس کے اثر و معنی میں ہمیں اپنے رمز و معنی ملتے ہیں۔ انہیں معنی میں وہ آفاقیت رکھتے ہیں۔''

☆ ''غالب کے عشق میں سمرقند و بخارا، قدیم ایران اور ہندوستان تینوں مل جل گئے ہیں۔ اس وجہ سے غالب کا تخیل زیادہ حشر خیز ہے اور زیادہ خلاق۔''

☆ ''غالب ایک تہذیب کی پختگی کے آخری دور کی یادگار ہیں۔''

☆ ''اردو غزل کو انہوں نے جذباتی سطحیت اور ادنیٰ لفظ پرستی کے بجائے گہری رمزیت اور رنگین معنی آفرینی سکھائی۔''

☆ ''غالب کی شاعری میں انسان اور ادب پہلی دفعہ بے سہارے کے اپنی عظمت کے بل پر کھڑے نظر آتے ہیں۔''

مضمون ''غالب اور جدید ذہن'' سے چند اقتباسات:

☆ ''میرے نزدیک نسخہ حمیدیہ کے اشعار کا مطالعہ جتنا گہرا ہوگا، غالب کی عظمت اتنی ہی واضح ہوگی۔ غالب کے بہت سے بلند پایہ اشعار یا تو بجنسہٖ نسخہ حمیدیہ میں موجود ہیں یا ان کے نقش اول کی بنیاد پر نقشِ ثانی تیار کیا گیا ہے۔''

☆ ''غالب نے نسخہ حمیدیہ کے بیشتر اشعار کو خارج کر دیا مگر بہت سے اشعار پر نظر ثانی کر کے ایک مفاہمہ کیا۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ مفاہمہ غالب کو خاصا مہنگا پڑا۔''

☆ ''غالب آدمی تھے انسان نہ تھے۔ ان کی زندگی خاص رنگ رلیوں میں گزری۔ انہوں نے اس بات کو کبھی چھپایا نہیں۔ وہ مذہبی آدمی نہ تھے، دنیادار آدمی تھے مگر وہ مذہب کی روح سے آشنا تھے۔ اور اس نے انہیں ایک رواداری اور وسیع المشربی اور انسان دوستی عطا کی تھی... مگر انہوں نے اپنے فن کو کبھی ذلیل نہیں کیا۔ قصائد میں بھی تشبیب کو مدح سے زیادہ اہمیت دی۔ فن کی وجہ سے فنکار عزیز اور محترم ہونا چاہیے فن کار کی وجہ سے فن نہیں۔''

☆ ''غالب ازمنہ وسطیٰ کے آدمی تھے مگر ان کی عظمت یہ ہے کہ وہ ازمنہ وسطی سے آگے بھی دیکھتے تھے۔ ان کو صرف حیوان ظریف کہہ کر یا صرف ان کی قنوطیت یا رجائیت، ان کے تصوف یا ان کی عشقیہ شاعری یا ان کے استعاروں اور ذہنی پیکروں کا تذکرہ کر کے ہم ان کی عظمت کا احاطہ نہیں کر سکتے۔''

☆ ''غالب نے اردو شاعری کو ایک ذہن دیا۔ اور ایسی زبان جو فکر کی گرمی کا ساتھ دے سکے۔ غالب نہ ہوتے تو اقبال بھی نہ ہوتے اور نہ جدید شاعری میں پیچیدگی اور خیال کی تہوں کو سمونے کی کوشش۔ غالب ہمارے لیے ایک شخص نہیں ہیں۔ ایک ذہنی فضا ہیں۔''

☆ ''نسخہ حمیدیہ میں خس و خاشاک بھی ہے۔ مگر قانونِ باغبانِ صحراء میں خس و خاشاک سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ آخر عمر میں غالب سہل ممتنع پر بہت زور دینے لگے تھے اور خود اپنے کلام میں بھی سہل ممتنع پر بہت اصرار کرتے تھے لیکن غالب کی عظمت ان کے سہل ممتنع میں نہیں ہے۔ حقیقی غالب کی جھلک نسخہ حمیدیہ میں نظر آتی ہے۔ یہاں خیال کا نشہ ہے آگے چل کر اس خیال کو بہتر لباس ضرور عطا کیا گیا ہے۔''

مضمون ''غالب کی شاعری کی معنویت'' سے اقتباسات:

☆ ''ہمارا ادبی سرمایہ ہمالہ کے ہندوستان کی طرح نظر آتا ہے جس میں غالب ایورسٹ کی چوٹی کی طرح ہیں۔''

☆ ''غالب کے یہاں ایک مرتب نظریہ زندگی تلاش کرنا اس لیے بے سود ہے کہ غالب جانتے ہیں کہ زندگی ایسی پیچیدہ اور تضادات سے ایسی مملو ہے کہ اسے کسی فارمولے میں مقید نہیں کیا جاسکتا اور نہ اسے کوئی لیبل دیا جاسکتا ہے کیونکہ ہر فارمولا اور لیبل زندگی کے کسی ایک پہلو کی عکاسی کرے گا کوئی دوسرا پہلو اس کی گرفت سے نکل جائے گا۔''

☆ ''غالب کے وہ اشعار جو نسخہ حمیدیہ میں ہیں لیکن متداول دیوان میں نہیں ہیں اس لیے اہمیت رکھتے ہیں کہ انہیں نے غالب کو غالب بنایا۔ نسخہ حمیدیہ کے جواہر پاروں پر اس لیے لوگوں کی نظر نہیں پڑی کہ انھوں نے حالی کی رائے سے متاثر ہو کر اس پر گہری نظر نہیں ڈالی۔ ورنہ یہ اشعار کسی طرح نظر انداز نہیں کیے جا سکتے تھے۔''

مضمون ''پورے غالب'' سے چند اقتباسات:

☆ ''غالب کے فکر وفن دونوں کی روح تک پہنچنے کے لیے نسخہ حمیدیہ کا مطالعہ بہت اہم ہے۔ غالب کی اس دور کی شاعری میں یہ بات خاص طور سے توجہ کے لائق ہے کہ اس عمر میں جب غالب خود اپنے بیان کے مطابق 'فرِ فرہنگ سے بیگانہ اور نام ونگ کے دشمن' تھے ان کے یہاں آرائشِ خم کاکل سے زیادہ اندیشہ ہائے دور دراز اور جسم کی پکار سے زیادہ روح کی پیاس، حسن کی سحر انگیزی سے زیادہ عشق کی دیدہ وری ملتی ہے۔''

☆ ''نسخہ حمیدیہ کے اشعار پر غور کرنے سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے۔ یہاں غالب کے بہت سے بعد کے اشعار اور تراکیب کا نقش اول نظر آتا ہے۔ یعنی غالب کا تخیل نسخہ حمیدیہ کی تکمیل تک صورت گر اور خلاق ہو چکا تھا۔''

گیارہ مضامین میں سے ہم نے ۵ مضامین سے اقتباس درج کیے اور کوشش کی کہ ایمائیت واشاریت رکھنے والے نثری ٹکڑوں حسین و دلکش انشا پردازانہ جملوں سے احتراز کیا جائے تاکہ ان کے حقیقی خیالات صاف طور پر واضح ہو سکیں۔ ان اقتباسات کے مطالعے سے کئی باتیں واضح ہوتی ہیں۔

☆ اول یہ کہ سرور صاحب نے غالب پر خواہ کسی عنوان سے لکھا ہو وہ عنوان کے پابند نہ رہ کر مجموعی طور پر غالب کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

☆ وہ غالب کو اپنے خاندانی اور ماحولی ورثہ سے الگ کر کے نہیں دیکھتے۔ ان کی شخصیت میں جو خوبیاں، خامیاں، بے اعتدالیاں دیکھتے ہیں اسے کلی طور پر ماحول کا آفریدہ بھی قرار نہیں دیتے بلکہ غالب کے اپنے مزاج وشعور کو بھی اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے انہیں جبر واختیار دونوں سے گزارتے ہیں اسی لیے وہ غالب کو آدمی کہتے ہیں انسان نہیں۔

☆ وہ غالب کے کلام سے کسی مخصوص نقطۂ نظر کی تلاش کو بھی بے سود خیال کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں غالب زندگی کے مختلف رنگوں، کیفیتوں، نفسیاتی حقیقتوں سے باخبر ہے اور ان پر حکیمانہ نظر رکھتا ہے۔ اسی طرح مذہب، فلسفہ، تصوف بھی اس کے رنگ ہیں لیکن وہ ان میں کسی کا بھی پابند نہیں۔ اس کی مضطرب طبیعت کسی ایک موضوع، کسی ایک رنگ، کسی ایک نقطہ نظر پر قناعت نہیں کرسکتی۔ بایں طور وہ نہ تو کسی صنف سخن کا موجد ہے اور نہ کسی موضوع کا اردو شاعری میں اضافہ کرنے والا۔ اس کے جو بھی تصرفات ہیں وہ یا تو معنوی ہیں یا ان کا تعلق فکر و اسلوب کی جدت طرازی سے ہے۔ اور یہ جدت طرازی اس کے کلام کی ہر صورت پر نمایاں ہے۔ یہ تصرفات ہی دراصل اردو شاعری میں ایک نئی ذہنی فضا بنانے میں کامیاب ہوئے۔

☆ وہ غالب کو کسی نظریے، آئیڈیالوجی، علم وفن کے مخصوص سانچے یا خانے سے متعلق کر کے بھی نہیں دیکھتے ان کی نظر میں غالب نہ فلسفی ہے، نہ صوفی، نہ مجاہد آزادی۔ وہ صرف ایک فنکار ہے اور فنکار کی فکر، تجربے، احساس، کا ماضی و حال سے جو انتہائی مہذب، مشکک، شاعرانہ اور حکیمانہ رشتہ ہوسکتا ہے وہ غالب کا ہے۔

☆ وہ غالب کی مشکل پسندی کو عیب نہیں بلکہ ان کی شخصیت وشاعری اور ان کے لہجے کی بناوٹ کا خمیر خیال کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ نسخہ حمیدیہ کے مطالعہ پر زور دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں وہ کلام جو غالب نے اپنے عہد کے مروجہ معیاروں اور ذہنی

سانچوں کے سبب قلم زد کردیا تھا دراصل وہ غالب کی حقیقی شاعرانہ صلاحیتوں اور ان کی انفرادیت کے ابتدائی مرحلوں کا غماز ہے۔ بے معنی اور بامعنی کی بحث کے باوصف اس پر توجہ ناگزیر ہے۔ کیونکہ یہ وہ نقش اول ہے جس کی بنیاد پر نقش ثانی تیار ہوا (یعنی متداول دیوان)۔ لہٰذا اس کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ ناگزیر ہے۔

سرور صاحب نے غالب کو بجنوری کی طرح ممدوح بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ ان کا غیر جانبدارانہ اور غیر معتقدانہ مطالعہ کیا ہے۔ اس مطالعے میں خس و خاشاک کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔ لیکن سرور صاحب کی اکثر تحریروں کی طرح غالب سے متعلق یہ مضامین بھی مثالوں اور ان کے تجزیوں سے تہی داماں ہیں۔ ان میں اکثر خیال انگیز جملوں سے بھی کام لیا گیا ہے جن پر بڑے غور وخوض کے ساتھ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

موجودہ دور میں ان کی شاعرانہ نثر، خیال انگیز جملوں، حسین فقروں، رنگین اشاروں پر اعتراض وارد کیے گئے ہیں اور ان کو سامنے رکھ کر تضادات بھی دکھائے گئے ہیں۔ مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن نے ''غالب مدح وقدح کی روشنی میں'' (ص ۱۷۳ تا ۱۹۰ اعظم گڑھ ۱۹۸۸ء) سرور صاحب کے تین مضامین (غالب، غالب کی عظمت، غالب کا ذہنی ارتقا) کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی تنقید کو ہدف بنایا ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب غالب پرستی کا سیلاب تھم جائے گا۔ اور غالب کا مطالعہ اردو شاعری کے تاریخی سیاق وسباق میں کیا جانے لگے گا۔ اس وقت آل احمد سرور کے یہ مضامین غالب شناسی و غالب فہمی کے سنجیدہ مطالعے میں رہبری کا فریضہ انجام دیں گے۔
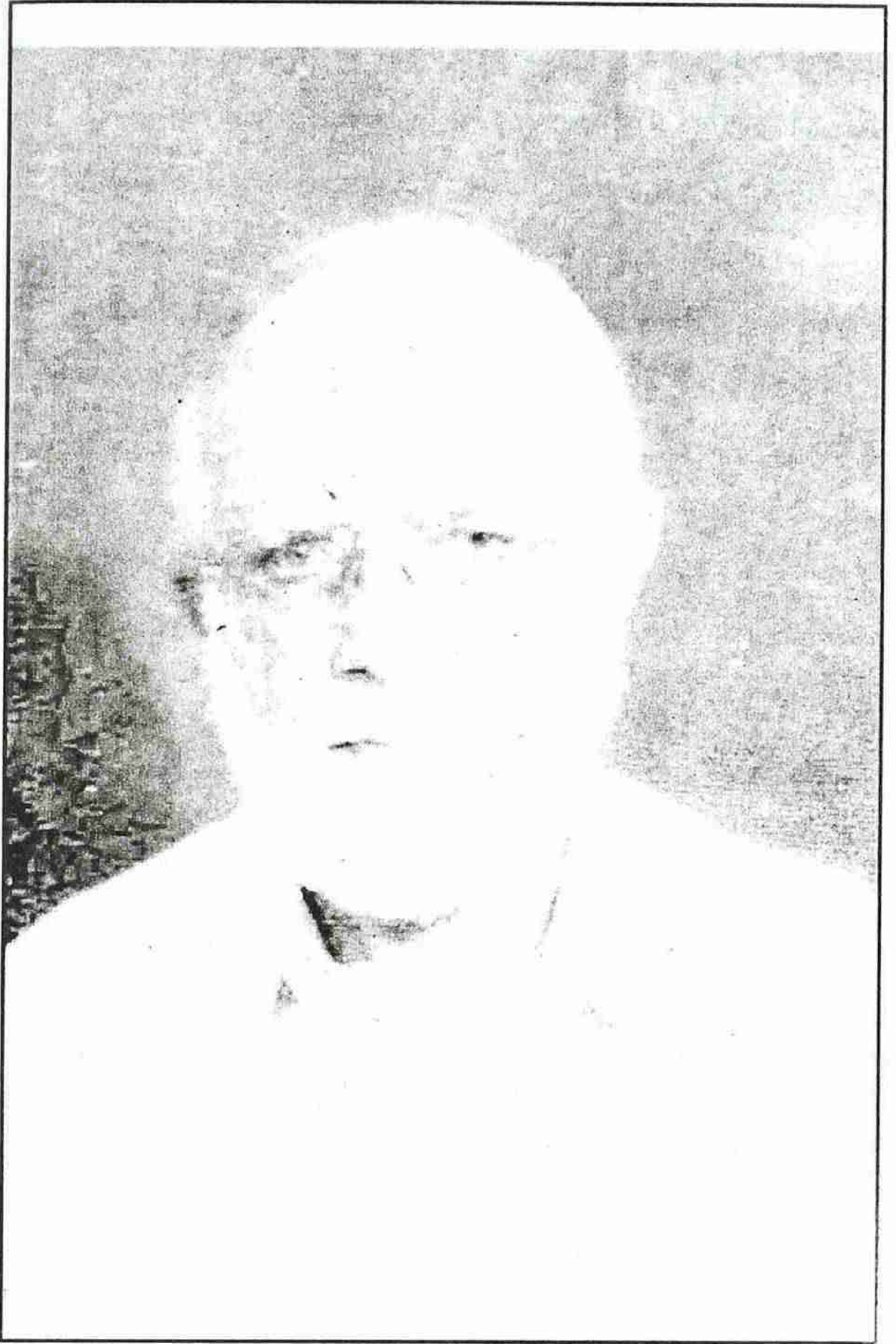
حنیف نقوی

حنیف نقوی

غالب کے محققین کی پہلی نسل میں مندرجہ ذیل حضرات شامل ہیں:

مولوی مہیش پرشاد (۱۸۹۰ء - ۱۹۵۱ء)، مولوی غلام رسول مہر (۱۸۹۵ء-۱۹۷۱ء)، مولانا امتیاز علی خاں عرشی (۱۹۰۴-۱۹۸۱ء)، قاضی عبدالودود (۱۸۹۶ء-۱۹۸۴ء)، مالک رام (۱۹۰۶ء- ۱۹۹۳ء)، کالیداس گپتا رضا (۱۹۲۵ء- ۲۰۰۱ء)، پروفیسر نذیر احمد (۱۹۱۵ء- ۲۰۰۸ء)۔ اس نسل کے تین ناموں (عرشی، مالک رام، گپتا رضا) کے ساتھ ماہر غالبیات کا لاحقہ بھی لگا دیا گیا۔ دوسری نسل کے محققین میں متعدد نام شامل کیے جاسکتے ہیں لیکن میری نظر میں یہ چند اہم ہیں:

اکبر علی خاں عرشی زادہ (۱۹۴۲ء-۱۹۹۷ء)، ڈاکٹر حنیف نقوی (پیدائش ۱۹۳۶ء)، کاظم علی خاں (پیدائش ۱۹۳۶ء)، ڈاکٹر خلیق انجم (پیدائش ۱۹۳۵ء)، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (پیدائش ۱۹۴۲ء)، نثار احمد فاروقی (۱۹۳۴-۲۰۰۴ء)، عبدالروف عروج۔ اس نسل میں ماہر غالبیات کے اعزاز کے مستحق ڈاکٹر حنیف نقوی قرار دیے جاسکتے ہیں۔

حنیف نقوی، نہ صرف غالب کی زندگی، تصانیف اور عہد کے واقف کار ہیں بلکہ غالبیات کے تحت جو ادب پیش کیا گیا ہے اس پر بھی عالمانہ اور محققانہ نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی زندگی اور فن سے متعلق بہت سے مفروضات، نظریات، واقعات جن کو غالب شناسوں نے قبول کر لیا تھا اور جن کو حتمی صورت میں پیش کر کے ان پر تاریخی صداقت کی مہر ثبت کر دی گئی تھی، حنیف نقوی نے ان کی صحت پر کاری ضرب لگائی اور ان کے کمزور پہلوؤں کو نمایاں کر کے بہ دلائل یہ ثابت کر دیا کہ یہ جن بنیادوں پر قابلِ قبول بنے ہیں وہ بنیادیں ہی سراسر مشکوک ہیں۔ انہوں نے بعض غالب شناسوں کے کام پر تصحیحات بھی پیش کیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا ہے:

> ''حیرت ہوتی ہے کہ حنیف نقوی کو غالب سے متعلق افراد، غالب کی فارسی تحریروں اور فارسی ادبیات کا اتنا گہرا عرفان ہے۔ وہ... چوٹی کے محقق غالب ہیں۔''
>
> (رموز غالب، ص: ۷۴۳ بحوالہ مآثر غالب، طبع سوم، ص ۱۲)

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے لکھا ہے:

> ''(حنیف نقوی) غالب کی خود اپنی تحریروں نیز غالب سے متعلق دوسروں کی تحریروں سے پوری طرح باخبر ہی نہیں، ان پر حاوی بھی ہیں۔'' (نقش معنی، دہلی ۲۰۰۰ء، ص: ۱۸۵)

بیسوی صدی کے نصف دوم میں حنیف نقوی نے غالب کو اپنی فکر کا مرکز بنایا۔ انہوں نے ۱۹۵۶ء میں غالب پر پہلا مقالہ بہ عنوان 'خطوطِ غالب کی نفسیات'' (مطبوعہ شاعر، بمبئی، فروری ۱۹۵۶) لکھا۔ یہ بقول خود، ان کی اولین مطبوعہ تحریر تھی (شاعر بمبئی، ہم عصر اردو ادب نمبر ۱۹۹۷ء، ص ۲۴۸)۔ ۱۹۵۶ء سے جون ۲۰۰۳ء تک تقریباً ۴۷ سال کی مدت میں انہوں نے جہاں اور بہت سے موضوعات پر مضامین و مقالات لکھے ہیں، وہیں مختلف اوقات میں غالب اور غالبیات کے تعلق سے وقیع علمی و تحقیقی کارنامے انجام دیتے رہے ہیں۔ انہوں نے ۴۷ سال کی مدت میں ۲۹ مقالے اور

۲ کتب تالیف کیں جن کی تفصیل اشاریے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ کمیت کے لحاظ سے یہ کام دوسرے ماہرین غالبیات کے کاموں سے نسبتاً کم ہے لیکن کیفیت کے لحاظ سے یہ بیشتر سابقہ کام پر اضافہ ہے۔ ۲۹ مقالات میں سے چند مقالات کا موضوع غالب کی زندگی اور فن سے متعلق وہ نظریات ہیں جن کی بنیاد تاریخ کے کمزور ماخذ پر رکھی گئی ہے، یا جن کو روشِ زمانہ کے مطابق کثرت سے دہرائے جانے کے سبب قبول کر لیا گیا ہے۔ مثلاً غالب کا سالِ ولادت، غالب کا سفر کلکتہ؛ غالب اور معارضہ کلکتہ ــــ بعض غالب کے معاصرین سے متعلق ہیں۔ مثلاً منشی نولکشور اور غالب؛ غالب اور علامہ فضل حق خیرآبادی ــــ اور بعض کا تعلق غالب کی تصنیفات سے ہے مثلاً غالب کی چند فارسی تصانیف (یہ ایک مستقل کتاب ہے)۔ پنج آہنگ، ترتیب سے اشاعت تک؛ باغِ دو در، دریافت سے تدوین تک؛ دستنبو، غالب کا روزنامچہ غدر؛ غالب کی چھٹی فارسی مثنوی ــــ بعض کا تعلق خطوط سے ہے مثلاً غالب کے چار غیر مطبوعہ خطوط؛ غالب کا ایک فارسی خط؛ غالب کے فارسی خطوط۔ ان کے علاوہ بعض متفرق موضوعات پر بھی انہوں نے متعدد مضامین لکھے ہیں۔

تحقیق میں احتساب کا عمل بھی ایک خاص معنویت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس عمل کو بروے کار لاتے ہوئے ممتاز ماہر غالبیات مالک رام کی معروف تالیف تلامذہ غالب طبع اول و دوم پر دو مقالے لکھے ہیں۔ جن میں ''تلامذۂ غالب'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس میں واقع تسامحات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ نہ صرف نشاندہی بلکہ متعلقہ امور پر اضافے بھی کیے ہیں اور تصحیحات بھی پیش کی ہیں۔ مالک رام نے طبعِ دوم میں اُن کے پہلے مقالے سے استفادہ کیا ہے اور پیش لفظ میں اعتراف اور متعلقہ مقامات پر اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے اردو خطوط کا کلیات، ''غالب کے خطوط'' کے نام سے ۴ جلدوں میں مرتب کیا۔ حنیف نقوی نے جلد اول پر تین قسطوں میں طویل مقالہ لکھا اور اس جلد میں راہ پا جانے والے تسامحات کی نشاندہی کی۔ بعد میں یہ سلسلہ نہ معلوم کیوں موقوف کر دیا گیا۔ اسی احتسابی عمل کے تحت قاضی عبدالودود کی تالیف ''ماثر غالب'' بھی ان کی توجہ کا مرکز بنی۔ بقول ڈاکٹر گیان چند جین:

”قاضی صاحب کے حواشے کے بعد ڈاکٹر حنیف نقوی نے اول الذکر پر اس تفصیل سے حواشی لکھے ہیں کہ اضافے تو اضافے تصحیحات کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ وہ واحد آدمی ہیں جس نے قاضی صاحب کی تحریر میں اتنی زیادہ تصحیحات و توضیحات کی ہیں۔“

(قاضی عبدالودود بہ حیثیت مرتب متن، ص:۹۹)

عام طور پر اس طرح کے عمل کو خوردہ گیری، منفی یا تخریبی تحقیق سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن اگر یہ عمل قطعی طور پر موقوف ہو جائے تو ہمارا علمی سرمایہ جہاں تاریخی صداقت سے محروم ہو جائے گا وہیں علمی ترقیوں اور موضوعات کی وسعتوں سے ہم کنار نہیں ہو سکے گا۔ تحقیقی کام پر نظر ثانی کرنا بہت ضروری ہے۔

مذکورہ صدر مقالات کے علاوہ انہوں نے غالب کی مثنوی ”چراغ دیر“ کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ اور غالبیات سے متعلق چند کتابیں بھی تصنیف و تالیف کی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ غالب احوال و آثار (سات مقالات کا مجموعہ مع پیش لفظ مالک رام)
شائع کردہ: نصرت پبلشر، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء

۲۔ ماثر غالب، مرتب اول، قاضی عبدالودود
مرتب ثانی، حنیف نقوی، شائع کردہ ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ، ۱۹۹۵ء
بار دگر شائع کردہ: ادارہ یادگار غالب، کراچی ۲۰۰۰ء

۳۔ پنج آہنگ۔ قدیم ترین قلمی نسخہ، عکسی ایڈیشن
شائع کردہ۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۷ء

۴۔ غالب کی چند فارسی تصانیف (زیر اشاعت)

۵۔ تقویم غالب (غیر مطبوعہ)

۶۔ مولوی مہیش پرشاد بہ حیثیت غالب شناس
(زیر ترتیب، سوانح اور غالب سے متعلق مضامین)

مذکورہ کتب و مقالات کے عنوانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حنیف نقوی کو غالب کے پیش کردہ فارسی ادب اور اس کے متعلقات سے غیر معمولی دلچسپی ہے۔ قاضی عبدالودود کے بعد فارسی میں غالب کی ادبی کاوشوں پر بہ استثنا پروفیسر نذیر احمد دقیق تحقیقات کا سلسلہ رک گیا تھا اور ماضی میں غالب سے متعلق جو کتابیں فارسی ادب کے حوالے سے معرض وجود میں آئی تھیں ان پر مزید اضافوں اور مفید حواشی، تصحیحات و توضیحات کا کوئی تصور بھی نہیں کرتا تھا۔ حنیف نقوی نے اس تصور کو بدلا اور ماضی میں کیے جانے والے کام کا علمی محاسبہ کیا۔ تحقیق کے جدید اصولوں کو بروئے کار لاکر غالب کی فارسی تصانیف اور فارسی شعر و ادب سے متعلق ان کے معاملات و تصورات کا از سر نو مطالعہ کیا اور اپنے نتائج مطالعہ کو بے کم و کاست پیش کر دیا۔ سطور ذیل میں ان کی دو مطبوعہ کتب کا تعارف و جائزہ پیش کیا جا رہا ہے اس سے ان کی اپنے موضوع پر گرفت، تحقیقی، طریقہ کار اور عمیق مطالعے کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

غالب احوال و آثار

اس مجموعے میں سات مقالات شامل ہیں، جو بقول مصنف نومبر ۱۹۸۰ء سے اگست ۱۹۸۶ء کے درمیان ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہوئے۔ مصنف کے ''پیش گفتار'' کے علاوہ مالک رام (ف ۱۹۹۳ء) کا پیش لفظ بھی ہے جو کئی اعتبار سے اہم ہے۔ اس میں انہوں نے حنیف نقوی کے علم و فضل اور تحقیقی طریقہ کار کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے اور حنیف نقوی کے مابین نتائج کے اختلاف کا اعلیٰ ظرفی کے ساتھ اظہار کیا ہے اور حنیف نقوی کی محنت کی داد دی ہے۔ مجموعے میں شامل ساتوں مقالات پر اظہار خیال کیا جا رہا ہے۔

ا۔ غالب کا سالِ ولادت:

یہ اس مجموعے کا اہم مقالہ ہے۔ چالیس صفحات پر مشتمل اس مقالے میں مصنف نے غالب کی عام طور پر تسلیم شدہ، تاریخ ولادت، ۸ رجب ۱۲۱۲ھ پر اعتراض وارد

کیا ہے۔ غالب کی جملہ تحریروں، کتب و خطوط اور زائچے کی مدد سے انہوں نے غالب کا سالِ ولادت یکشنبہ ۸ رجب ۱۲۰۸ھ/ ۹ فروری ۱۷۹۴ء طے کیا ہے۔ انہوں نے اولاً ۱۲۱۲ھ کے حق میں پیش کیے جانے والے بیس دلائل پیش کیے ہیں پھر ان دلائل (بیانات) کے خلاف جانے والے دلائل پیش کر کے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔ حنیف نقوی کی یہ ساری بحث دراصل تمام غالب شناسوں کے خلاف جاتی ہے۔ مالک رام بالخصوص اس کی زد میں آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسی کتاب کے دیباچے میں یہ لکھ کر اپنی برأت کا اظہار کیا ہے:

> ''میرے خیال میں اُن کا استدلال صحیح نہیں ہے۔ غالب نے قیاسی اور تخمینی انداز میں اپنی عمر متعدد جگہ لکھی ہے اور اس میں اختلاف ہے۔ اسی سے موصوف (حنیف نقوی) نے گفتگو کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ ۱۲۰۸ھ میں پیدا ہوئے تھے لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہ جب بھی صراحت سے اپنی تاریخ ولادت کا ذکر کرتے ہیں تو سال ۱۲۱۲ھ یا تاریخ ۸ رجب (۱۲۱۲ھ) ہی لکھتے ہیں۔ عمر سے متعلق تخمین اور قیاس اس صراحت کے مقابلے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔'' (دیباچہ، ص: ۱۲، ۱۳)

حنیف نقوی کے بقول غالب نے دانستہ اپنی عمر چار سال کم کر کے بیان کی تھی۔ اس دانستہ غلط بیانی کے محرکات پر بھی انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔

۲۔ غالب کا سفر کلکتہ:

اکتیس صفحات پر مشتمل دوسرا مقالہ ہے۔ کلکتہ کے سفر کو حنیف نقوی نے غالب کی زندگی کا اہم ترین واقعہ قرار دیا ہے۔ اس سفر کے بارے میں غالب کے مختلف مواقع پر مختلف و مبہم بیانات ملتے ہیں۔ بایں سبب اس سفر کی تفصیلات پر گفتگو نہیں ہو سکی۔ غالب شناسوں میں سے کسی نے کسی ایک بیان پر اصرار کیا اور کسی نے دوسرے بیان پر۔ حنیف نقوی نے اس سفر کی جملہ تفصیلات (سفر کا مقصد، سفر کی منزلیں، اثنائے راہ قیام، ملاقاتیں، شعری و ادبی کارگزاریاں خصوصاً لکھنؤ کی۔ کلکتہ میں پیش آنے والے معاملات

و واقعات) کو تاریخی پس منظر میں دیکھتے ہوئے ایک متفقہ نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ان کے بقول:

''چار، سوا چار سو میل کا یہ طویل سفر پورے ترپن (۵۳) دن میں طے کر کے مرزا صاحب سہ شنبہ ۴؍شعبان ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۹؍فروری ۱۸۲۸ء کو ...کلکتے پہنچے (نامہ ہائے فارسی غالب، ص:۲۶)... کلکتے میں وہ جمعہ ۱۳ صفر ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۴؍اگست ۱۸۲۹ء تک قیام پذیر رہے۔ کامل ڈیڑھ برس کی اس مدت میں انہوں نے اپنے مقدمے کی پیروی کے پہلو بہ پہلو ادبی محاذ پر اپنی انفرادیت اور امتیاز کا لوہا منوانے میں بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی...دہلی سے کلکتے تک کے سفر میں ایک گھوڑا، ایک سائیس، ایک چرکٹا، تین ذاتی خدمت گار اور ایک کہار مرزا صاحب کے ساتھ تھے۔ کلکتہ پہنچنے کے بعد جب معاملات طول کھینچتے ہوئے نظر آئے تو انہوں نے (۱۶ ربیع الثانی ۱۲۴۴ھ مطابق ۲۶؍اکتوبر ۱۸۲۸ء سے قبل) گھوڑا ڈیڑھ سو روپے میں فروخت کر دیا اور سائیس اور چرکٹے کو چھٹی دے دی۔ (نامہ ہائے فارسی غالب ص:۴۴، ۴۵) اس لیے واپسی کے سفر کا بڑا حصہ کشتی کے ذریعے طے ہوا۔ اگست کے وسط میں کلکتے سے روانہ ہو کر ...یکم جمادی الثانی مطابق ۲۹؍نومبر کو یکشنبہ کے دن اس طرح دہلی میں وارد ہوئے جیسے کوئی بچہ 'دبستان' میں اور قیدی 'زنداں' میں پہنچتا ہے۔
(ص:۸۲۔۸۳)

اس مقالے میں حنیف نقوی نے غالب کی جملہ فارسی و اردو تحریروں کو کھنگال کر، اس سلسلے میں غالب شناسوں کے پیش کردہ جملہ معلومات پر جرح و تعدیل کے بعد اثنائے سفر کلکتہ، مختلف مقامات پر ان کی آمد و قیام کی مدت اور تاریخوں کا بھی امکان بھر تعین کیا ہے۔ یہ مقالہ بھی اول الذکر مقالے کی طرح غالب شناسوں کے بعض مسلمہ بیانات کی تردید کرتا ہے۔

۳۔ غالب کی ایک غزل اور مرزا یوسف:

یہ اس مجموعے کا تیسرا مقالہ ہے، جس میں غالب کے متداول دیوان میں شامل ایک غزل کے مقطع:

دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی
میرزا یوسف ہے 'غالب' یوسف ثانی مجھے

کے حوالے سے غالب کے بھائی مرزا یوسف کے 'عالمِ ہوش و حواس' اور 'عالمِ دیوانگی و مدہوشی' کی روداد بیان کرتے ہوئے اس کے زمانہ تصنیف سے بحث کی ہے۔ حنیف نقوی کے بقول یہ غزل غالب کے قیام کلکتہ کی یادگار ہے اور اس کا زمانہ تصنیف اپریل ۱۸۲۸ء ہے۔ اس طرح انہوں نے مالک رام کے اس خیال کی کہ مندرجہ بالا شعر کسی تشویش ناک بیماری سے مرزا یوسف کی صحت یابی کے موقع پر کہا گیا تھا (فسانۂ غالب، ص:۴۱) کی بھی تردید کر دی ہے۔ حنیف نقوی کے طے کردہ زمانہ تصنیف کو متحقق مان لیا گیا۔ چنانچہ کالی داس گپتا رضا نے "دیوان غالب کامل" (طبع سوم حاشیہ ص:۳۶۷) میں اس کا زمانہ تصنیف قیام کلکتہ اپریل ۱۸۲۸ء ہی قرار دیا ہے۔ لیکن انہوں نے حنیف نقوی کا حوالہ نہیں دیا۔

۴۔ منشی نولکشور اور غالب:

منشی نولکشور (۱۸۳۶ء۔۱۸۹۵ء) کی حیثیت بہ ظاہر کسی ادیب و قلم کار کی نہیں لیکن ناشر کی حیثیت سے ان کی خدمات تاریخ ساز ہیں۔ اُن کا شمار تاریخ ادب کی مقتدر و سر برآوردہ شخصیات میں کیا جاتا ہے۔ غالب سے اُن کے کس نوعیت کے مراسم تھے؟ ان مراسم کے حوالے سے غالب نے منشی جی سے کیا فوائد حاصل کیے؟ اس کی روداد انہوں نے اس چوتھے مقالے میں پیش کی ہے جو ۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

حنیف نقوی کی اطلاع کے بموجب غالب کی تحریروں میں منشی نولکشور کا حوالہ ۱۳ر نومبر ۱۸۵۹ء سے پیشتر نہیں ملتا۔ جولائی ۱۸۶۰ء میں منشی میاں داد خاں سیاح

(ف ۱۹۰۷ء) کی وساطت سے ان کے درمیان براہ راست روابط قائم ہوئے۔ ۱۸/جولائی ۱۸۶۰ء کو غالب نے پہلا خط منشی نولکشور کو، ان کے اولین ''نامہ شوق'' کے جواب میں لکھا۔ بعد میں یہ تعلقات مستحکم ہوگئے۔ ۱۸۶۲ء کے اوائل میں 'اودھ اخبار' مرزا کو اعزازی طور پر جاری کردیا گیا۔

حنیف نقوی کے بقول (مرزا کے) ''دل میں مطبع نولکشور سے اپنی بعض کتابوں کی اشاعت سر اٹھارہی تھی۔'' بعد میں 'قاطع برہان' اور 'کلیات نظم فارسی' دونوں کتابیں مطبع نولکشور سے شائع ہوئیں۔ اشاعت سے قبل ان کتب کا اشتہار بھی ''اودھ اخبار'' میں شائع ہوا۔ اعلان طباعت کے ساتھ ہی مرزا غالب کا نام مطبع و اودھ اخبار کے حلقۂ مصنّفین میں شامل ہوگیا۔ چنانچہ غالب سے متعلق خبریں اور ان کے نتائجِ فکر و قلم بھی اخبار میں نمایاں طور پر شائع ہونے لگے۔

حنیف نقوی نے مرزا سے متعلق مطبوعہ خبریں، کلام کی اشاعت، کتب کی اشاعت سے متعلق اشتہارات، منشی جی سے مراسلت وغیرہ پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ دہلی میں غالب سے منشی جی کی ملاقاتوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اور طرفین کے ایک دوسرے کے متعلق (خاص کر ان ملاقاتوں کے حوالے سے) تاثرات بھی درج کیے ہیں۔ غالب کی وہ تصانیف جو اُن کی زندگی میں اس مطبع سے شائع ہوئیں، اُن کے تعلق سے مصنف و ناشر کے درمیان طے پانے والے معاملات کی صورت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ ''دعائے ماثور و منقول از امیر علیہ السلام'' کی اشاعت کے سنہ کا بھی قیاسی تعین کیا ہے۔ ''نامہ غالب'' اور ''مثنوی دعائے صباح'' کی اشاعت کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ منشی نولکشور نے غالب کی وفات (۱۸۶۹ء) کے بعد جو کتب اپنے مطبع سے شائع کیں مثلاً کلیات غالب، دیوان غالب، عود ہندی؛ ان کی بھی تفصیلات پیش کی ہیں۔

یہ مقالہ منشی نولکشور اور غالب کے باہمی روابط سے متعلق جملہ معاملات و واقعات کی نشاندہی کرتا ہے اور اس موضوع پر دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔

۵۔۔ غالب سے منسوب ایک شعر:

اردو کے متعدد اشعار اپنی اصل ہیئت بدل کر دوسرے معروف شعرا کے نام سے مشہور ہو چکے ہیں۔ یہ معاملہ ضرب المثل اشعار کے ساتھ زیادہ پیش آیا ہے۔ اس قسم کا ایک شعر یہ بھی ہے جو غالب کی طرف منسوب ہے:

چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ سامان نکلا

یہ شعر غالب کے متداول دیوان اور اس کے قلمی نسخوں میں نہیں ملتا۔ پہلی مرتبہ اس نے نظامی بدایونی کے مرتبہ دیوان غالب (بدایوں ۱۹۲۰ طبع سوم) میں ''وہ اشعار جو دیوان مروجہ میں نہیں'' کے زیرعنوان جگہ پائی۔ دیوان غالب میں اس شعر کے اندراج نے غالب سے اس کی نسبت کی کسی حد تک توثیق کر دی۔ اس سے پیشتر یہ اردو معلیٰ کے ستمبر ۱۹۱۰ء کے شمارے میں غالب سے منسوب ہوا تھا۔ (غالب کا ایک شعر از شوکت بلگرامی)

حنیف نقوی نے اپنے مقالے میں اسے منیر شکوہ آبادی کے پوتے عاشق حسین بزم اکبرآبادی (ف ۱۹۵۳ء) کا نتیجہ فکر قرار دیا ہے۔ انہوں نے ایک قدیم گلدستے آئینہ مشاعرہ (مرتبہ عبدالصمد سرور قادری بدایونی، عزیزی پریس آگرہ ۱۹۱۰ء) کے حوالے سے بزم کی مکمل غزل درج کی ہے جس میں مذکورہ شعر بھی بہ فرقِ متن درج ہے:

ایک تصویر کسی شوخ کی اور نامے چند
گھر سے عاشق کے پس مرگ یہ سامان نکلا

ہیئت ظاہری کی اس تبدیلی کو حنیف نقوی نے بالارادہ تحریف اور غالب کے شعری مزاج سے ہم آہنگ کر کے ان کے کلام کے طور پر شہرت دینے کی کوشش سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

''جب تک زیر بحث شعر کسی دوسرے شاعر کے کلام میں حرف بہ حرف اسی صورت میں دستیاب نہ ہو اسے بزم کے شعر کی ترمیم یافتہ

شکل سمجھنا چاہیے۔'' (ص: ۱۵۹)

حنیف نقوی صاحب کی اصابت رائے اپنی جگہ لیکن اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ غالب سے منسوب اس شعر کے مضمون کو (جو ستمبر ۱۹۱۰ء کے اردوئے معلیٰ میں غالب سے منسوب کیا گیا) الفاظ کے ردّ و بدل کے ساتھ بزم اکبر آبادی ہی نے نظم کرلیا ہو۔ اس طور یہ توارد کی بھی ایک صورت ہوسکتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

اس مقالے میں نظامی بدایونی کے تعلق سے جو اندراج آئے ہیں وہ بظاہر کسی ثانوی ماخذ پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ حنیف نقوی نے اس شعر کے اولین اندراج کو نظامی کے مرتبہ دیوان غالب کے چوتھے ایڈیشن (۱۹۲۲ء) سے متعلق قرار دیا ہے۔ (ص: ۱۵۳) لیکن دراصل یہ شعر تیسرے ایڈیشن میں مندرج ہوا تھا اور بعد کے تمام ایڈیشنوں میں بھی شامل ہوا۔ اسی طرح حنیف نقوی نے لکھا ہے کہ جب نظامی پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ یہ شعر غالب کا نہیں ہے تب انہوں نے ۱۹۲۳ء کے دونوں ایڈیشنوں (عام سائز، پاکٹ سائز) سے اسے خارج کردیا (ص: ۱۵۳) یہ بیان بھی درست نہیں۔ نظامی کے مرتبہ دیوان کا چھٹا ایڈیشن ۱۹۲۷ء میں اسی مطبع سے شائع ہوا اس کے صفحہ ۲۷۲ پر بھی یہ شعر بدستور موجود ہے۔ اس اتفاقی تسامح کا حنیف نقوی کی اصل تحقیق پر اثر نہیں پڑتا۔

۶۔ تلامذہ غالب پر ایک نظر:

مالک رام کی تصنیف ''تلامذہ غالب'' (طبع اول، نکودر، ۱۹۵۷ء۔ طبع دوم دہلی، ۱۹۸۴ء) نے غالب شناسی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس کتاب نے غالب جیسے مشکل گو اور بعض حضرات کے بقول اپنے عہد میں ریختہ کے نامقبول شاعر کی ہر دل عزیزی اور سخنوری میں اُستادِ کامل ہونے پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔ تمام تر تلاش و تحقیق کے باوجود بعض اہم ماخذ تک نارسائی اور بعض صورتوں میں صحیح نتائج اخذ نہ کرپانے یا حقائق کی غلط تعبیر و تصریح کے سبب متعدد

خامیاں اور واقعاتی غلطیاں بھی اس کتاب میں در آئی ہیں۔ چنانچہ اس کی اشاعت کے بعد اس پر تقریباً ایک درجن مضامین لکھے گئے جن میں 'تلامذہ غالب' میں پیش کردہ معلومات وحقائق پر اضافے، غلطیوں کی نشاندہی، بعض نئے ماخذ کی اطلاع اور توضیحات وتصحیحات پیش کی گئی ہیں۔ ان مقالوں میں خود مالک رام کے بقول ''سب سے مفصل اور مفید مضمون'' ڈاکٹر حنیف نقوی کا تھا (ص:۲۰۵)۔ چنانچہ ۳۶ شقوں کے تحت حنیف نقوی نے ''تلامذہ غالب'' پر تبصرہ کیا ہے۔ ۳۲ شقوں کے تحت انہوں نے غالب کے ۳۲ تلامذہ سے متعلق مالک رام کی معلومات کی تنقیح کی ہے اور ان پر تصریحات و تصحیحات پیش کی ہیں باقی ۴ شقوں کی تفصیل حسب ذیل ہیں:

شق نمبر ۳۳ کے تحت انہوں نے غالب کے تلامذہ میں ان پانچ نئے ناموں کا اضافہ کیا ہے جو غالب کی تحریروں کے بموجب ان کے شاگرد تھے لیکن مالک رام کی نظر سے اوجھل رہے۔

شق نمبر ۳۴ کے تحت بھی انہوں نے غالب کے تلامذہ میں ان پانچ نئے ناموں کا اضافہ کیا ہے جن کا معاصر تذکروں اور گلدستوں میں شاگرد غالب کی حیثیت سے ذکر ہے۔

شق نمبر ۳۵ کے تحت انہوں نے تلامذہ غالب کے ایسے اشعار یکجا کر دیے ہیں جن میں غالب سے رشتہ تلمذ کا حوالہ موجود ہے۔

شق نمبر ۳۶ کے تحت انہوں نے دو تخلص استعمال کرنے والے شعرا کے ذکر میں مالک رام کے کسی ایک تخلص (یعنی اول یا دوم) کا التزام نہ کرنے پر اظہار خیال کیا ہے۔

۷۔ تلامذہ غالب (طبع ثانی) پر ایک نظر:

اس مقالے میں ۲۷ شقوں کے تحت غالب کے تلامذہ سے متعلق مالک رام کے بیانات پر ترمیمات و تصحیحات پیش کی گئی ہیں۔ مختلف ماخذ کے حوالے سے غالب کے دس نئے تلامذہ (جن کا ترجمہ طبع دوم میں نہیں آسکا) کو متعارف کرایا گیا ہے۔

مذکورہ صدر سات مقالوں کے اس اجمالی تعارف سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آئندہ غالبیات کے وسیع و بسیط ذخیرے کا کوئی بھی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ حنیف نقوی کی پیش کردہ محققانہ معلومات اور ان کے اخذ کردہ نتائج کو زیرِ بحث لائے بغیر ممکن نہیں ہو سکے گا۔

مآثر غالب

غالب کے فارسی شعر و ادب پر محققانہ نگاہ رکھنے والوں میں قاضی عبدالودود کا نام سرفہرست ہے۔ غالب پر ان کی دو کتابیں یادگار ہیں۔ مآثر غالب (۱۹۴۹ء) اور قاطع برہان و رسائلِ متعلقہ (۱۹۶۷ء)۔ قاضی صاحب کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ محققوں کے محقق ہیں۔ جس موضوع پر وہ اظہارِ خیال کر دیتے ہیں گویا اس پر تحقیق کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر مختار الدین احمد آرزو نے لکھا ہے:

> "مآثر غالب میں غالب کی تحریرات نظم و نثر پر قاضی صاحب نے نہایت مفید اور بہت قیمتی حواشی تحریر کیے ہیں۔ غالب کی تحریرات نظم و نثر کے ہر حصے کے متعلق ایسے بیش قیمت معلومات انہوں نے پیش کیے ہیں کہ تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ان پر اضافہ مشکل نظر آتا ہے۔" (پس گفتار مآثر غالب، طبع دوم، ص ۱۱۲، ۱۱۳)

لیکن مالک رام کا خیال ہے:

> "تحقیق میں کسی بات کو حرفِ آخر کا درجہ دینا بہت مشکل ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ غالب کے سلسلے میں تو یہ بالخصوص اور بھی مشکل ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی چیز منظر عام پر آجاتی ہے، جس سے پہلے کے مسلمہ فیصلے پر نظر ثانی کرنی پڑتی ہے۔"
>
> (پیش لفظ، غالب احوال و آثار، ص ۱۲)

مالک رام نے ایک اہم حقیقت کا اظہار کیا ہے اور اس حقیقت کا ثبوت "مآثر غالب" کا وہ ایڈیشن ہے جسے ڈاکٹر عابد رضا بیدار (سابق ڈائرکٹر خدابخش اورینٹل

پبلک لائبریری پٹنہ) کی تحریک پر حنیف نقوی نے مرتب کیا اور ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ نے ۱۹۹۵ء، میں شائع کیا ہے۔اس ایڈیشن کے متن کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا ہے:

"وہ (نقوی) واحد آدمی ہیں جس نے قاضی صاحب کی تحریر میں اتنی زیادہ تصحیحات وتوضیحات کی ہیں۔"

(قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن، ص:۹۹)

لیکن ناشر کی مصلحت یا بے توجہی کے سبب اس ایڈیشن پر مرتب ثانی (یعنی حنیف نقوی) کا نام درج نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اس حق تلفی و ناانصافی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جو یہ فرائض انجام دے وہ صحیح معنی میں مرتب ہے، لیکن حنیف نقوی نے تو عالمانہ حواشی بھی لکھے ہیں۔ افسوس ناشر ادارۂ تحقیقات اردو نے سرورق پر کتاب کے لیے 'مرتبہ قاضی عبدالودود' لکھنے پر اکتفا کی ہے، لیکن حنیف نقوی نے جو اتنی سر مغزی کی ہے اس کا کوئی اعتراف نہیں... انصاف کا تقاضا تھا کہ سرورق پر لکھ دیا جاتا۔ مرتبہ قاضی عبدالودود، ڈاکٹر حنیف نقوی یا مرتبین قاضی عبدالودود و ڈاکٹر حنیف نقوی۔" (ایضاً ص ۱۰۰، ۱۰۱)

راقم الحروف کا خیال ہے کہ کتاب کے سرورق پر قاضی صاحب کا نام بہ حیثیت مؤلف درج ہوتا اور نقوی صاحب کا بہ حیثیت مرتب۔ یا پھر مرتب اول اور مرتب دوم کے تحت دونوں کے ناموں کا اندراج ہونا چاہیے تھا۔ مرتبہ یا مرتبین جیسے کسی سابقے کے ساتھ دوناموں کے اندراج کی صورت میں اس غلط فہمی کا امکان تھا کہ مذکورہ اشخاص نے باہمی اشتراک سے اس کتاب کو مرتب کیا ہوگا۔

"مآثر غالب" کا متن پہلی مرتبہ علی گڑھ میگزین ۴۹-۱۹۴۸ء کے "غالب نمبر" میں بہ صورت ضمیمہ شائع ہوا تھا۔ سو دو سو نسخے فاضل چھپوا کر اور ان پر دوسرا سرورق "مآثر

غالب'' کا چسپاں کر کے ستمبر ۱۹۴۹ء میں اسے انجمن ترقی اردو بہار کی طرف سے طبع اول کے طور پر شائع کر دیا گیا تھا۔ قاضی صاحب کی وفات (۲۵ جنوری ۱۹۸۴ء) کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے حنیف نقوی سے مرتب کروا کر ۱۹۹۵ء میں پٹنہ سے شائع کیا۔ تیسرا ایڈیشن مرتب کی نظر ثانی کے بعد ادارۂ یادگار غالب کراچی سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ یہ ایڈیشن ترتیب و تزئین کے لحاظ سے ماقبل کے دونوں ایڈیشنوں پر سبقت لے گیا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب ''قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن'' (دہلی ۲۰۰۰ء) میں مآثر غالب کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے اپنے تبصرے میں پٹنہ والے ایڈیشن ۱۹۹۵ء کو پیش نظر رکھا تھا۔ راقم الحروف کراچی ایڈیشن (طبع سوم) کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کا تعارف و جائزہ پیش کر رہا ہے۔

کراچی ایڈیشن کا سرورق یہ ہے:

مآثر غالب / غالب کی کمیاب نظم و نثر کا مجموعہ) / مرتبہ قاضی عبدالودود / تصحیح و ترتیبِ جدید / ڈاکٹر حنیف نقوی / اردو ترجمہ خطوط فارسی / پرتو روہیلہ / ادارہ یادگار غالب / کرا

یہ ایڈیشن ترتیب کے لحاظ سے طبع دوم سے کافی مختلف ہے۔ سرورق اور کتا تفصیلات (ص ۵ تا ۹) کے بعد ادارے کی جانب سے دو صفحات پر مشتمل ابتدائیہ (ص: ۱۱، ۱۲) جس پر نام کا اندراج نہیں۔ یہ ادارے کی جانب سے ''عرض ناشر'' طور پر لکھا گیا ہے۔ اس میں مرتب ثانی کی بابت لکھا ہے:

> ''ڈاکٹر حنیف نقوی ان اہل علم میں سے ہیں جو ایک عرصے سے نہایت خاموشی کے ساتھ تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں۔ خصوصاً غالب پر جیسا اور جتنا معیاری کام انہوں نے کیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال مشکل ہی سے ملے گی۔'' (ص: ۱۱)

ابتدائیے کے بعد مرتب ثانی یعنی حنیف نقوی کا ''پیش گفتار'' ہے (ص

تا ۲۴)۔ پیش گفتار پر ۱۷/۱۰/۱۹۹۷ء کی تاریخ درج ہے۔ طبع دوم میں یہ ''پس گفتار'' کے عنوان سے کتاب کے آخر میں شامل تھا۔ اور اس پر ۱۵/اگست ۱۹۹۴ء کی تاریخ مندرج تھی۔ پس گفتار اور پیش گفتار دونوں تھوڑے سے فرق کے ساتھ بعینہٖ ایک ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دو خطوط کے اصل مکتوب الیہ کا پتا طبع دوم کی اشاعت کے بعد چلا، اس کی صراحت ایک جگہ عبارت میں ترمیم کر کے کردی گئی ہے۔ ایک دوسری جگہ ۴۷ سال قبل کو قلم زد کر کے نصف صدی پیشتر لکھ دیا گیا ہے۔ البتہ پیش گفتار کے آخر میں ایک مکمل پیراگراف کا اضافہ کیا گیا ہے، جس کا تعلق کتاب کے متن سے نہیں بلکہ معاونین کے اعتراف اور شکر گذاری سے ہے۔ یہاں ضمناً اس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ صفحہ ۱۵ پر غالب کے فارسی خطوط کی مجموعی تعداد ۳۳ بتائی گئی ہے جو بالیقین کتابت کی غلطی ہے اسے ۳۲ ہونا چاہیے۔

صفحہ ۲۵، ۲۶ پر بالترتیب قاضی صاحب کا انتساب (بنام ڈاکٹر عبدالستار صدیقی) اور 'عرض حال' ہے۔ طبع اول و دوم میں 'عرض حال' کے اختتام پر ۳/مارچ ۱۹۴۹ء کی تاریخ درج تھی لیکن اس ایڈیشن میں تاریخ کا اندراج نہیں ملتا۔ غالباً سہواً ایسا ہوا ہوگا۔ کتاب کی ترتیب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

حصہ اول: میں مآثر کی تحریریں شامل ہیں۔ جنہیں ''اردو نثر''، ''اردو نظم''، ''فارسی نثر'' اور ''فارسی نظم'' کے چار ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (ص ۲۷ تا ۴۶)

حصہ دوم: غالب کے ۳۲ فارسی خطوط کا متن؛ حواشی از قاضی عبدالودود؟ حواشی از حنیف نقوی؛ حواشی برحواشیِ قاضی عبدالودود از حنیف نقوی؛ فہرست ماخذ؛ ترجمہ فارسی خطوطِ غالب از پرتو روہیلہ؛ توضیحات و حواشی بابت خطوط از پرتو روہیلہ؛ مختصر فرہنگ مآثر غالب (ص ۴۷ تا ۲۵۵)۔

مرتب دوم نے متن کی از سر نو تصحیح و ترتیب کے بعد اور ناشر نے ان تمام تحریروں کو ماخذ کے استعمال میں کسی جزرسی کے مظاہرے کے بغیر (جس کی وجہ سے طبع دوم کا حُلیہ

بگڑ گیا تھا) تزئین و آرائش کے ظاہری لوازم کے ساتھ شائع کر کے اس کتاب سے استفادے کو آسان بنا دیا ہے۔ طبع دوم میں ترتیب و اشاعت کے اعتبار سے متعدد نقائص تھے (جن کی طرف گیان چند جین نے اپنے تبصرے میں توجہ دلائی تھی) وہ اس میں دور کر دیے گئے ہیں۔ کراچی ایڈیشن میں طبع دوم کے مقابلے میں جو تبدیلیاں اور اضافے ہوئے ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

- طبع دوم میں ۳۲ خطوط میں سے ۲۵ خطوں کے مکتوب الیہ مرزا احمد بیگ تپاں تھے۔ موجودہ ایڈیشن میں یہ تعداد ۲۵ سے گھٹ کر ۲۴ رہ گئی ہے۔ خط نمبر ۲۵ کے مکتوب الیہ نواب علی اکبر خاں طباطبائی قرار دیے گئے ہیں۔
- خط نمبر ۷ اس ایڈیشن میں تپاںؔ کے نام سے درج ہے لیکن استدراک (ص: ۱۴۸) میں بہ دلائل یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس خط کے اصل مکتوب الیہ مرزا افضل بیگ ہیں۔ اس حقیقت کے بعد میں انکشاف کی بنا پر غالب کے مکتوب الیہم کی فہرست میں مرزا افضل بیگ، نام جگہ نہیں پا سکا ہے۔ لہٰذا موجودہ ایڈیشن کے مطابق غالب کے مکتوب الیہ اور ان کے نام خطوط کی صحیح تعداد اس طور پر ہوگی:

۱۔ مرزا احمد بیگ تپاں	خط نمبر ۱ تا ۶؛ ۸ تا ۲۴	(کل ۲۳ خط)
۲۔ مرزا افضل بیگ	خط نمبر ۷	(ایک خط)
۳۔ نواب علی اکبر خاں طباطبائیؔ	خط نمبر ۲۵	(ایک خط)
۴۔ سراج الدین احمد	خط نمبر ۲۶	(ایک خط)
۵۔ خواجہ فیض اللہ حیدر شائق	خط نمبر ۲۷ و ۲۸	(دو خط)
۶۔ خواجہ محمد حسن	خط نمبر ۲۹ تا ۳۱	(تین خط)
۷۔ خواجہ فخر اللہ	خط نمبر ۳۲	(ایک خط)

- حواشی میں جہاں تہاں ایک ایک دو دو جملوں یا فقروں کا اضافہ کیا گیا ہے اور کہیں کہیں صرف لفظوں کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔

● اکیس نئے حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے جن کی تفصیل یہ ہے۔
(یہ تعداد کم و بیش بھی ہو سکتی ہے)

حواشی مآثرِ غالب: حصہ اول، حاشیہ نمبر ۴، ۱۶، ۳۹، ۱۰۰

حصہ دوم، حاشیہ نمبر ۶، ۴۷، ۷۶

حواشی بر حواشی قاضی عبدالودود: حواشی نثر اردو، حاشیہ نمبر ۲، ۱۳، ۵۴، ۶۱

حواشی نظم اردو، حاشیہ نمبر ۹، ۱۲

حواشی نثر فارسی، حاشیہ نمبر ۱۰، ۱۷

حواشی نظم فارسی، حاشیہ نمبر ۸، ۹، ۲۷، ۴۶، ۹۱، ۱۱۳

طبع دوم کے استدراکات کو طبع سوم کے حواشی میں ضم کر دیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اور کوئی ترمیم و اضافہ بادی النظر میں مجھے نظر نہیں آیا البتہ ایک جگہ حنیف نقوی نے اپنے سابقہ خیال کو مسترد کرتے ہوئے ایک دوسرے خیال کی نشاندہی کی ہے۔ وہ مقام یہ ہے۔

طبع دوم میں حنیف نقوی نے "موید برہان" کے حاشیوں پر پائے جانے والے اس نشان (معہ) کی بابت لکھا تھا کہ "عبدالستار صدیقی کے خیال میں یہ "مصنف" کا مخفف ہے لیکن میرے نزدیک یہ "مصیب" کا مخفف ہے" (ص:۱۷۷)۔ اس کے برخلاف زیر بحث ایڈیشن میں انہوں نے لکھا ہے کہ "مرتب کے نزدیک یہ "مصحح" کا مخفف ہے (ص: ۱۶۳)۔ بظاہر مصیب اور مصحح میں معنی کا فرق نہیں ہے۔

طبع سوم کی ترتیب و تدوین سے متعلق ان پہلوؤں پر گفتگو کے بعد اب اس کتاب کے متن اور حنیف نقوی کے حواشی پر اظہار خیال کیا جائے گا۔

مآثر غالب کے حصہ اول میں غالب کی مصنفہ ۱۶ تحریریں ہیں۔ جن میں دیباچے، تقریظیں، رباعی، قطعہ، غزل، فردیات، استفتاء، نامہ منظوم، معمّے، مطالب شعر وغیرہ شامل ہیں۔ حنیف نقوی کے بقول ان میں ۳ تحریریں غیر مطبوعہ ہیں باقی کہیں نہ

کہیں مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔ قاضی صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان تحریروں کو یکجا کر دیا اور ان پر معلومات افزا حواشی لکھ کر ان سے استفادے کا دائرہ وسیع کر دیا (ص: ۱۴)۔

مآثر غالب کے حصہ دوم میں فارسی کے ۳۲ خطوط ہیں۔ ان میں ۲۸ غیر مطبوعہ ہیں۔ ''پیش گفتار'' میں حنیف نقوی نے لکھا ہے:

''ان فارسی خطوط میں سے بیشتر غالب کے قیام کلکتہ کے زمانے کی یادگار ہیں... یہ خطوط تاریخی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں... ان خطوط سے مدرسہ سرکار کمپنی میں ہر شمسی مہینے کے پہلے اتوار کو منعقد ہونے والے... مشاعرے سے متعلق بعض اہم باتوں کے علاوہ ایک بزم طرب کے انعقاد کا بھی علم ہوتا ہے... یہ خطوط غالب کے بعض ایسے معمولات سے بھی واقفیت بہم پہنچاتے ہیں جن کے بارے میں دوسرے ذرائع سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتی... سوانحی، تاریخی اور ادبی نقطۂ نظر سے ان خطوط کی اہمیت کے کچھ اور پہلو بھی ہیں جن پر یہاں بالتفصیل گفتگو کی گنجائش نہیں۔'' (ص: ۱۷ تا ۱۹)

حنیف نقوی نے 'پیش گفتار' میں ۱۲ شقوں میں اپنے تدوین کے طریقہ کار کی وضاحت کی ہے۔ جن میں اہم ترین کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ طبع اول کے متن کی تصحیح میں منشائے مصنف، نفس مطلب، تکمیل مطلب، کسی عبارت میں لفظ کے زائد یا کم ہونے کی صورت وغیرہ ساری رعایتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۲۔ طبع اول میں فارسی خطوط، حکیم حبیب الرحمٰن (ف ۱۹۴۷ء) مصنف ''ثلاثۂ غسّالہ'' کی بیاض کی اصل ترتیب کے مطابق منقول تھے۔ مرتب دوم نے اولاً ہر مکتوب الیہ کے نام کے تمام خطوط علیحدہ کیے بعد ازاں انہیں سلسلہ وار تاریخی ترتیب سے مرتب کیا۔

۳۔۔ ایک نامعلوم الاسم مکتوب الیہ (خواجہ محمد حسن) اور ۲ خطوں کے نئے مکتوب الیہ مولوی علی اکبر خاں طباطبائی اور مولوی سراج الدین کی نشاندہی کی اور ان سے انتساب کے ضروری شواہد حاشیوں میں درج کیے۔

۴۔۔ ہر خط کے آخر میں قوسین کے اندر راس کے زمانۂ تحریر کی نشاندہی کا التزام کیا۔ تاریخوں کے تعین میں جن دلائل و شواہد سے کام لیا گیا ہے ان کی تفصیلات بھی خطوط سے متعلق حواشی میں درج کردی گئی ہیں۔

اس ترتیب جدید اور تدوین متن کا خاص حصہ اس کے حواشی ہیں۔ ۱۹۳ نمبروں کے تحت متن کی صحت یا اختلاف کی وضاحت کی گئی ہے۔ ۸۰ حاشیے نثر اردو سے، ۲۶ نظم اردو سے، ۱۸ نثر فارسی سے اور ۱۲ نظم فارسی سے متعلق ہیں۔ خطوط کے حاشیے سب سے زیادہ طویل اور معلومات افزا ہیں۔ ان کی تعداد ۱۳۲ ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان حواشی کے مضامین و مطالب کے بارے میں بھی اختصار کے ساتھ اظہار خیال کیا جائے۔

۱۔۔ متن سے متعلق حواشی کا تعلق بیشتر لفظوں کے استعمال سے ہے۔ اور یہ اختلاف نسخ یا تعین متن کے زمرے میں آتے ہیں۔ حنیف نقوی نے بیشتر مقامات پر نفس مطلب کے لحاظ سے تصحیح بھی کی ہے۔

۲۔۔ قاضی صاحب کے حواشی پر جو حواشی لکھے گئے ہیں وہ بے حد اہم اور مفیدِ مطلب ہیں۔ یہ جہاں غالب شناسی کی نئی جہتوں اور نئی دریافتوں سے متعارف کراتے ہیں وہیں شدت کے ساتھ یہ احساس بھی دلاتے ہیں کہ غالب پر تمام تر امکانی تحقیق کے باوجود، غالب کی زندگی، ان کی تصنیفات (خصوصاً فارسی تصانیف) اُن سے متعلق افراد، ان کے مکتوب الیہم وغیرہ کے متعلق استخراجِ نتائج میں ہمارے بزرگوں نے بے شمار غلطیاں کی ہیں۔ گیان چند جین نے لکھا ہے کہ حنیف نقوی نے قاضی صاحب کے حواشی پر کم از کم ۵۲ تصیحات، ۱۱۸ اضافے اور

۱۸ صراحتیں کی ہیں۔ (قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن، ص: ۱۰۳) یہ تعداد طبع سوم میں اکیس نئے حاشیوں کے اضافے کے بعد یقیناً بڑھ گئی ہوگی۔

۳۔ ان حواشی میں قاضی صاحب کی پیش کردہ معلومات پر اضافے، ان کے بعض نظریات یا فیصلوں سے اختلاف، جہاں قاضی صاحب کی الجبرائی تحریر سے غلط فہمی کے امکانات تھے وہاں ان کو رفع کرنے اور بعض نامکمل یا مختصر بیانات کی صراحت و وضاحت کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

۴۔ تعیین زمانہ کی اصطلاح قاضی صاحب کی وضع کردہ ہے۔ حنیف نقوی نے ان حواشی میں زمانے کے تعین پر خاص توجہ دی ہے۔ خواہ وہ کسی واقعہ سے متعلق ہو یا فرد سے یا کتاب سے، یا پہلے سے کسی طے شدہ تاریخ وغیرہ سے۔

۵۔ غالب کے متن میں مستعمل اشعار اور مصرعوں کے صحیح متن کی دریافت اور اُن کے خالق کی بھی تلاش کی۔ تحقیق کی اصطلاح میں اسے تخریج کہتے ہیں۔

۶۔ خطوط کی تاریخوں، ان میں مذکورہ واقعات، افراد، کتب، اشعار کی وضاحت کی۔ مکتوب الیہم کی سوانح اور بعض دوسرے متعلقہ واقعات کی تاریخیں طے کیں۔

مناسب تو یہ تھا کہ حواشی کے مطالب کی نوعیت و کیفیت کے اس بیان کے ساتھ ہی مثالیں بھی درج کردی جاتیں لیکن طوالت کے خوف سے انہیں نظر انداز کردیا گیا ہے۔

مذکورہ صدر دو کتابوں ''غالب۔ احوال و آثار'' اور ''مآثر غالب'' کے سرسری تعارف و جائزے کے بعد حنیف نقوی کی غالب شناسی کی حسب ذیل جہتیں سامنے آتی ہیں:

● حنیف نقوی غالب کے تصنیف کردہ ادب پر پوری طرح حاوی ہیں۔ اس میں پیش کردہ علمی، ادبی و تاریخی مسائل، ان کی جزئیات، اس میں مذکور افراد و کتب کے اسما؛ اِس ادب اور اُس سے متعلق رجال پر پیش کردہ تحقیقات اور اس کے اختلافات غرض کہ کوئی پہلو اُن کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔

● عہد غالب کی شخصیات، غالب کے تلامذہ و معاصرین، غالب کے مکتوب الیہ، غالب سے دوسرے انداز کی نسبتیں رکھنے والے افراد وغیرہ، ان مختلف درجات و حیثیتوں کے لوگوں سے غالب کے تعلق کی نوعیتیں و مصلحتیں یہ تمام باتیں ان کی نظر میں ہیں۔

● غالب کی وفات کے بعد ان پر لکھا گیا ادب، جن بنیادوں پر استوار کیا گیا ان بنیادوں کی صحت و عدمِ صحت ان کے متعلقات اور اسی نوعیت کی جزوی باتیں بھی ان کے مطالعے کا حصہ ہیں۔

● غالب سے متعلق ہر فرد، ہر واقعہ، ہر کتاب کے زمانہ تصنیف کا تعین اور تاریخی پس منظر میں اس کی اہمیت، داخلی شواہد کی بنیاد پر غالبؔ سے اس کی نسبت کی وضاحت بھی ان کی تحقیق کا حصہ ہے۔

حنیف نقوی کے ان مطالعوں میں تحقیق، سلیقہ، مواد کی تنظیم، قاری کی طلب، موضوع کے مطابق زبان و بیان، اسلوب کی متانت چند اضافی خوبیاں ہیں جن پر اظہار خیال پھر کبھی۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے اس کام کی بدولت محققوں کے محقق بن کر ابھرے ہیں۔ انھوں نے غالبیات کے دو بڑے محققین، فارسی کے تعلق سے قاضی عبدالودود اور اردو کے تعلق سے مالک رام کے کام کا جس طور پر جائزہ لیا ہے اور جس طرح ان کے تحقیقی نتائج سے اختلاف اور ان کے تسامحات کی نشاندہی کی ہے اور بقول گیان چند جین تصحیحات و توضیحات کے ڈھیر لگا دیے، وہ انہیں ''ماہر غالبیات'' کا اعزاز دینے کے لیے کافی ہے۔

سید حنیف احمد نقوی ۱۷/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو سہسوان ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں اردو میں ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۶۸ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۴/جولائی ۱۹۶۲ء سے ۱۳/دسمبر ۱۹۶۳ء تک فضل الرحمٰن اسلامیہ انٹر کالج بریلی میں بہ حیثیت لکچرر ملازمت کی۔ بعد ازاں حمیدیہ کالج بھوپال میں جونیر ریسرچ فیلو (دسمبر ۱۹۶۳ء تا دسمبر ۱۹۶۶ء) اور شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ریسرچ

اسسٹنٹ (فروری ۱۹۶۸ء تا جولائی ۱۹۶۹ء) کی حیثیت سے کام کیا۔ ۴/فروری ۱۹۷۰ء کو بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بہ حیثیت لکچرر تقرر ہوا۔ بعد میں ریڈر اور پروفیسر و صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دے کر ۳۱/دسمبر ۲۰۰۰ء کو سبکدوش ہوئے۔

غالبیات کے علاوہ بھی نصف درجن سے زائد کتب تالیف وتصنیف کیں۔ شعرائے اردو کے تذکرے (۱۹۷۶ء) انتخاب کربل کتھا (۱۹۸۳ء)، تلاش وتعارف (۱۹۸۷ء)، انتخاب کلام رجب علی بیگ سرور (۱۹۸۸ء)، رجب علی بیگ سرور چند تحقیقی مباحث (۱۹۹۱ء)، دیوان ناسخ، نسخہ بنارس عکسی ایڈیشن (۱۹۹۷ء) رائے بینی نرائن دہلوی: سوانح اور ادبی خدمات (۱۹۹۷ء)، میر و مصحفی (۲۰۰۳ء)۔

آجکل اپنی نامکمل تصانیف کی تکمیل اور مضامین ومقالات کی ترتیب میں مصروف ہیں۔ بنارس ہی میں مستقل قیام ہے۔

سطور بالا میں پیش کردہ تعارف و جائزہ دسمبر ۲۰۰۳ء تک کی کاوشوں پر مشتمل ہے۔ ۲۰۰۳ء سے ۲۰۰۹ء کے درمیان حنیف نقوی کے مزید ۱۳ مقالات اور ۲ کتب غالب پر شائع ہوئیں۔ کتب کے نام یہ ہیں:

- غالب کی چند فارسی تصانیف ناشر: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، باراول، ۲۰۰۵ء

یہ دراصل اُن ۹ مقالات کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں غالب کی فارسی تصانیف پر لکھے گئے۔

- غالب کی فارسی مکتوب نگاری ناشر: شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۲۰۰۸ء

یہ دراصل نظام یادگاری خطبہ ہے جو دہلی یونیورسٹی میں ۱۰/مارچ ۲۰۰۸ء کو پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ غالب احوال و آثار (لکھنؤ ۱۹۹۰ء) کا دوسرا ایڈیشن بھی غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی سے ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ عدیم الفرصتی کے سبب مذکورہ کتب کا جائزہ پیش کردہ مطالعے کا حصہ نہیں بن سکا۔ جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

باب ہفتم

بدایوں کے ادب پر غالب کے اثرات

روایت غالب کا اثر و نفوذ

بدایوں کے شعر و ادب پر ابھی مورخانہ نظر نہیں ڈالی گئی ہے۔ لہٰذا یہ تعین کرنا کہ کس شاعر کا مجموعی طور پر کیا رنگِ سخن ہے اور کس ادیب و شاعر کے یہاں غالب کے اثرات نمایاں ہیں سرِ دست دشوار طلب ہے۔ یوں ہر اچھے سخنور کے یہاں دو چار شعر کسی بھی بڑے شاعر کے رنگ سخن میں مل سکتے ہیں لیکن محض دو چار شعر اس شاعر کے مخصوص رنگ یا دوسرے شعرا سے قبول کیے گئے اثرات کی نشاندہی کے لیے ناکافی ہیں۔ عام طور پر بدایوں کے شاعرانہ ماحول پر دہلوی اسکول یا دہلوی رنگ سخن کا غلبہ رہا۔ ذوق، داغ، ظہیر کے ساتھ ساتھ غالب کے اثرات بھی یہاں کے سخنوروں نے قبول کیے لیکن بدایونی تلامذہ غالب نے غالب کے افکار و بصائر اور طرز و انداز بیان کی توسیع میں حصہ نہیں لیا۔ خود ان تلامذہ کا جو کلام دستیاب ہے ان پر غالب کے اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں سوائے نواب زکریا خاں زکی کے۔ انہوں نے خود بھی غالب کی شعری روایت کو قبول کیا اور اپنے تلامذہ کو بھی اس روایت کی توسیع کے لیے تیار کیا۔

عہدِ غالب میں غالب کا رنگ سخن بدایوں میں نامقبول رہا۔ منشی انوار حسین تسلیم

سہسوانی (ف ۱۸۹۲ء) اور منشی دیبی پرشاد سحرؔ (ف ۱۹۰۲ء) کے کلام میں کہیں کہیں غالب کی سی مضمون آفرینی اور لبِ اظہار کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ تسلیمؔ کے اردو دیوان کے بارے میں لاعلم ہوں۔ البتہ سحرؔ کا دیوان سحر سامری (لکھنؤ ۱۸۶۸ء) میری نظر سے گزرا ہے۔ ان دونوں شعرا کے چند شعر بلاتبصرہ نقل کیے جاتے ہیں:

تسلیم سہسوانی:

مانندِ ابر، اشک سے دامن بھگوئیں کیوں   اک بوند آبرو ہے اسے ہم ڈبوئیں کیوں

دردِ فراق نے یہ کیا ناتواں مجھے   پھرتا ہے ڈھونڈتا مرا وہم و گماں مجھے
نازک مزاج مجھ سا ہوا ہے، نہ ہوئے گا   روح سبک بھی اپنی ہے بارِ گراں مجھے

ہجر آتش سوز ہے، سینے میں دل بیتاب ہے
اشک کا ہر ایک قطرہ، پارۂ سیماب ہے
روئے آتش ناک کا، کس کے پڑا پانی میں عکس
شعلۂ جوّالہ ہے جو حلقہ گرداب ہے
مژدہ اے نومیدیِ جاوید پھر حسرت رہی
ہاتھ میں اُس تُرک کے پھر خنجر بے آب ہے
میرے ویرانے میں کس کے حسن نے باندھا طلسم
ذرۂ ناچیز، اشکِ مہر عالم تاب ہے

سحر بدایونی:

نالۂ آتش فغاں جب شعلہ زن ہوجائے گا   جل کے خاکستر تو اے چرخِ کہن ہوجائے گا
عکس افگن جب وہ گلگوں پیرہن ہوجائے گا   لالہ گل ہوجائے گا، گل نسترن ہوجائے گا
سنگ طفلاں قبر کا سامان کافی ہے ہمیں   چاک ہوکر دامن صحرا کفن ہوجائے گا

ہاتھوں سے تیرے تنگ ہیں، اے پنجہ جنوں لائیں بتا، تو ، روز گریباں کہاں سے ہم
افسوس ہے کہ بیٹھے رقیبوں کے پاس وہ مثلِ حجاب اٹھائے گئے درمیاں سے ہم

صدمے سے ہاتھ کے کہیں گٹا اتر نہ جائے کیوں کر دباؤں اس بتِ نازک بدن کے پاؤں

درکار ہے نہ باغ، نہ سیر چمن مجھے کافی ہے صرف کوچہ گل پیرہن مجھے

مابعد کے شعرا میں غالب کی توانائیِ فکر، دقت پسندی، اور نیرنگیِ زبان و بیان کے عنصر دکھائی دیتے ہیں۔ان شعرا کا نسبِ شاعری، غالب سے تین صورتوں میں استوار ہے:

ا۔۔۔غالب کی معنویت:

شوکت علی خاں فانیؔ بدایونی (ف ۱۹۴۱ء) کے یہاں گہری داخلیت اور بلیغ معنویت غالب ہی کا عطیہ ہے۔ ان کی غزل کی پر تفکر فضا، معانی کی تہہ داری، فکر و بصیرت کی نئی جہتیں، غم کی باوقار کیفیتیں، انداز بیان کی متانت اور علو، غالب سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔ فانی کے ناقدین نے فانی کے کلام پر غالب کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اپنے مضمون ''فانی اور غالب'' میں لکھتے ہیں:

> ''فانی کے کلام میں جو حقیقت سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ان کا مخصوص انفرادی رنگ ہے۔جس میں غالب کی دشوار پسندی، دقت نظر اور فلسفہ نگاری کے باوجود غالب کے انشائے خصوصی یعنی فارسی کے نامانوس محاورے، ثقیل ترکیبیں اور عربی کے لغات غریبہ بالکل ناپید ہیں۔'' (فانی بدایونی مرتبہ ساحل احمد، ص: ۱۳۰)

مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

> ''فانیؔ غزل کے شاعر ہوتے ہوئے بھی ایک نظام فکر رکھتے تھے، جس کو غالب کے فلسفہ حیات سے کوئی واسطہ نہیں ہے...اول تو فانی نے غزل میں ایک مسلسل اور منظم پیغام دینا غالب ہی سے سیکھا دوسرے

اس پیغام کے اظہار و ابلاغ کے لیے انہوں نے جس زبان اور انداز بیان کو اختیار کیا وہ غالب ہی کی وراثت ہے۔"

(غالب شخص اور شاعر، ص: ۱۱۲)

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے اپنی کتاب "فانی کی شاعری" میں غالب کی فکر کا اجمالی خاکہ پیش کرنے کے بعد لکھا ہے:

"جب ہم فانیؔ کے کلام کو غور سے پڑھتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کی گرفت فلسفیانہ اور صوفیانہ مسائل پر زیادہ محکم اور قوی ہے۔ بلکہ ان کے یہاں ان مسائل کے بیان میں شعریت بھی زیادہ دلکش اور جاذب توجہ معلوم ہوتی ہے۔ ان کی فکر غالب سے زیادہ گہری اور پیچیدہ نظر آتی ہے۔" (فانی کی شاعری، ص: ۱۰۳)

عام طور پر اردو نقادوں کے لیے غالب کی شاعری "خرق عادت" کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے خیال میں غالب جس مضمون کو جس زاویے اور انداز سے نظم کر چکے ہیں دوسرا اس کے قریب بھی نہیں جا سکتا۔ لیکن فانی، غالبؔ کے بارہا قریب گئے ہیں فکر کے لحاظ سے بھی اور بیان کے لحاظ سے بھی۔ انہوں نے شعوری وارادی طور پر بھی غالب کی زمینوں میں ہم قافیہ وہم ردیف غزلیں کہیں اور غالب کے نظم کردہ مضامین کو بھی باردگر نظم کیا۔ ان کی ذہنی وسعت، افتادِ طبع اور مزاج کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس اتصال وقرب نے ان کی انفرایت کو کہیں بھی مجروح ہونے نہیں دیا وہ کسی نہ کسی طرح غالب کو چھوکر گزر گئے اور اپنی انفرادیت بھی برقرار رکھی۔ اس کتاب میں فانی و غالبؔ کے تعلق سے تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔ تاہم غالب اور فانی کے چند ہم طرح اور ہم مضمون اشعار سطور ذیل میں نقل کیے جا رہے ہیں۔

غالب	فانی
محرم نہیں ہے تو ہی، نواہاے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا	اٹھتی نہیں ہے تہمتِ نظارۂ جمال منھ دیکھتا ہوں، جلوۂ نظارہ ساز کا
نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز	اب نئے سُر سے چھیڑ پردۂ ساز میں ہی تھا ایک دکھ بھری آواز
جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار اے کاش! جانتا نہ ترے رہ گذر کو میں چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں	ہر نقش پا کو دیکھ کے دھنتا ہوں سر کو میں پہچانتا نہیں ہوں تری رہ گذر کو میں وہ پائے شوق دے کہ، جہت آشنا نہ ہو پوچھوں! نہ خضر سے بھی کہ جاؤں، کدھر کو میں بہلا نہ دل، نہ تیرگی شامِ غم گئی یہ جانتا تو آگ لگاتا، نہ گھر کو میں
اُسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا	تعینات کی حد سے گذر رہی ہے نگاہ بس اب خدا ہی خدا ہے، نگاہ والوں کا
جب وہ جمالِ دل فروز، صورت مہرِ نیم روز آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منھ چھپائے کیوں	کیا کیا گلے نہ تھے کہ ادھر، دیکھتے نہیں دیکھا تو کوئی دیکھنے والا، نہیں رہا
دلِ ہر قطرہ ہے، سازِ ''انا البحر'' ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا؟	تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا ہم تمہارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا

زمن بہ جرم تپیدن کنارہ می کردی — سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
بیا بہ خاکِ من و آرمیدنم بنگر — کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

خموشی میں نہاں، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں، ہیں — بہت سر پیٹتی ہیں آرزوئیں
چراغ مردہ ہوں، میں بے زباں، گورِ غریباں کا — کوئی ناکام جاتا ہے جہاں سے

دیکھو تو، گل فریبیِ اندازِ نقشِ پا — کترے ہیں یہ گل تیری اک جنبش دامن نے
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی — یوں کرنہ لیے پیدا، دو پھول بھی گلشن نے

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے؟ — تو کہاں تھی اے اجل، اے نامرادوں کی مراد
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا — مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کیے

۲ــــ غالب کی پیچیدگیِ طرزِ فکر و اظہار:

غالب کی سی پیچیدہ طرز فکر اور اسلوب زبان و بیان اختیار کرنے والوں میں مولوی امیر احمد امیرؔ بدایونی (ف ۱۹۴۹ء) کا نام قابل ذکر ہے۔ امیرؔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ دیوان غیر مطبوعہ رہا۔ اپنے دور کے رسائل و اخبارات میں کثرت سے شائع ہوئے۔ غالب کی طرز خاص کو نباہنے کا انہیں بھرپور سلیقہ ہے۔ ان کی تمام شاعری غالب کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

امیر مضمون کے علو کو انداز بیان کی پیچیدگی، فارسی تراکیب، ادق الفاظ، مسلسل اضافتیں، شوخی، سلسلہ وار تشبیہات و استعارات کی کثرت سے ظاہر کرتے ہیں۔ اپنے دور میں مقبول ہوئے لیکن اس تقلید نے غالب کی مشکل پسندی اور پیچیدگی کو بدنامی کے دائرے میں لاکھڑا کیا۔ امیرؔ کے چند شعر بطور نمونہ درج ہیں:

گرمیِ بزم وفا اک دلِ بیتاب سے تھی — اب تو پہلو میں وہ لذت کشِ غم بھی نہ رہا

چلتے چلتے ہوئی فرسودہ زبان خنجر
کھنچتے کھنچتے تری تلوار میں، دم بھی نہ رہا

خود تو بگڑے ہی تھے، خط بھی مجھے بگڑا لکھا
حسنِ اخلاق نہ تھا، حسنِ رقم بھی نہ رہا

بادۂ عشرت نصیب جام اعدا، ہوگیا
قسمتِ رند بلاکش میں، جو کچھ تھا، ہو گیا

اللہ اللہ اے تن لاغر تری کاہیدگی
مجھ پہ اس کو وہم نقشِ پائے عنقا ہوگیا

یہ مزا آیا ترے اندازِ کشتن میں مجھے
میں ہلاکِ زخم تیغ بے محابا ہوگیا

کیوں مٹاتا ہے مجھے ہر رہروِ کوے بتاں
کیا تن لاغر میرا نقش کفِ پا ہوگیا

چارہ گر باقی رہا کیا اب بساطِ عشق میں
ایک دل تھا وہ بھی صرفِ ناز بیجا ہوگیا

تیغِ قاتل سے گلے مل کے بھی حسرت رہ گئی
اب لبِ معجز نما، خونِ تمنا ہوگیا

زخمِ دل پہلے بجز اک زخم دل کچھ بھی نہ تھا
یہ نمک پاشی ہے تیری، لذت افزا ہوگیا

خانۂ دل میں امیرؔ اب گرمیِ الفت کہاں
سرد مہریِ بتاں سے جی ہی ٹھنڈا ہوگیا

موجِ حسرت نہ ہو، کیوں، روکشِ سیلاب فنا
عیش، یکدم ہے حبابِ لب دریا مجھ کو

مرحبا وسعت صحرا سے محبت کہ امیرؔ
ذرّے ذرّے میں نظر آتا ہے صحرا مجھ کو

سبب گمرہی جادہ نہ ہو سعیِ تلاش
ماندگی حاصل خمیازہ رفتار نہ ہو

شورِ ہنگامۂ محفل، نہ بنے رازِ نہاں
خامشی، محشرِ آئینۂ گفتار نہ ہو

تولاؔ حسین تولا بدایونی (ف ۱۹۳۶ء) تلمیذ نواب زکریا خاں زکی کو بھی غالب کے رنگِ سخن کا پیرو کہا جاتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے:

"انہوں نے (مراد رضی بدایونی) آنکھ کھولی تو بدایوں کے شاعر رامپور کے اثر سے امیر و داغ کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے مگر زکی دہلوی کے بدایوں میں قیام کی وجہ سے غالب کی طرف بھی چشم التفات

ہونے لگی تھی۔ یہ رنگ فانؔی کے یہاں اپنی بہار دکھاتا ہے مگر فانی کے علاوہ بدایوں کے شعرا میں تولؔا اور رضؔی بھی غالب سے متاثر ہوئے ہیں۔" (تقریب مشمولہ لمعات، ص: ی)

لیکن حال ہی میں تولؔا کا جو دیوان بہ اسم "سورج کے پھول" (مطبوعہ کراچی ۲۰۰۲ء) موصول ہوا اسے پڑھ کر تولا کے یہاں غالب کے اثرات کی نشاندہی کرنا عبث معلوم ہوتا ہے۔ تولؔا کے چند شعری گلدستے طبع ہو چکے ہیں۔ جو اُن کی قادرالکلامی پر گواہ ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ایک ملاقات میں راقم الحروف کو بتایا تھا کہ تولا کے بیٹے ولا حسین ولؔا پاکستان ہجرت کرنے سے پیشتر تولؔا کا دیوان انہیں اشاعت کی غرض سے دے گئے تھے لیکن وہ ادھر اُدھر ہو گیا۔ چند شعر بطور نمونہ تولؔا کے بھی درج ہیں:

ہو عمر زیادہ ترے سامان ستم کی   کچھ تیر ہیں چٹکی میں، جو ہم، یاد ہوئے ہیں

ہستیِ موہوم کو، موہوم سمجھوں، یا نہیں   دیکھنے والے ذرا دیکھیں، کہ میں ہوں، یا نہیں

منافق سے عدو اچھا، عدو سے دشمنی اچھی   چھپا جو زہر ہو اس زہر سے، عریاں چھری اچھی

کھل گئے معنی، سمجھنے سوچنے کے عشق میں   زندگی، وہم یقیں، ہستی، فریب غور ہے

مرنا پڑا ہے حسرتِ ساغر لیے ہوئے   اے حشر جلد اٹھ مے کوثر لیے ہوئے
احباب کی طرح ہیں، بگولے بھی، دور، دور،   صحرا میں ہوں، وطن کا مقدر، لیے ہوئے

گنبد نور بن اے چرخ، نہ خود سر ہونا   دائرہ آج ہے، کل حسن کا، منظر ہونا
چاہیے محوِ طوافِ درِ سرور ہونا   گھوم کر عشق کے مرکز سے نہ باہر ہونا
اے فلک سیکھ مرے پاؤں کا چکر ہونا

دیکھ اے آنکھ، خیالات کے خوابوں کو نہ دیکھ   یاد رکھ، معنی توحید، کتابوں کو نہ دیکھ

غیر ہی غیر ہیں، کثرت کے نقابوں کو نہ دیکھ   نگہِ شوق تعین کے حجابوں کو نہ دیکھ

ان کے پردوں کو مبارک رہے منظر ہونا

سجدہ عشق نہیں صرف جبیں تک محدود   ہمہ تن ہے مری ہستی میں، محبت کی نمود

روضہِ شاہ پہ بیخود جو ہوا پڑھ کے درُود   سر جھکایا در مولا پہ تو، ذرّاتِ وجود

چاہتے ہیں مرے سر ہو کے، مرا سر ہونا

۳۔۔غالب کا مجموعی اثر:

انصار حسین زلالی (ف ۱۹۲۴) تلمیذ حالی۔ محمد مبین نازش (ف ۱۹۳۶ء) تلمیذ زکی، رضی احمد رضی (ف ۱۹۳۹ء)، آفتاب احمد جوہر (ف ۱۹۸۱ء)، ظفر احمد صدیقی (ف ۱۹۹۳ء) اور دلاور فگار (ف ۱۹۹۸ء) کے یہاں گفتۂ غالب کے نشانات و علامات اندرونی تموج کے طور پر نظر آتے ہیں۔ عشق کا پر تفکر احساس، مضمون آفرینی، الفاظ و تراکیب کے استعمال میں جدت یہ سب غالب ہی کا ترکہ ہے۔ ان شعرا کے بھی چند اشعار مثال میں درج کرنا درست ہوگا۔

زلالی بدایونی:

چند شعری گلدستے شائع ہو چکے ہیں۔ غزلیات کا قلمی دیوان راقم الحروف کی ملکیت میں ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں۔ از خاک بدایوں، ص: ۳۳ تا ۴۱)

دلِ آگاہ، تجسس سے نہ غافل رہنا   اک ادا شاہدِ ہستی کی ہے، پنہاں ہونا

ترے کرم نے تو دی تھی خبر، معافی کی   ہوا قصور کہ، ترکِ قصور کر بیٹھا

بھڑکا، جو دل میں، شعلہ آتش فشانِ داغ   باقی رہا نہ جسم، نہ نام و نشان داغ

کامل وہی ہے جس کو زلالی نصیب ہو   غالب کا رنگ، بندشِ حالی، زبان داغ

شاید تصورِ رخِ روشن ہو جلوہ ریز   کچھ آس پاس دل کے، اجالے ہوئے تو ہیں

ورقِ ہوش پہ نقشِ غم بیداد نہیں یاد رہنے کی جو باتیں تھیں، وہی یاد نہیں

مرمٹے، آشوبِ آگاہی میں ہم بیخودی سے بڑھ کے خودداری نہیں

وہ دبدبے ہیں شوخیِ برق جمال کے رستے تمام بند ہیں وہم و خیال کے

زلالی کے بیشتر مقطعے حالی و غالب سے والہانہ شیفتگی کے مظہر ہیں۔ غالب سے متعلق کچھ مقطعے درج ذیل ہیں:

جمع ہیں بلبل خوش لہجہ زلالی اس جا تو بھی آہنگ میں غالب کے غزل خواں ہونا

زباں غالب کی جس میں بولتی ہو وہ غزل لکھیے زلالی آپ کو اس رنگ میں صاحب ہنر جانا

پی ہے اوروں نے بھی وہ، جس پہ ہے مہر غالب اس کے نشہ میں زلالی نہ تمھیں چور رہے

ہو نہ گستاخ زلالی سخنِ آرائی میں روشِ غالب مرحوم کو آساں سمجھا

غالب کی طرز خاص زلالی، محال ہے وہ میرزا کی بات گئی، میرزا کے ساتھ

نازش بدایونی:

ان کے کلام کا ایک مجموعہ 'انتخاب کلام نازش بدایونی' مرتبہ طیب بخش بدایونی (بریلی ۱۹۸۶ء) شائع ہو چکا ہے۔ طنز و مزاح میں زاغ تخلص کرتے تھے۔ چند اور نثری کتب مطبوعہ موجود ہیں۔ نمونہ کلام:

اے جنوں گھر میں نہ رکھ قید، کہ ہے فصل بہار ورنہ ہر گوشہ مجھے، ایک بیاباں ہوگا
روزنِ در سے ہے لپٹی ہوئی میری تصویر پڑ گئی آنکھ تو، حیرت میں نگہباں ہوگا

دہر میں ڈھونڈتا ہوں میں، ولولۂ حرم وہی جس نے بتانِ شوخ کو خانہ خراب کردیا
بادِ سحر نے خاک پر پھول گرائے اس طرح قبرِ شہید ناز کو، زیر نقاب کردیا

ہم ہوں محروم تمنا، اس کو حاصل وصلِ یار
سوے دشمن دیکھتے ہیں ہائے کس حیرت سے ہم
پیش الفت کس کی بن پڑتی ہے، سب مجبور ہیں
رشک سے دشمن، جفا کاری سے تم، وحشت سے ہم

رضیؔ بدایونی:

ان کا تخلص شررؔ بھی تھا۔ کلام کا ایک انتخاب ''لمعات'' مرتبہ پروفیسر ضیا احمد (علی گڑھ ۱۹۴۷ء) شائع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام:

ہر جنبشِ نظر میں تھی اک داستان شوق
دل آپ ترجمانِ زبانِ خموش تھا

زبانِ حال نے شرحِ حدیث آرزو کردی
اسے کہتے ہیں خاموشی کا معنی آفریں ہونا

رعنائیاں ہیں سب مرے، حسن خیال کی
اپنے کو دیکھتا ہوں، رخِ یار دیکھ کر

گرمیِ سوز محبت کا اثر باقی ہے
شرر آباد ہے خاکستر پروانہ ہنوز

وہی نصیب کی گردش تھی ہم، جہاں پہنچے
کہیں زمیں نہ ملی دور، آسماں سے الگ

کہتے ہیں جس کو زیست طلسم امید ہے
ہر سانس ہے فریب تمنا لیے ہوئے

صدہا مذاقِ حسن سے بیگانہ رہ گئے
یہ امتیاز معنی و صورت لیے ہوئے

جوہر بدایونی:

مجموعہ کلام ''عرض جوہر'' مرتبہ افتخار بیگم صدیقی (دہلی ۱۹۸۷ء) شائع ہو چکا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں راقم الحروف کا مضمون (مشمولہ 'رہنمائے تعلیم' دہلی۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء) نمونہ کلام:

دید اس جلوۂ بے رنگ کی مشکل تو نہیں
دیکھنا یہ ہے نظر پردۂ حائل تو نہیں

ذرہ ہوں، مگر اس کی تجلّی کا نشاں ہوں
ہستی میری بے پرتوِ خورشید نہ ہوتی

طبع ناشاد، کبھی شاد تو ہوتی ہوگی
قید غم کی، کوئی میعاد تو ہوتی ہوگی
طرب آگیں نہ سہی، نالۂ مرغانِ قفس
رونقِ خانہ صیاد تو ہوتی ہوگی

لب تک آجاتا ہے کچھ شکوۂ آلام ابھی
شاید اے شوق ہے، سودائے جنوں خام ابھی

صحرا کی تیز دھوپ میں لایا جنوں کا جوش
اب سوچتے ہیں سایۂ دیوار ہی ملے

ظفر احمد صدیقی:

نظم کے شاعر تھے۔ مجموعہ کلام '' فکر و نظر'' مرتبہ افتخار بیگم صدیقی (دہلی ۱۹۹۱ء) شائع ہو چکا ہے۔ نمونہ کلام:

نگہِ ناز کو نہ دو تکلیف
دل میں اب یاس کے سوا کیا ہے
جس کو مرنے کی بھی امید نہ ہو
اس کی حسرت کا پوچھنا کیا ہے
یونہی انجان بن کے پھر پوچھو
مجھ سے تم، میرا مدعا کیا ہے

حاملِ مقصد ہے اب ہر ذرۂ بزمِ وجود زندگی ہے عشق کا اک امتحاں میرے لیے
اب رضائے دوست کی خاطر ہے میری زندگی اب نہیں اندیشہ سود و زیاں میرے لیے
جس کا سجدہ ہے ہر اک بند غلامی سے نجات سجدہ گاہِ شوق ہے وہ آستاں میرے لیے
پالیا ہے عشق نے جب سے نشاطِ غم کا راز مٹ گئی ہیں درد و غم کی تلخیاں میرے لیے

دلاور فگار:

فگار طنز و مزاح کے شاعر تھے۔ ۹ شعری مجموعے، ایک انتخاب دو کلیات اور نثری کتب یادگار ہیں[1]۔ فگار صرف لفظوں سے نہیں بلکہ خیال سے ابھرنے والے مزاح کے قریب تر ہیں اور یہ وصف خاص غالب کا ہے۔ انہوں نے غالب کی فکر اور اُسلوب سے وافر استفادہ کیا ہے۔ غالب پر مستقل نظمیں لکھنے کے علاوہ (جن کا ذکر سطور آئندہ میں آئے گا) انہوں نے غالب کے معروف مضامین، اشعار، تراکیب کو اپنی شاعری میں سموکر ان کی ادبی لطافت کو ظرافت میں بدل دیا ہے۔ یہی نہیں غالب کے اشعار و مصرعوں میں تحریف کر کے ان کے معانی کو وسعت اور انسانی واقعات پر اُن کی مزاحیہ تطبیق کی ہے۔ صرف چند شعر مثال میں درج کیے جاتے ہیں:

باپ سیلاب فنا میں بہہ گئے
ایک ہم مرنے کو زندہ رہ گئے

شعر سنیے، چند دن کی زندگانی اور ہے
اس لیے ہم نے بھی اپنے دل میں ٹھانی اور ہے

پالسی یہ دے گئے ہیں ہم کو اکبر اینڈ سنس
طنز میں پھسلا اگر شاعر تو مٹ جاتا ہے طنز

---

[1] فگار پر مزید مطالعہ کے لیے دیکھیے راقم الحروف کی کتب دید و دریافت (۱۹۸۱ء) اور نقد و اثر (۲۰۰۴ء)

نہ مجھ کو اتنے غم ہوتے نہ میں اتنا بڑا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ڈیڈی نے، نہ یہ ہوتے تو کیا ہوتا؟

داغِ فراقِ دعوتِ شب کا بچا ہوا
ہے ایک کوفتہ جو مرا ٹارگیٹ ہے

کتنے غالب تھے کہ پیدا ہوئے اور مر بھی گئے
قدردانوں کو تخلص کی خبر ہونے تک
دل شاعر پہ کچھ ایسی ہی گزرتی ہے فگار
جو کسی قطرے پہ گزرے ہے گہر ہونے تک

جہاں تک نثر کا تعلق ہے غالبؔ کا سب سے زیادہ اثر نظامیؔ بدایونی (تلمیذ حالیؔ) نے قبول کیا۔ انہوں نے ادب میں شاہراہِ حالیؔ کو منتخب کیا۔ اور نظریہ شعروادب میں حالیؔ کے متبع وہم نوا رہے۔ اگرچہ انہوں نے شعوری طور پر یہ کسب حالی اور سرسید کی "تحریک اصلاحِ ادب" کے زیر اثر کیا لیکن یہ بات بھی کم دلچسپ نہیں کہ حالی و سرسید میدانِ ادب میں سلسلہ غالب کی اولین کڑیاں ہیں۔ لہٰذا نظامی کو جو کچھ حاصل ہوا وہ فیضان غالب ہی کے زیرتحت آجاتا ہے۔

میر محفوظ علی (ف ۱۹۴۳ء) کا نثری کام بیشتر طنز ومزاح تک محدود ہے۔ لیکن ان کے یہاں جو معنوی تہہ داری، متانت آمیز شوخی اور اسلوب میں شگفتگی ملتی ہے، اسے غالب کا فیضان کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے:

"اُن (محفوظ علی) کی مزاح نگاری زیادہ تر اسٹائل کی رنگینی، شگفتگی اور بے ساختگی سے پیدا ہوتی ہے۔ غالب کی خطوط نویسی کا انداز، محفوظ علی بدایونی کی شگفتہ طرز نگارش... دراصل ایک ہی سلسلے کی

کڑیاں ہیں۔ غالب مرحوم کی طرح محفوظ علی بدایونی نے بھی نہ صرف اپنے اسٹائل کی شگفتگی سے مزاح پیدا کیا بلکہ اپنے مزاح کے نقوش اس گھریلو ماحول کے پس منظر پر ابھارے جو ان کے خیالات و تصورات سے بہت قریب تھا۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں بول چال کی صفائی، محاورہ بندی اور ماحول کے مختلف افراد کے مرقعے ملتے ہیں اور ناظر کو محظوظ کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔''

(اردو ادب میں طنز و مزاح، ص ۱۸۸، ۱۸۹)

سلطان حیدر جوش (ف ۱۹۵۴ء)، ابوالفضل صدیقی (ف ۱۹۸۱ء)، اختر انصاری (ف ۱۹۸۸ء)، پروفیسر آل احمد سرور (ف ۲۰۰۲) وغیرہ کو غالب کے اثر سے بے نیاز نہیں کہا جاسکتا۔

شعرائے بدایوں کی غالب سے متاثر ہونے کی اور بھی متعدد صورتیں ہیں۔ ان میں سے یہ چند حسب ذیل ہیں:

۱۔ غالب کی طرح پر مشاعرے

۲۔ غالب کی زمینوں میں کلام

۳۔ غالب کی غزلیات کی تضمین

۴۔ غالب کے اشعار سے مطبوعات کے نام

ان سب کی تفصیل بیان کرنا کتاب کو غیر ضروری طول دینے کے مصداق ہوگا۔ لہٰذا ان میں سے ہر ایک صورت کی دو ایک یا چند مثالوں پر ہی اکتفا کیا جارہا ہے۔

۱۔ غالب کی طرح پر مشاعرے:

بدایوں میں غالب کی طرح پر متعدد مشاعرے ہوئے۔ ایک مشاعرہ اردو کانفرنس بدایوں کے زیر اہتمام ہوا۔ یہ کانفرنس اردو سے متعلق اہم اور تاریخی حیثیت کی حامل تھی۔ ۲۶، ۲۷، ۲۸/مارچ ۱۹۱۰ء کو اس کا پہلا اجلاس بدایوں میں ہوا۔ (ذوالقرنین، بدایوں، ۲۸/مارچ ۱۹۱۰ء) جس کا صدارتی خطبہ مولوی عزیز مرزا (ف ۱۹۱۲ء) ہوم

سکریٹری ریاست حیدرآباد نے پیش کیا۔ مولوی امیر احمد امیرؔ بدایونی اس کانفرنس کے سکریٹری تھے۔ ۲۶، ۲۷، ۲۷/مارچ ۱۹۱۰ء کی شب میں دونوں دن مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے میں احسنؔ مارہروی، نوح ناروی، بیباک شاہجہانپوری، بزم اکبرآبادی، سیماب اکبرآبادی، تسلیم لکھنوی، کمال لکھنوی، بیخود دہلوی، سائل دہلوی، رسا رامپوری اور بعض دوسرے بیرونی و مقامی شعرا نے شرکت کی تھی۔ مصرعہ طرح تھا:

تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

اس زمین میں افضال احمد بسملؔ بدایونی (ف ۱۹۱۸ء) تلمیذ امیرؔ مینائی کا یہ شعر حاصل مشاعرہ قرار دیا گیا:

میں نے اپنا جامۂ ہستی حوالے کر دیا
شرم آئی دیکھ کر، خنجر کی عریانی مجھے

اس شعر کے مفہوم پر اختر انصاری نے ایک نظم ''عجز نظر'' کہی جو اُن کے آخری مجموعہ کلام، ایک قدم اور سہی (ص:۹۹، مرادآباد ۱۹۸۴ء) میں شامل ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں حقائق و بصائر، ص: ۱۶۳ تا ۱۸۲)۔

۱۹۲۲ء میں مسٹر او۔ ایف جینکنس آئی سی ایس ڈسٹرکٹ جج بدایوں جو کہ علوم مشرقی خاص طور پر شاعری کا ذوق رکھتے تھے اور خود بھی شعر کہتے تھے، ایک لمبی رخصت پر بدایوں سے باہر تشریف لے جانے والے تھے۔ اس موقع پر مولوی اکرام عالم ایڈوکیٹ (ف ۱۹۴۴ء) نے وکٹوریہ پارک بدایوں میں ایک الوداعی پارٹی دی۔ ان کی خواہش پر ایک بزم مشاعرہ بھی منعقد کی گئی۔ مصرعہ طرح تھا:

اے عندلیب وقت وداع بہار ہے

اس طرح کی یہ خوبی تھی کہ ''ہے'' کو 'ہست' یا 'شد' سے بدل کر فارسی میں بھی طبع آزمائی کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ میر جلسہ اور چند دوسرے شعرا نے فارسی میں غزلیں پڑھیں۔ یہ مشاعرہ ۱۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو منعقد ہوا۔ ضلع جج کے یہ اشعار قابل توجہ بنے

اور زلالی کی تضمین حاصل مشاعرہ۔

این جا کہ یاسمین و گل و لالہ سوخت ہست
اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہست
ہم راہ من بیا بہ ولایت روانہ شو
کانجا رفیق! وقت شروع بہار ہست

[او۔ ایف جینکنس]

(رک حقائق و بصائر، ص: ۱۶۳ تا ۱۸۳)

عبدالصمد قادری سروری بدایونی کا مرتبہ ایک گلدستہ، ''آئینہ مشاعرہ'' (مطبوعہ عزیزی پریس، آگرہ) نظر سے گزرا جس کے مطابق غالب کے مصرعہ طرح:

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

پر ایک مشاعرہ ۱۸ راگست ۱۹۱۰ء کو بھوپال میں منعقد ہوا تھا جس میں متعدد شعرائے بدایوں مثلاً امیر احمد امیرؔ، عطا محمد عطاءؔ، اکرام احمد لطفؔ، عبدالحئی شیداؔ، ظہور الحق ظہور، سرورؔ قادری، مجتہد الدین عیشؔ، قمرالحسن قمر، منظور بدایونی کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ ان شعرائے بدایوں کا کلام مع تعارف گلدستے میں شامل ہے۔ اسی مشاعرے میں عاشق حسین بزم اکبرآبادی (ف ۱۹۵۳ء) نے یہ شعر پڑھا تھا:

ایک تصویر کسی شوخ کی اور نامے چند
گھر سے عاشق کے پس مرگ یہ ساماں نکلا

جو بعد میں غالب کے نام سے منسوب ہو کر معروف ہوا۔ اس گلدستہ میں کلام کے علاوہ شعرا کا تعارف بھی پیش کر دیا گیا ہے۔

۲۔۔۔ غالب کی زمینوں میں کلام:

غالب کی اختیار کردہ بحریں، ردیف و قوافی عموماً دل پسند اور اچھوتے ہیں۔ اگرچہ کچھ زمینوں میں دوسرے اساتذۂ سخن کی غزلیات بھی موجود ہیں لیکن غالب نے ان

زمینوں کو اختیار کر کے ان کی غنائیت کو دوچند کر دیا ہے۔ غالب کی اختیار کردہ زمینوں میں غالب کی خاص طرز ادا کے سبب جدت، ندرت، لطافت اور غنائیت در آئی ہے اور ایک طرح کا صوتی آہنگ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد کے شعرا نے ان زمینوں میں شعر کہہ کر اپنی استادانہ مہارت کا ثبوت دیا۔

شعرائے بدایوں کے دواوین میں غالب کی زمینوں میں ہم طرح غزلیات کی ایک بڑی تعداد ملتی ہے۔ لیکن یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ چودھری اصغر علی ضابطؔ (ف ۱۸۹۲ء) جن کی غالب سے غلط طور پر نسبتِ تلمذ حلقہ بدایوں میں معروف ہوئی۔ ان کے دیوان میں غالب کی زمینوں میں متعدد ہم طرح غزلیں ہیں۔ غالب کی مشہور غزل:

سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

پر انہوں نے کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ غالب کی مذکورہ غزل میں ۱۰ شعر ہیں۔ ضابط نے ۱۵ شعر کہے ہیں اور غالب کے چھ قوافی استعمال کیے ہیں۔ نمونے میں غالب کے استعمال کردہ قوافی پر مشتمل ضابط کے اشعار ان کے دیوان سے اخذ کر کے درج کیے جارہے ہیں:

جلوہ طور کا نشاں مجھ کو نہ تو بتا کہ یوں
شعلہ حسن برق سوز ایک نظر دکھا کہ یوں

مجھ سے کہے کوئی اگر کیسے نہ اُٹھ سکے گا تو
بولے زبانِ حال سے راہ کے نقشِ پا کہ یوں

آئی تھی کس طرح قضا پوچھتا تھا میں جا بجا
آخر کار بول اٹھی، اس کی ہر اک ادا کہ یوں

خیرہ نگاہ ہوگئی حسنِ نظارہ سوز سے
شوق تو دیکھنے کا تھا، دیکھا تو کیا ہوا کہ یوں

کہتے ہیں اس طرح میں جو، شعر نکلتے ہی نہیں
ضابطؔ خوش نوا نہیں یہ تو غزل سنا کہ یوں

(کلماتِ ضابط، ص: ۱۳۲)

سطور گذشتہ میں کلام فانی سے بھی ہم طرح اشعار و غزلوں کی متعدد مثالیں دی جاچکی ہیں۔ اس قسم کی مثالوں سے سوائے غالب پسندی کے اور کوئی صورت و کیفیت سامنے نہیں آتی۔ البتہ غزل کے علاوہ چند دوسری اصناف مثلاً قصیدہ، قطعہ، تشطیر وغیرہ

میں غالب کی زمینوں میں شعراے بدایوں نے جو طبع آزمائی کی ہے وہ کہیں تو نیازمندانہ عقیدت اور تتبع غالب کا راست نتیجہ معلوم ہوتی ہے اور کہیں اس کی صورت تفاخر و تعلّی یا جواب کی سی ہوگئی ہے۔ یعنی:

دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

شعراے اردو نے تفاخر و تعلی، جواب اور جواب الجواب، تحریف پیروڈی وغیرہ میں ہم قافیہ و ہم مضمون اشعار کہے ہیں، اور مضمون و خیال یا طرز ادا میں وسعت یا ندرت پیدا کی ہے۔ مثلاً داغ نے کہا تھا:

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر آتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ جاتا ہے

ظہیر و داغ کے شاگرد نجم الدین احمد ثاقب بدایونی (ف ۱۹۴۵ء) نے اس کے جواب میں کہا:

یہ کہہ کر اُٹھ گیا وہ شمع رو آخر کو محفل سے
جدھر ہوتا ہے میرا منھ اُدھر پروانہ آتا ہے

غالب کی زمینوں کے ساتھ یہی صورت بدایوں میں بھی نظر آتی ہے۔ بعض شعرا نے غالب کی زمینوں میں محض شاعرانہ اظہار فوقیت کے لیے طبع آزمائی کی۔ مثلاً غالب کے معاصر اور مخالف علی بخش خاں شرؔر (ف ۱۸۸۵ء) نے غالب کے قطعہ بند اشعار جو چکنی ڈلی سے متعلق ہیں، اسی زمین میں ''پیچوان کی رسید'' میں ایک قطعہ لکھا، جو قابل مطالعہ ہے۔ غالب کا یہ قطعہ دس اشعار پر مشتمل ہے جس کا پہلا شعر ہے:

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

شرر نے اسی طرز پر ۲۷ شعر کہے۔ چند شعر ملاحظہ کریں:

پیچواں حقہ عنایت جو کیا حضرت نے جگر و دل میں یہ جھگڑا ہے اسے کیا کہیے

قبہ عرشِ معلیٰ کے مشابہ لکھیے ۔۔۔ اور لطافت میں مہ و مہر سے مانا کہیے
بُرج سے دلو کے، گر وضع میں دیجیے تشبیہہ ۔۔۔ روشنی میں بھی اسے عِقدِ ثریا کہیے
اور اس یچے کو تشبیہ میں لکھیے رگِ جاں ۔۔۔ حلقہ زلفِ حسینانِ خود آرا کہیے
حقے کو لکھیے اگر ماہِ شب چاردہم ۔۔۔ یچے کو دیکھتے ہی، چاند کا ہالا کہیے
گوہر گوش حسیناں جو کہا حقے کو ۔۔۔ حلقہ یچے کا نہ کیوں کان کا بالا کہیے
خم کو، یچے کے ہے، محراب حرم سے تشبیہہ ۔۔۔ خم ابروے شگرفانِ خود آرا کہیے
نَے کو دیکھو تو ہے اک زاہدِ لاغر کی مثال ۔۔۔ ذکر حق حق کو نہ کیوں اس کا وظیفا کہیے
آتش گل سے جو اس نَے پہ چمکتی ہے چلم ۔۔۔ ساتھ موسیٰ کے ضیاے یدِ بیضا کہیے
گوش غلماں کا تو آویزہ یہ حقہ ہے، شررؔ ۔۔۔ یچے کو اشک دہ گیسوے حورا کہیے

(رسید حقہ پیچوان، مشمولہ دیوان شرر، ص: ۱۱۱، ۱۱۳)

یہ مکمل قطعہ دیوان شرر (مطبوعہ اسعد الاخبار آگرہ ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۲ء) میں شامل ہے۔ مولانا عرشی نے دیوان غالب اردو (نسخہ عرشی) میں بھی اسے شامل کرلیا ہے۔ (ص: ۲۲۲، ۲۲۳) نیز غالب اور عصر غالب (ص: ۹۰، ۹۱) میں بھی اُسے دیکھا جاسکتا ہے۔

سدید الدین شائقؔ بدایونی (ف ۱۹۰۵ء) تلمیذ افضل لکھنوی۔ بدایوں کے نازک خیال شعرا میں شمار تھا۔ نعت و مناقب کا ایک مجموعۂ مختصر ''نظم رعنا'' ۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۳ء میں مطبع نسیم سحر بدایوں سے طبع ہوا۔ اس میں ۲۵/اشعار پر مشتمل ایک قطعہ غالب کی زمین ''ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے'' میں دیدنی ہے۔ ایک نعت غالب کی زمین:

مشکلیں مجھ پر پڑی اتنی کہ آساں ہوگئیں

بھی قابل مطالعہ ہے۔ اس نعت میں غالب کا صرف ایک قافیہ 'آسان' نظم ہوا ہے۔ باقی قافیے غالب کے استعمال کردہ نہیں۔ نمونہ کلام:

کیا عنایات نبی، ہر غم کا درماں ہوگئیں ۔۔۔ مشکلیں سی مشکلیں، آساں سی آساں ہوگئیں

تھا فقط نام نبی، جب ہم مدینہ کو چلے   بے سروسامانیاں جتنی تھیں ساماں ہوگئیں
جب سرِ منبر کیا کچھ ذکر روے مصطفیٰ   مجلسیں یوں چمکیں خورشیدِ درخشاں ہوگئیں
لے گئی مٹھی میں حسرت جلوہِ دیدار کی   خواہشیں جتنی تھیں وقف کوے جاناں ہوگئیں
مرتے مرتے لے چلے ہم، داغِ عشق مصطفیٰ   حسرتیں مٹی میں مل کر اور پنہاں ہوگئیں
سر مرا سنگِ درِ احمد پہ صدقے ہوگیا   آنکھیں نذرِ خاکپاے شاہِ مرداں ہوگئیں
کیا قیامت خیز مضموں نعت میں شائق لکھے   یہ زمینیں بھی قیامت کا ساماں ہوگئیں

زلالی بدایونی کا قصیدہ نعت "بابِ عشرت" (مطبوعہ بدایوں سنہ ندارد) غالب کے مشہور قصیدے "صبح دم دروازہ خاور کھلا" کی زمین میں ہے۔ یہ قصیدہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ مولوی ستار بخش ستارؔ قادری کا "قصیدہ سبع سیّار" (مطبوعہ وکٹوریہ پریس، بدایوں ۱۳۱۳ھ/ 1895ء) غالب کے قصیدے:

ساز یک ذرہ نہیں، فیضِ چمن سے، بے کار
سایہ لالہ بے داغ، سویداے بہار

کی زمین میں ہے۔

دلاور فگار (ف ۱۹۹۸ء) کی متعدد مزاحیہ غزلیں غالب کی زمینوں میں ہیں۔ معروف شاعرہ پروین شاکر (ف ۱۹۹۴ء) کا مرثیہ، غالب کے اس معروف قطعے کی زمین میں لکھا جس میں ششماہے کے بارے میں بادشاہ کے حضور شکایت پیش کی گئی ہے اور جس کا آخری شعر یہ ہے:

تم سلامت رہو ہزار برس   ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اس طرح کی متعدد مثالیں اور بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔

۳۔۔۔غالب کی غزلیات کی تضمین:

غالب کی غزلیات کو بھی شعراے بدایوں نے تضمین کیا۔ غالب کے عہد سے موجودہ عہد تک سات شعراے بدایوں کی تضمینات کے نمونے درج کیے جارہے ہیں ان

کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوگا کہ شعرائے بدایوں کس حد تک غالب کی فکر اور اس کی مخصوص طرز ادا کے قریب پہنچ سکے ہیں۔

(۱)— قاضی عنایت حسین رشکی (ف 1918) غالب کے شاگرد تھے۔ ان کے کلام پر مشتمل ایک بیاض جناب مونس نظامی (محلّہ سوتھا، بدایوں) کے پاس نظر سے گذری۔ اس میں غالب کی ایک قطع بند غزل پر بہ صورت خمسہ تضمین شامل ہے۔ اس تضمین کے دو بند درج کیے جاتے ہیں:

کیا ہے یہ کیوں، زمانے میں جوش وخروش ہے جاں سے ہر ایک تنگ ہے، سر بار دوش ہے
مجھ کو نہ دین و دنیا کا واللہ ہوش ہے ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر، سو خموش ہے

بیٹھے ہو آج رشکی خستہ کس حال میں آئی تمہاری نکبت و ذلّت کمال میں
گزرے وہ دن جو رہتے تھے ہر دم ملال میں آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب، صریر خامہ، نوائے سروش ہے

(۲)— انصار حسین زلالی (ف ۱۹۲۴ء) حالی کے شاگرد تھے۔ وہ حالی وغالب سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی تضمین کے چند بند درج کیے جا رہے ہیں۔ مکمل تضمین راقم الحروف کی کتاب حقائق و بصائر (ص: ۲۱۱ تا ۲۱۵) میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ تضمین انہوں نے ۱۹۲۲ء کی اس شعری نشست کے لیے کہی تھی جس کا مصرعہ طرح تھا:

اے عندلیب وقت وداعِ بہار ہے

کس گوں کے یہ نشیب و فراز اور تحت وفوق درماندگی نے ڈال دیا ہے گلے میں طوق
خمیازہ کھینچنے کا کرے خاک کوئی ذوق ہے ذرہ ذرہ تنگی جا سے غبار شوق
گردام یہ ہے وسعت صحرا شکار ہے

نرگس کو دیکھتا ہوں تو ہے تیوری خراب گل کو ہے وہم داغ تو، سنبل کو پیچ و تاب

رو رو کے آبپاش ہوا راہ میں سحاب چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگِ گل پہ آب

اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

غالب تمہارے آگے زلالی کی کیا بساط گستاخ کر رہا ہے تمہارا ہی ارتباط

کہنا پڑا، نہ کہتے، اگر کرتے احتیاط غفلت کفیل عمر و اسد ضامنِ نشاط

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

(۳)—— **فانی بدایونی** پر غالب کے اثرات کی گذشتہ سطور میں نشاندہی کی جاچکی ہے۔ کلیات فانی میں غالب کی غزل پر ایک تضمین بھی ملتی ہے۔ غالب کی غزل ۱۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ تضمین کے صرف چار بند کلیات میں شامل ہیں۔ دو بند نقل کیے جارہے ہیں:

کوئی آسان ہے ہر موج کا طوفاں ہونا ہر گل تازہ کو فردوس بداماں ہونا

ہر تجلی کو فروغِ رخِ جاناں ہونا بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

کم نہیں کوئی بھی ہنگامہ حسرت غالب پھر جسے اس کی محبت سے ہو نسبت غالب

وحشت اور پھر دلِ شوریدہ کی وحشت غالب حیف اس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالب

جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

(۴)—— **سید جمیل احمد جمیل سہسوانی** (ف ۱۹۳۵ء) تلمیذ منیر شکوہ آبادی کے دیوان ثمرۂ فصاحت (مطبوعہ مطبع سلطانی بھوپال ۱۳۲۹ / ۱۹۱۱ء) کے حصہ اول ''حدائق خوش بیانی'' میں ایک خمسہ بر غزل غالب شامل ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے اس خمسہ کے تین بند نقل کر کے ارسال کیے۔ دو بند درج کیے جاتے ہیں:

خیر سے سمجھے ہوئے ہیں وہ محبت کو گناہ سیدھے سادے ہیں، حقیقت پر نہیں ان کی نگاہ

اس کو میں بھی مانتا ہوں وہ ہیں میرے خیر خواہ حضرت ناصح گر آئیں، دیدہ و دل فرش راہ

کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

قابل افسوس ہے اس شہر کی حالت اسدؔ عشق کا چرچا ہے کم، چاہت کی ہے قلت اسدؔ
کیوں جمیلؔ آئے یہاں، آئی تھی کیا شامت اسدؔ ہے اب اس معمورے میں قحطِ غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہے کھائیں گے کیا

(۵) — پروفیسر ضیاء احمد (ف ۱۹۷۳ء) نے غالب کی تین غزلیات کو تضمین کیا جو کلیات ضیاؔ مرتبہ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی (علی گڑھ ۱۹۹۸ء) میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ایک تضمین کے دو بند ملاحظہ کریں:

کم نہ تھا تختۂ مشقِ غم دوراں ہونا اس پہ صد مشکل پیہم کا نمایاں ہونا
کچھ نہ پوچھو غم گیتی کا فراواں ہونا بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ہوسِ کوے صنم گرچہ نہیں کم مجھ کو یاد ہے حسن نظر سوز کا عالم مجھ کو
کر دیا حیرتیِ جلوۂ پیہم مجھ کو وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

(۶) — رفیق احمد میکش بدایونی (ف ۱۹۸۹ء) بن پروفیسر ضیاء احمد کے مجموعہ کلام میکدہ (مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاوس علی گرھ ۱۹۷۴ء) میں نذر غالب عنوان سے غالب کی غزل کی تضمین ملتی ہے۔ غالب کی غزل میں ۱۱ شعر ہیں لیکن تضمین چھ بندوں پر مشتمل ہے۔ دو بند درج کیے جاتے ہیں:

وہ نغمگی! ناہید فلک جس کی قسم کھائے وہ صوت! کہ الحانِ عنادل کو بھی شرمائے
وہ لہجہ خوش! جو دلِ عاشق پہ غضب ڈھائے مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

ہم آج بھی سرگشتہ ہیں وادیِ خودی میں بھٹکے ہیں بہت جادۂ بے راہ روی میں
مشغول رہے بندگیِ نفس دنی میں ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں! تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

(۷)۔۔۔ حنیف نقوی بنیادی طور پر محقق ہیں لیکن شعروشاعری سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ میری گزارش پر غالب کی فارسی نعت کی تضمین ارسال کی۔ دو بند نقل کیے جاتے ہیں[1]:

روشن ہو تیری آنکھ تو اُٹھ جائے ہر حجاب — ہر چیز سے ہو جلوہ حقیقت کا بے نقاب
بن جائے تیرے واسطے یہ نکتہ اک کتاب — آئینہ دارِ پرتو مہرست آفتاب

شان حق آشکار زشان محمدست

ہمت ہزار بار بہ وصفش گماشتیم — معلوم شد کہ تابِ ستائش نہ داشتیم
ایں مقطع آخرش سر کاغذ نگاشتیم — غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم

کاں ذاتِ پاک مرتبہ دان محمدؐ است

(۸)۔۔۔ امیر احمد امیرؔ بدایونی (ف ۱۹۴۹ء) کا شمار غالب کے ان متبعین میں ہوتا ہے جنھوں نے زندگی بھر طرز غالب کو عزیز رکھا۔ انہوں نے مستزاد کے انداز پر غالب کی ایک غزل پر ٹکڑے لگائے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ مستزاد میں شعر کے آخر میں ٹکڑے لگائے جاتے ہیں۔ انہوں نے شعر کے شروع میں ان ٹکڑوں کا اضافہ کیا ہے۔ مدیر نقیب شیخ وحید احمد مسعود نے اس غزل کو اپنے نوٹ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ سطور ذیل میں غزل مع نوٹ درج کی جارہی ہے[2]۔

غالب نئی پوشاک میں:

''مرزا غالب کی یہ غزل جو یہاں پیش کی جاتی ہے، مولوی صاحب قبلہ کی جدت طبع کی بدولت نئی پوشاک میں نمودار ہوئی ہے۔ قابل تعریف یہ خصوصیت ہے کہ ہر مصرعے کے شروع میں جو الفاظ زائد بہم پہنچائے گئے ہیں ان سے نہ مرزا کے علوے تخیل میں فرق

---

[1] مکمل تضمین سہ ماہی ادراک (گوپالپور) اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۰۴ء میں دیکھی جاسکتی ہے۔

[2] نقیب سے یہ غزل مع نوٹ نقل کرکے ڈاکٹر شاداب زکی (بدایوں) نے ارسال کی۔ ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

آتا ہے اور نہ زبان کا لطف کم ہوتا ہے۔ایسی ہی جدت طرازیاں نظم
اردو میں چار چاند لگا سکتی ہیں۔ غالب کے رنگ میں حضرت امیر کو جو
ید طولیٰ حاصل ہے یہ اسی کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔" (ایڈیٹر)

وہ تو اپنے جور سے باز آئیں، پر باز آئیں کیا
بے تکلف کہتے ہیں: "ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا؟"

گر یہ سچ ہے رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ایک دن پھر ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا؟

اپنے دل سے لاگ ہو تو، اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
لاگ دل سے جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا؟

گزرے ہے گر موج خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
ڈر کے اب ہم آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟

کس ادا سے پوچھتے ہیں وہ کہ "غالب کون ہے؟"
اب تو اتنا کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

غالب کی مذکورہ غزل میں چھ شعر ہیں۔ لیکن نقیب میں پانچ شعر ہی شاملِ
اشاعت ہوئے۔

غالب کے اشعار سے مطبوعات کے نام

غالب نے اردو قلم کاروں کے ذہن و قلم کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ انہوں نے اپنی تصانیف کے نام غالب کے اشعار میں مستعمل کسی لفظ یا لفظی ترکیب سے اخذ کیے۔ ایسی کتب کی تعداد اس وقت ۲۵۰ سے متجاوز ہے۔ لیکن بعض اہل قلم نے غالب کے انداز پر خود ہی تراکیب وضع کیں اور ان کو اپنی کتب کا سرنامہ بنایا۔ مثلاً اختر انصاری (ف ۱۹۸۸ء) کی حسب ذیل کتب کے نام اشعار غالب سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں:

نغمہ روح (دہلی ۱۹۳۲ء)، خندہ سحر (دہلی ۱۹۴۴ء)، شعلہ بجام (علی گڑھ ۱۹۶۸ء)، شعلہ بکف (علی گڑھ ۱۹۷۳ء) وغیرہ۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنے مضمون ''یک عمر ناز شوخی عنوان اٹھائیے'' (مشمولہ علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۱۹۶۹ء) میں ایسی دوسو کتب کی نشاندہی کی ہے، جن کے نام اشعار غالب سے حسب موضوع و منشاء حاصل کیے گئے ہیں۔ انہوں نے مصنفین بدایوں کی حسب ذیل کتب کے ناموں کو اشعارِ غالب سے ماخوذ قرار دیا ہے۔

اختر انصاری خوناب (غزلیات، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۳ء)

ہر بنِ مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوناب
حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا

اختر انصاری بادہ شبانہ (انتخاب کلام، لاہور ۱۹۶۱ء)

وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی

اختر انصاری پرطاؤس (انتخاب قطعات۔علی گڑھ ۱۹۶۵ء)

تھا خواب میں کیا جلوہ پرستار زلیخا
ہے بالش دل سوختگاں میں پرطاؤس

عروج زیدی دل لخت لخت (مجموعہ کلام ۱۹۶۷ء)

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کیے ہوئے

مندرجہ بالا کتب کے مصنّفین کی صراحت کے بغیر ان ناموں کو اشعار غالب سے ماخوذ قرار دینا کیا درست ہوگا؟ خصوصاً آخری کتاب کے نام ''دل لخت لخت'' کو ''جگر لخت لخت'' ترکیب کے تحت رکھنا کیا مناسب ہے؟ اس سلسلے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ غالب کے اشعار سے حاصل کردہ ناموں کے زمرے میں صرف وہی نام جگہ پاسکتے ہیں جو غالب کی خاص اپنی وضع کردہ دولفظی وسہ لفظی تراکیب یا مصرعے کے کسی ایک جزو پر مشتمل ہوں۔ یا پھر نامِ کتاب کے سلسلے میں مصنف نے صراحت کردی ہو کہ وہ کلام غالب سے ماخوذ ہے۔ مثلاً اختر انصاری کے شعری انتخاب، دہان زخم (علی گڑھ ۱۹۷۱ء) پر غالب کا یہ شعر درج نہیں:

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

لیکن انہوں نے نجی گفتگو میں مجھے بتایا کہ یہ نام انہوں نے غالب کے شعر سے

حاصل کیا ہے۔ دہان زخم کی ترکیب بھی غالب ہی کی وضع کردہ ہے۔ غالب سے پیشتر یہ ترکیب کسی شاعر کے کلام میں نظر نہیں آتی۔ اسی طرح دلاور فگار (ف۱۹۹۸ء) کا مجموعہ کلام ''انگلیاں فگار اپنی'' (کراچی ۱۹۷۱ء) غالب کے حسب ذیل شعر کے مصرع ثانی کے جزو اول پر مشتمل ہے:

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلا دوں

انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا

منظوم خراج عقیدت

غالب کی شان میں منظوم خراج عقیدت کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ان منظومات کا اشاریہ نہیں بنا سکا۔ تاہم میری معلومات میں حسب ذیل شعرا کی منظومات ہیں:

۱۔ ابر احسنی گنوری (ف ۱۹۷۳ء) رباعیات بسلسلہ جشن غالب کلکتہ۔ مشمولہ خزینے، ص ۶۹ (دہلی، ۱۹۷۱)

نظم، صد سالہ جشن غالب بدایوں، غالباً غیر مطبوعہ

۲۔ اظہر کمالی (ف ۱۹۹۱ء) نظم، غالب کی کہانی، کچھ ان کی کچھ میری زبانی، میگزین فضل الرحمٰن اسلامیہ کالج بریلی، غالب نمبر ۷۰۔۱۹۶۹

یہ نظم اکیس اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر شعر کا ایک مصرعہ یا تو غالب کے کسی شعر سے لیا گیا ہے یا اس میں غالب کے شعر کی کوئی ترکیب، کوئی خاص لفظ یا خیال اس طرح پیوست کر دیا گیا ہے جو نظم کے مرکزی خیال کو آگے بڑھاتا ہے اور غالب کی کہانی کو بھی بیان کرتا ہے۔

۳۔ حنیف نقوی، غالب (سانیٹ)، غالباً غیر مطبوعہ

۴۔ حیاتؔ، مسعودہ حیات، عظمت غالب،

میگزین فضل الرحمٰن اسلامیہ کالج بریلی غالب نمبر ۷۰۔۱۹۶۹

۵۔ حیرتؔ بدایونی (ف ۱۹۷۵ء) نظم، مطبوعہ

روزنامہ رہنمائے دکن حیدرآباد، ۸/مارچ ۱۹۶۹ء

۶۔ سرورؔ آل احمد (ف ۲۰۰۲) ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے لکھا ہے کہ: ''غالب پر سرور صاحب کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ دیکھیے:

آجکل، دہلی، مئی ۱۹۵۵ء

آجکل، دہلی، نظم نمبر، اپریل ۱۹۵۸

اعتمادیہ، دہلی، غالب نمبر، ۱۹۶۹

اردو ادب، علی گڑھ، غالب نمبر، ۱۹۶۹

(سرور شخصیت اور ادبی خدمات، ص:۸۱)

۷۔ شوقؔ بدایونی، شجاعت اللہ، غالب کی یاد میں، مشمولہ اشک پیہم، کراچی، ۱۹۷۶

۸۔ فگار، دلاور فگار (ف ۱۹۹۸ء) غالب کو برا کیوں کہو، ادب لطیف، لاہور، نومبر ۱۹۶۹ء

فگار، دلاور فگار (ف ۱۹۹۸ء) غالب کو برا کیوں کہو، کتابچہ، ڈیسینٹ پریس، کراچی، ۱۹۶۹ء

فگار، دلاور فگار (ف ۱۹۹۸ء) غالب کو برا کیوں کہو، مشمولہ، مطلع عرض ہے، کراچی، ۱۹۷۹ء

فگار، دلاور فگار (ف ۱۹۹۸ء) غالب کو برا کیوں کہو، مشمولہ، از سر نو، دلی، ۱۹۷۷ء

فگار، دلاور فگار (ف ۱۹۹۸ء) غالب کو برا کیوں کہو، مشمولہ، خدا جھوٹ نہ بلوائے، حیدرآباد، ۱۹۸۹ء

فگار، دلاور فگار (ف ۱۹۹۸ء) کراچی اور دیوان غالب، مشمولہ، خدا جھوٹ نہ بلوائے، حیدرآباد، ۱۹۸۹ء

فگار، دلاور فگار (ف ۱۹۹۸ء) مرزا غالب جیمخانہ کراچی میں،

مشمولہ، کلیات دلاور فگار، دہلی، ۲۰۰۳ء

فگار کی نظم ''غالب کو برا کیوں کہو'' غالب کی صد سالہ برسی ۱۹۶۹ء کے موقع پر شائع ہوئی اس وقت یہ ۱۴۸ اشعار پر مشتمل تھی۔ بعد میں مختلف مجموعوں میں مختلف تعداد اشعار اور مختلف متن نظر آتا ہے۔ آخری بار 'خدا جھوٹ نہ بلوائے (۱۹۸۹ء) میں یہ ۱۴۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم کی یہ خصوصیت ہے کہ شروع کے بیس پچیس اشعار میں غالب کی شخصیت وفن پر ایک ناقد کی زبانی سوالات قائم کیے گئے ہیں۔ بعد کے ۱۶ اشعار میں ان کے جواب دیے گئے ہیں۔ طنز وظرافت کے پیرائے میں غالب پر فگار کی یہ بھرپور تنقید ہے جو غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔

دوسری ''نظم کراچی اور دیوان غالب'' اول الذکر نظم سے زیادہ خوبصورت ہے مگر یہ زیادہ مشہور نہیں ہوسکی۔ اس نظم میں بھی اول غالب کے عقائد وکردار پر سوالات قائم کیے گئے ہیں اور پھر غالب کے اشعار کے مصرعوں یا اشعار کے مرکزی خیال یا ترکیبوں کو استعمال کرتے ہوئے جواب دیے گئے ہیں۔ اس نظم میں کل ۲۸ شعر ہیں۔ فگار کے مجموعہ کلام ''خدا جھوٹ نہ بلوائے'' ۱۹۸۹ء میں شامل ہے۔

۹۔ محشر بدایونی (ف ۱۹۹۴ء) روشن ان کا نام رہے گا (بچوں کے لیے)

ستارہ، کراچی، ۱۹۶۹ء

محشر بدایونی (ف ۱۹۹۴ء) روشن ان کا نام رہے گا، مشمولہ، شاعر نامہ، کراچی، ۱۹۶۹ء

محشر بدایونی (ف ۱۹۹۴ء) اے دبیر الملک، اعتمادیہ بیادگار غالب، دہلی ۶۹۔۱۹۶۸ء

۱۰۔ مختار سبزواری (ف ۱۹۸۴ء)، یوم غالب، مشمولہ، جبر مختار (دیوان)،

بریلی، ۱۹۸۷ء

بدایونی اہلِ قلم کی غالب پر کتب و مضامین کا اشاریہ

غالب اردو تحقیق و تنقید کا ایک مستقل موضوع بن چکے ہیں۔ ان پر تحقیق و تنقید کا سلسلہ جاری ہے۔ دنیا کی متعدد زبانوں میں ان پر کام کیا جاچکا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اردو میں نصف درجن ان پر کیے جانے والے کام کے اشاریے بھی مرتب کیے جاچکے ہیں۔ جن میں یہ تین قابلِ ذکر ہیں:

ا۔۔۔ اشاریہ غالب، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، لاہور، ۱۹۶۹ء

۲۔۔۔ غالبیات، عبدالقوی دسنوی، لکھنؤ، ۱۹۶۹ء

۳۔۔۔ غالب ببلیوگرافی، ڈاکٹر محمد انصاراللہ، طبع اول، علی گڑھ ۱۹۷۲ء

طبع دوم، دہلی ۱۹۹۸ء

غالب کے خطوط، غالب کے کلام، غالب کی ترکیبیں وغیرہ کے اشاریے بھی مرتب ہوچکے ہیں۔

بدایوں کے اربابِ علم و ادب نے بھی ۱۹۱۵ء سے تا حال غالب پر قلم فرسائی کی ہے۔ بعض تحریریں اعلیٰ درجے کی ہیں بعض اس سے کم تر۔ لیکن اشاریے میں شمولیت

کے لیے تمام ہی اہم ہیں۔ تاکہ ارباب بدایوں کی غالب فہمی اور اس کی قدر و قیمت آشکارا ہو سکے۔ سطور ذیل میں بدایوں میں کیے جانے والے کام کا اشاریہ دیا جا رہا ہے۔ اس اشاریے کو طوالت سے بچنے کے خیال سے مصنف وار پیش کیا جا رہا ہے۔ اس اشاریے کو تین عنوانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

۱۔ غالب تذکروں میں

۲۔ غالب کی تصانیف

۳۔ غالب پر تصانیف و مقالے

البتہ پروفیسر آل احمد سرور کی تحریروں کو کئی وضاحتی عنوانات میں تقسیم کر کے بسیط انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس استثنا اور متعین طریقہ پیشکش سے انحراف کا سبب صرف یہ ہے کہ غالب کی تفہیم میں سرور صاحب کی تحریروں کی مقبولیت ہنوز قائم ہے۔ اور ان کی تحریروں کو آج بھی مطالعہ غالب میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ تحریریں مقبولیت کو پس پشت چھوڑ کر عظمت کے دائرے میں آچکی ہیں تو شاید غلط نہ ہوگا۔

اس اشاریے میں ان کتب و مصنّفین کو بھی شامل کر لیا گیا ہے، جن کو گذشتہ اوراق میں مطالعہ کا موضوع بنایا جا چکا ہے۔ یہ محض اس لیے کیا گیا تا کہ قاری بیک نظر بدایوں میں کیے جانے والے کام سے واقف ہو جائے۔

اشاریے میں کسی بھی مضمون کی پہلی اشاعت کو اولیت دی ہے۔ اسی مضمون کا دوبارہ کسی رسالے میں شائع ہونا یا مصنف کے مجموعہ مضامین میں شامل ہونے کے حوالہ کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔ ایسی صورت میں اشاعت ثانی کا اندراج اشاعت اول کے اندراج کے بعد کر دیا گیا ہے، خواہ سنہ اشاعت میں فصل رہا ہو۔ اس طور مصنف کی ایک تحریر کی متعدد اشاعتوں سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ یہ علم بھی ہو جائے گا کہ غالب پر اس نے مجموعی طور پر کل کتنے مضامین لکھے۔ لیکن سرور صاحب کی تحریروں کو اس اصول سے بھی بوجوہ مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

اِنَّ اللہَ علیٰ کُلِّ شَیٍٔ قدیر

بعون ایزد شناسا و ادب آموزان کتاب

قادر نامہ

حسب فرمائش مرزا تجمل بیگ صاحب تاجر کتب بدایوں

مطبع صبح بدایوں میں طبع ہوا

عکس، قادر نامہ

اشاریے میں مصنّفین کے اصل نام کو الف بائی ترتیب کے تحت رکھا گیا ہے۔ ترتیب میں اول کتب کا اندراج ہے بعد میں مضامین کا۔ کتب میں پریس کے نام یا ناشر کے نام کے درج کرنے کا التزام کیا گیا ہے۔ مضامین کے مجموعوں کے آگے بریکٹ میں (مضامین کا مجموعہ) لکھ دیا گیا ہے۔ اسی طرح خاص نمبروں کا بھی بریکٹ میں اندراج کر دیا گیا ہے۔

۱۔۔۔غالب تذکروں میں

بدایوں میں لکھے جانے والے دو تذکروں میں غالب کا ترجمہ شامل ہے:

۱۔ شمیم سخن[۱]، ج ر ۱، عبدالحئی صفا بدایونی، مطبع امدادالہند، مرادآباد، ۱۸۷۲ء، ص: ۵۵ تا ۶۳ (غالب و اسد۔ حالات و ایک سو ساٹھ شعر)

۲۔ قاموس المشاہیر، ج ر ۲، نظامی بدایونی، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۶ء، ص ۱۰۹ (یہ اصطلاحی معنوں میں تو تذکرہ نہیں لیکن اس کی صورت تذکرے کی سی ہی ہے۔ اس میں غالب کے صرف حالات دیے گئے ہیں۔ کلام نہیں۔)

۲۔۔۔غالب کی تصانیف

۱۔ قادرنامہ، اسداللہ خاں غالب، مطبع صبح بدایوں، ۱۸۸۳ء

۲۔ مثنوی دعاے صباح، اسداللہ خاں غالب، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۵۰ء

۳۔ دیوان غالب، مرتبہ سید معین الدین شاہجہانپوری مع دیباچہ نظامی بدایونی، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۱۵ء، طبع اول، ص ۲۶۴، سائز ۸ / ۱۷×۲۷

۴۔ دیوان غالب، مرتبہ نظامی بدایونی مع دیباچہ و شرح، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۱۸ء، طبع دوم، ص: ۱۶۸، سائز: ۸ / ۲۶×۲۰

---

[۱] درگا پرشاد نادر دہلوی نے تذکرہ شعراے دکن میں غالب کو شاہ نصیر کا شاگرد لکھا ہے۔ صاحب شمیم سخن نے غالب کے ترجمے میں نادر کا بیان نقل کرتے ہوئے لکھا ہے۔ واللہ اعلم یہ قولِ نادر کہاں تک صحیح ہے۔ (ص: ۵۵)

۵۔ دیوان غالب، مرتبہ نظامی، مع دیباچہ وشرح۔ مقدمہ ڈاکٹر سید محمود غازیپوری، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۰ء، طبع سوم، ص: ۴۸ + ۲۵۲، سائز ۱۶/ ۲۰×۳۰

۶۔ دیوان غالب، مرتب نظامی مع دیباچہ وشرح۔ مقدمہ ڈاکٹر سید محمد غازیپوری، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۲ء، طبع چہارم، ص: ۳۳۳، سائز ۱۶/ ۲۰×۳۰

۷۔ دیوان غالب، مرتبہ نظامی، مع دیباچہ وشرح۔ مقدمہ ڈاکٹر سید محمد غازیپوری، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۳ء، طبع پنجم، ص: ۳۳۳، سائز ۱۶/ ۲۰×۳۰

۸۔ دیوان غالب، مرتبہ نظامی مع دیباچہ وخودنوشت سوانح غالب، فرہنگ، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۳ء، لائبریری ایڈیشن، ص: ۱۶۸، طبع پنجم غیر مشرح، سائز ۸/ ۲۲×۲۹

۹۔ دیوان غالب، مرتبہ نظامی، مع دیباچہ وشرح۔ مقدمہ ڈاکٹر سید محمود غازیپوری، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۷ء، طبع ششم، ص: ۷۶ + ۲۷۲، سائز ۱۶/ ۲۰×۳۰

۳۔ غالب اور متعلقات غالب پر تصانیف و مقالے

- ابراہیم خلیل سہسوانی، پروفیسر

۱۔ مرزا غالب اور علم نجوم، العلم (غالب نمبر)، کراچی، جنوری تا جون ۱۹۶۹ء

۲۔ غالب اور نظریہ ضرورت، مجلہ بدایوں، کراچی، فروری، ۱۹۹۶ء

- ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر

۱۔ نقش ہائے رنگ رنگ، ماہ نو، کراچی، نومبر، ۱۹۵۵ء

- اختر اقبال کمالی

۱۔ غالب کا شعری شعور، دلی کالج میگزین (دلی کا دبستان شاعری نمبر) دہلی، ۱۹۶۱ء

۲۔ کلام غالب میں تمثالِ شعری کا مقام، صحیفہ، (غالب نمبر)، لاہور، جنوری، ۱۹۶۹ء

۳۔ غالب کی شاعری میں طنز، فاران اسلامیہ کالج میگزین، لاہور، جولائی، ۱۹۶۹ء

۴۔ غالب در غالب اور مطالعہ غالب، پنجاب یونیورسٹی ریسرچ جرنل، لاہور۔

● اختر انصاری

ANECDOTES FROM LIFE OF GHALIB (مطائبات غالب، انگریزی میں) ادارہ شعروادب، علی گڑھ، ۱۹۷۲ء

● اخلاق اختر حمیدی، پروفیسر

۱۔ بارے غالب کا کچھ بیاں ہوجائے، ستارہ، کراچی، فروری، ۱۹۶۹ء

● ادارہ ذوالقرنین (بدایوں)

۱۔ غالب کی یادگار۔ایک مشورہ، ذوالقرنین (ہفتہ وار)، بدایوں، ۷ ستمبر، ۱۹۵۶ء

۲۔ غالب پر آج تک جو کچھ لکھا گیا، ذوالقرنین (ہفتہ وار)، بدایوں، ۲۱ رستمبر، ۱۹۶۵ء

۳۔ غالب کو گمنام خطوط کے ذریعے گالیاں بھیجی جاتی تھیں، ذوالقرنین (ہفتہ وار)، بدایوں، ۷ رمارچ، ۱۹۶۹ء

● اسعد بدایونی، ڈاکٹر

۱۔ شاگرد غالب سخاوت حسین مدہوش، کاروان رفتہ (مضامین کا مجموعہ) لیتھوکلر پرنٹرس، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء

۲۔ شاگرد غالب سخاوت حسین مدہوش، مجلّہ بدایوں، کراچی، فروری ۱۹۹۶ء

● افتخار بیگم صدیقی

بچوں کے غالب (زندگی اور شاعری کا تعارف مع تصاویر)، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۹۵ء

● انجمن آرا انجم، ڈاکٹر

۱۔ غالب کی ایک رباعی، فکروآگہی (مجموعہ مضامین)، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء

۲۔ غالب اور حدیث غم، فکروآگہی (مجموعہ مضامین)، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء

● آفتاب احمد جوہر

غالب، میگزین فضل الرحمٰن اسلامیہ کالج (غالب نمبر)، بریلی، ۷۰-۱۹۶۹ء

● آل احمد سرور، پروفیسر

(مرتبہ کتابیں)

— عرفان غالب (مارچ ۱۹۶۹ء کے غالب سمینار کے ۱۷ مضامین مع تعارف)

شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۷۳ء

— عکس غالب (غالب کے منتخب اردو خطوط مع پیش لفظ) شعبہ اردو مسلم

یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء

☆ (زیرادارت ونگرانی غالب نمبروں کی اشاعت)

— زیرنگرانی:

علی گڑھ میگزین (غالب نمبر۔ مدیر ڈاکٹر بشیر بدر)، علی گڑھ، جنوری ۱۹۶۹ء

— زیرادارت:

فکرونظر (غالب نمبر)، علی گڑھ، شمارہ/ ۲، ۱۹۶۹ء

اردوادب (غالب نمبر)، علی گڑھ، شمارہ/ ۱، ۱۹۶۹ء

☆ (مضامین اپنی کتابوں میں)

— خطوط میں شخصیت (غالب)، تنقیدی اشارے، لکھنؤ، ۱۹۴۲ء

— غالب، نئے اور پرانے چراغ، آگرہ اخبار برقی پریس، آگرہ، ۱۹۴۶ء

— غالب کا ذہنی ارتقا، ادب اور نظریہ، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۴ء

اردوغزل، میر سے غالب تک، ادب اور نظریہ، سرفراز قومی پریس، لکھنو، ۱۹۵۴ء

پورے غالب، عرفان غالب، شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء

غالب اور جدید ذہن، مسرت سے بصیرت تک، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۷۴ء

غالب کی شاعری کی معنویت، مسرت سے بصیرت تک، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۷۴ء

غالب کی عظمت، مسرت سے بصیرت تک، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۷۴ء

پورے غالب، مسرت سے بصیرت تک، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۷۴ء

غالب کا نظریہ شاعری، پہچان اور پرکھ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۹۰ء

☆ (غالب کی شاعری کی خصوصیات)

حالی اور نقد غالب، کچھ خطبے کچھ مقالے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶ء

ہندوستانی نشاۃ الثانیہ اور غالب، کچھ خطبے کچھ مقالے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶ء

غالب کی اردو شاعری کے انگریزی تراجم، کچھ خطبے کچھ مقالے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۶ء

کتابیں جو زندہ ہیں (دیوان غالب)، اداریے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۹ء

غالب اردو اور ہندوستان، افکار کے دیے، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۰ء

☆ (مقدمہ، پیش لفظ، تعارف وغیرہ)

مقدمہ، نقد غالب، ڈاکٹر مختار الدین احمد، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۶ء

مقدمہ، نقد غالب، ڈاکٹر مختار الدین احمد، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، بار دوم

تقریب، دیوان غالب (نسخہ عرشی)، امتیاز علی خاں عرشی، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۸ء

تقریب، دیوان غالب (نسخہ عرشی)، امتیاز علی خاں عرشی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۹۵ء بار دوم

تعارف، خطوط غالب، مالک رام (اصل مولوی مہیش پرشاد)، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۶۳ء

تعارف، دیوان غالب بخط غالب، اکبر علی خاں، ادارہ یادگار غالب، رامپور، ۱۹۶۹ء

پیش لفظ، غالب ببلیوگرافی، ڈاکٹر محمد انصار اللہ، شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۷۲ء

پیش لفظ، عکس غالب، آل احمد سرور، شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء

تعارف، عرفان غالب، آل احمد سرور، شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء

اداریہ، فکر و نظر، (غالب نمبر) جلد ۹۱، شمارۂ ۲، علی گڑھ ۱۹۶۹ء

☆ (مضامین رسائل میں)

— غالب، اردو، اورنگ آباد، اپریل، ۱۹۴۱ء

— غالب عہد اور شاعری، اردو، اورنگ آباد، اپریل، ۱۹۴۱ء

— جدید غزل گو: غالب، نگار، لکھنؤ، اپریل ۱۹۴۱ء

— غالب کی عظمت، علی گڑھ میگزین (غالب نمبر)، علی گڑھ، ۴۹-۱۹۴۸ء

— غالب اور اس کے نقاد (عرشی، مہر، اکرام)، جامعہ، دہلی، دسمبر ۱۹۵۰ء

— غالب کا ذہنی ارتقا، اردو ادب، علی گڑھ، جولائی تا دسمبر ۱۹۵۲ء

— غالب کا ذہنی ارتقا، روحِ ادب، کراچی، شمارہ ۱۹، ۱۹۵۳ء

— اردو غزل اور متغزلین غالب، نقوش، لاہور، مئی ۱۹۵۴ء

— غالب اپنی شخصیت کے آئینے میں، ادب لطیف، لاہور، جولائی، ۱۹۵۵ء

— غالب کی یاد میں، ہماری زبان، علی گڑھ، ۱۵ر فروری ۱۹۵۹ء

— دیوان غالب، فروغ اردو، لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۶۱ء

— کتابیں جو زندہ ہیں (دیوان غالب)، ہماری زبان، علی گڑھ، ۸ر نومبر ۱۹۶۱ء

— دیوان غالب، ادیب، علی گڑھ، اگست، ۱۹۶۲ء

— غالب کی زندگی اور شاعری پر ایک فیچر، فروغ اردو، لکھنؤ، ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۵ء

— غالب کی عظمت، افکار، کراچی، فروری و مارچ ۱۹۶۶ء

— غالب کا ذہنی ارتقا، انجام، کراچی، ۲۸ر فروری ۱۹۶۶ء

— غالب کی شخصیت، الشجاع، کراچی، مارچ، ۱۹۶۶ء

— غالب کی شخصیت، جائزہ، کراچی، جون، ۱۹۶۶ء

— دیوان غالب، کتابی دنیا، کراچی، نومبر ۱۹۶۶ء

— غالب کی عظمت، فروغ اردو (غالب نمبر)، لکھنؤ، نومبر دسمبر ۱۹۶۸ء

— غالب اور جدید ذہن، علی گڑھ میگزین (غالب نمبر)، علی گڑھ، جنوری ۱۹۶۹ء

— پورے غالب، فکر ونظر (غالب نمبر)، علی گڑھ، ۱۹۶۹ء

— غالب کی عظمت، اردو ادب، (غالب نمبر)، دہلی، شمارہ/۱، ۱۹۶۹ء

— غالب کی شخصیت، الشجاع (غالب نمبر)، کراچی، ۱۹۶۹ء

— غالب کا ذہنی ارتقا، نگار، کراچی، جنوری، فروری ۱۹۶۹ء

— غالب اپنی شخصیت کے آئینہ میں، انجمن اسلامیہ میگزین، کراچی، فروری ۱۹۶۹ء

— دہلی میں غالب صدی تقریبات، ہماری زبان، علی گڑھ، ۲۲/فروری ۱۹۶۹ء

— دہلی میں غالب صدی تقریبات، ہماری زبان، علی گڑھ، ۸/مارچ ۱۹۶۹ء

— دہلی میں غالب صدی تقریبات، ہماری زبان، علی گڑھ، ۱۵/مارچ ۱۹۶۹ء

— غالب اردو اور ہندوستانی، ہماری زبان، علی گڑھ، ۱۵/مارچ ۱۹۶۹ء

— خطوط غالب، ادیب، علی گڑھ، اپریل ۱۹۸۱ء

— غالب کی ایک غزل، آواز، دہلی، ۱۶ دسمبر، ۱۹۸۲ء

— غالب کی ایک غزل کا تجزیہ، ادیب، علی گڑھ، جنوری مارچ ۱۹۸۳ء

— غالب کی اردو شاعری کے انگریزی تراجم، غالب نامہ، دہلی جنوری ۱۹۹۰ء

— ہندوستانی نشاۃ الثانیہ اور غالب، غالب نامہ، دہلی، جنوری، ۱۹۹۱ء

— ظرافت اور غالب، جوہر (عبدالحق نمبر)، دہلی

☆ (غالب کے نقادوں پر مضامین)

— غالب کے نقاد۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف، ہماری زبان، علی گڑھ، ۸/نومبر ۱۹۷۱ء

— غالب شناس۔ شیخ محمد اکرام، ہماری زبان، علی گڑھ، ۲۲ مارچ ۱۹۷۳ء

— حالی اور نقد غالب، غالب نامہ، دہلی، جولائی، ۱۹۸۸ء

☆ (کلام و اشعار کا انتخاب)

— نسخہ حمیدیہ کا انتخاب (بغیر تمہید)، فکر و نظر، غالب نمبر، علی گڑھ، شمارہ ۲، ۱۹۶۹ء

— غالب کے تیس بہترین اشعار، ہماری زبان، علی گڑھ، ۱۵ر فروری ۱۹۶۹ء

☆ (تعارف و تبصرہ نما تنقیدیں)

— نادراتِ غالب (آفاق دہلوی)، اردو ادب، علی گڑھ، جولائی ۱۹۵۰ء

— علی گڑھ میگزین غالب نمبر (مرتبہ مختار الدین احمد)، اردو ادب، علی گڑھ، جولائی ۱۹۵۰ء

— شرحِ دیوان غالب (جوش ملسیانی)، اردو ادب، علی گڑھ، جولائی، ۱۹۵۰ء

— غالب کا نودریافت دیوان (نسخہ عرشی زادہ) ہماری زبان، علی گڑھ، ۲۲ر اگست ۱۹۶۹ء

— نسخہ عرشی زادہ، قومی زبان، کراچی، دسمبر ۱۹۶۹ء

— عیارِ غالب (مالک رام)، ہماری زبان، علی گڑھ ۸۔۱۵ر جون ۱۹۷۰

☆ (دوسرے ادیبوں کی مرتبہ کتابوں میں مضامین)

— غالب کی عظمت، نقد غالب، ڈاکٹر مختار الدین احمد، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۶ء

— غالب اپنی شخصیت کے آئینے میں، تنقیدی ادب، سردار مسیح گل، نذر سنز، لاہور، ۱۹۵۹ء

— غالب کی عظمت، اردو کے کلاسیکی شعرا، ج ر ۲، ایم حبیب خاں، سود لیتھو پریس، دہلی، ۱۹۶۲ء

— تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا (فکاہیہ)، چھیڑ غالب سے چل جائے، اکبر علی خاں عرشی زادہ، کتاب کار، رامپور، ۱۹۶۵ء

— خطوط میں شخصیت: غالب، جدید اردو نثر، ۱۹۶۶ء

—غالب اپنی شخصیت کے آئینہ میں، غالب کچھ جائزے، وقار رومانی واوصاف احمد،
شعبہ اردو و فارسی لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ، ۱۹۶۶ء
—غالب اپنی شخصیت کے آئینہ میں، اردو نظم پر تنقیدی نظر، لاہور، ۱۹۶۶ء
—غالب کی عظمت، احوال ونقد غالب، محمد حیات خاں سیّال، نذر سنز، لاہور ۱۹۶۷ء
—غالب کا ذہنی ارتقاء، احوال ونقد غالب، محمد حیات خاں سیّال، نذر سنز،
لاہور، ۱۹۶۷ء
—غالب کی عظمت، تنقید غالب کے سو سال، فیاض محمود، مجلس یادگار غالب،
لاہور ۱۹۶۹ء
—غالب اور جدید ذہن، بین الاقوامی غالب سمینار، ڈاکٹر یوسف حسین خاں،
صد سالہ یادگار غالب کمیٹی، دہلی، ۱۹۶۹ء
—غالب، غالب نام آور، ادارۂ اردو کراچی، انجمن ترقی اردو (پاکستان)،
کراچی ۱۹۶۹ء
—غالب (روسی زبان میں کسی مضمون کا ترجمہ)، مرزا غالب، غفور روف،
شعبہ مشرقی سائنس، روس، ۱۹۷۲ء
—غالب کی عظمت، غالب سے اقبال تک، ایم حبیب خاں، انجمن ترقی اردو، ہند،
دہلی، ۱۹۷۷ء
—غالب کا نظریۂ شاعری، مجموعہ تنقیدات، عاصمہ وقار، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
—غالب کی شاعری کی خصوصیات، مجموعہ تنقیدات، عاصمہ وقار، الوقار پبلی کیشنز،
لاہور، ۱۹۹۶ء
—غالب اور جدید ذہن مجموعہ تنقیدات، عاصمہ وقار، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
—غالب کی شاعری کی معنویت، مجموعہ تنقیدات، عاصمہ وقار، الوقار پبلی کیشنز،
لاہور، ۱۹۹۶ء

— غالب کی عظمت، مجموعہ تنقیدات، عاصمہ وقار، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
— پورے غالب، مجموعہ تنقیدات، عاصمہ وقار، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
— حالی اور نقد غالب تنقیدات، پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۹۷ء

● امیر حسنین جلیسی

— اردو شاعری میں غالب کا مقام، بت خانہ شکستم من (مجموعۂ مضامین)، ادبی معیار پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۳ء

● حنیف نقوی، پروفیسر

— غالب، احوال و آثار، (مجموعہ مضامین مع پیش لفظ مالک رام) بار اول، نصرت پبلشر، لکھنؤ، ۱۹۹۰۔ بار دوم غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی ۲۰۰۷ء
— ماثر غالب (قاضی عبدالودود)، ترتیب جدید اور تصحیح و تحشیہ، بار دوم، ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ، ۱۹۹۵ء
— ماثر غالب (نظر ثانی شدہ ایڈیشن)، ادارۂ یادگار غالب، کراچی ۲۰۰۰ء
— پنج آہنگ، قدیم ترین نسخہ (عکسی ایڈیشن)، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۷ء
— غالب کی چند فارسی تصانیف، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۲۰۰۵ء
— غالب کی فارسی مکتوب نگاری (نظام یادگاری خطبہ)، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۲۰۰۸ء
— خطوط غالب کی نفسیات، شاعر، بمبئی، فروری ۱۹۵۶ء
— غالب: خطوط کے آئینہ میں، معیار، میرٹھ، مارچ ۱۹۵۶ء
— غالب کے ایک باکمال شاگرد ولایت علی خاں ولایت، آجکل، دہلی، اپریل ۱۹۶۳ء
— منشی نولکشور اور غالب، نیا دور (نولکشور نمبر)، لکھنؤ، نومبر، دسمبر ۱۹۸۰ء)
— منشی نولکشور اور غالب، غالب احوال و آثار، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء

— غالب سے منسوب ایک شعر، آجکل، دہلی، دسمبر، ۱۹۸۰ء

— غالب سے منسوب ایک شعر، غالب احوال و آثار، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء

— غالب کا سفر کلکتہ، غالب نامہ، دہلی، جنوری ۱۹۸۱ء

— غالب کا سفر کلکتہ، غالب احوال و آثار، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء

— غالب کا سفر کلکتہ، تحقیقات (مرتبہ پروفیسر نذیر احمد)، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۹۷ء

— غالب کی ایک غزل اور مرزا یوسف، آجکل، دہلی، جولائی ۱۹۸۲ء

— غالب کی ایک غزل اور مرزا یوسف، غالب احوال و آثار، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء

— تلامذہ غالب پر ایک نظر، اکادمی، لکھنؤ، جنوری فروری ۱۹۸۳ء

— تلامذہ غالب پر ایک نظر، غالب احوال و آثار، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء

— غالب کا سال ولادت، غالب نامہ، دہلی، جنوری ۱۹۸۵ء

— غالب کا سال ولادت، غالب احوال و آثار، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء

— غالب کا ایک شعر، ہماری زبان، دہلی، ۲۲ر ستمبر، ۱۹۸۵ء

— تلامذہ غالب (طبع ثانی) پر ایک نظر، اکادمی، لکھنؤ، جولائی، اگست، ۱۹۸۶ء

— تلامذہ غالب (طبع ثانی) پر ایک نظر، غالب احوال و آثار، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء

— غالب کے خطوط (جلد اول)، ایک جائزہ، اکادمی، لکھنؤ، ستمبر اکتوبر ۱۹۸۶ء

— غالب کے خطوط (جلد اول) دوسری قسط، اکادمی، لکھنؤ، نومبر، دسمبر ۱۹۸۶ء

— غالب کے خطوط (جلد اول)، تیسری قسط، اکادمی، لکھنؤ، جنوری، فروری ۱۹۸۶ء

— غالب اور عیوب قوافی، ہماری زبان، دہلی، ۲۲ر مارچ، ۱۹۹۰

— غالب کے عہد میں ڈاک کا نظام، غالب نامہ، دہلی، جنوری، ۱۹۹۱ء

— غالب کی چھٹی فارسی مثنوی، ایوان اردو، دہلی، اپریل، ۱۹۹۱ء

— غالب کے چار غیر مطبوعہ خطوط، آجکل، دہلی، اگست ۱۹۹۳ء

— غالب کے چار غیر مطبوعہ خطوط، غالب، کراچی، شمارہ ۱۱ تا ۱۸،، ۱۹۹۵ء

— پنج آہنگ ترتیب سے اشاعت تک، غالب نامہ، دہلی، جولائی ۱۹۹۴ء

— مے خانہ آرزو سرانجام، یادگار نامہ فخر الدین علی احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۹۴ء

— غالب اور علامہ فضل حق خیر آبادی، غالب نامہ، دہلی، جولائی، ۱۹۹۶ء

— پنج آہنگ کا قدیم ترین قلمی نسخہ، تحقیقی تصورات (مجموعہ مقالات) شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۹۶ء

— متفرقات غالب، غالب نامہ، دہلی، جنوری ۱۹۹۷ء

— باغ دودر: دریافت سے تدوین تک، غالب نامہ، دہلی، جولائی ۱۹۹۹ء

— غالب کے فارسی خطوط، نیا دور، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۹۹ء

— مثنوی چراغ دیر کے دو ترجمے، ہماری زبان (قسط اول)، دہلی، دسمبر ۱۹۹۹ء

— مثنوی چراغ دیر کے دو ترجمے، ہماری زبان (قسط دوم)، دسمبر ۱۹۹۹ء

— دستنبو۔ غالب کا روزنامچہ غدر، اردو ادب، دہلی، ۲۰۰۰ء

— غالب اور معارضہ کلکتہ، غالب، کراچی، شمارہ ۱۹، ۲۰۰۰ء

— غالب اور معارضہ کلکتہ، نیا دور، لکھنؤ، جون ۲۰۰۳ء

— پروفیسر عبدالقوی دسنوی بحیثیت غالب شناس، عبدالقوی دسنوی۔ ایک مطالعہ (مجموعہ مقالات)، دبستانِ بھوپال، بھوپال، ۲۰۰۱ء

— غالب کا ایک فارسی خط اور ان کا سفر رامپور، غالب نامہ، دہلی، جولائی ۲۰۰۳ء

— تلامذہ غالب کا ایک بازدید، فکر و تحقیق، دہلی، اکتوبر دسمبر ۲۰۰۵ء

— غالب کا ایک متنازعہ فیہ خط، فکر و تحقیق، دہلی، اپریل تا جون ۲۰۰۶ء

— قصہ چراغ دیر کے دو ترجموں کا، ہماری زبان، دہلی، ۲۲ رجنوری ۲۰۰۷ء

— غالب سے منسوب تین جعلی تحریریں، فکر و تحقیق، دہلی، جنوری تا مارچ ۲۰۰۷ء

— غالب کی مہریں، غالب نامہ، دہلی، جنوری ۲۰۰۷ء

— غالب کی مہریں، ششماہی مخزن، لاہور، شمارہ نمبر ۱۵، ۲۰۰۸ء
— عہد غالب کی دو ممتاز شخصیتیں، فکر و تحقیق، دہلی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء
— غالب کا ایک نو دریافت فارسی خط، آج کل، دہلی، فروری ۲۰۰۸ء
— مرزا خداداد بیگ، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، جولائی ۲۰۰۸ء
— بنارس کی دوستی، آجکل، دہلی، مارچ ۲۰۰۹ء
— مرزا عاشور بیگ، آجکل، دہلی، ستمبر ۲۰۰۹ء
— حکیم سید احمد حسن مودودی، چھماہی، جہانِ غالب، دہلی، دسمبر ۲۰۰۹ء تا مئی ۲۰۱۰
— مثنوی چراغ دیر (منظوم اردو ترجمہ)، آجکل، دہلی، جولائی ۱۹۹۱ء

☆ غیر مطبوعہ مقالے

— غالب کو برا کیوں کہو، مقالہ دلاور فگار سمینار، بدایوں، منعقدہ، ۶/ مارچ ۱۹۹۹ء
— تفہیم غالب کی دشواریاں، فارسی خطوط کے حوالے سے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی کے سمینار منعقدہ دسمبر ۲۰۰۵ء، میں پڑھا گیا۔
— غالب اور ۱۸۵۷ء کے متغزلین، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی کے سمینار منعقدہ نومبر ۲۰۰۷ء میں پڑھا گیا۔

● زلیخا خانم

— مرزا غالب، ہماری زبان، علی گڑھ، یکم اپریل، ۱۹۴۷ء

● سعید زبیری سہسوانی

— غلچی (ردِ غالب میں)، ڈیسینٹ پریس، کراچی، ۱۹۸۲ء

● شاداب ذکی

— انتخابِ کلام زکی (زکریا خاں زکی)، بریلی الیکٹرک پریس، بریلی، ۱۹۸۵ء

● شمس بدایونی، ڈاکٹر

— غالب بدایوں میں، دید و دریافت (مجموعہ مضامین)، اعلیٰ پریس، دہلی، ۱۹۸۱ء

—غالب کے سہسوانی شاگرد، قومی زبان، کراچی، جنوری ۱۹۸۳ء
—غالب کے سہوانی شاگرد، حقائق و بصائر (مجموعہ مضامین)، بریلی الیکٹرک پریس، بریلی، ۱۹۸۶ء
—خمسہ برغزل غالب، ہماری زبان، دہلی، یکم نومبر ۱۹۸۳ء
—خمسہ برغزل غالب، حقائق و بصائر، بریلی، ۱۹۸۶ء
—دیوان غالب (بدایونی ایڈیشن)، نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات، نامی پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۹۵ء
—نکات غالب (نظامی بدایونی)، نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات، نامی پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۹۵ء
—غالب اور غالبیات، نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات، نامی پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۹۵ء
—بجنوری بحیثیت ناقد غالب، غالب نامہ، دہلی، جولائی ۱۹۹۶
—بجنوری بحیثیت ناقد غالب (بصورت کتابچہ)، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد ۱۹۹۷ء
—بجنوری بحیثیت ناقد غالب، نقد و اثر (مجموعہ مضامین)، دہلی ۲۰۰۴ء
—مجنوں گورکھپوری اور نقد غالب، غالب نامہ، دہلی جنوری ۱۹۹۸ء
—مجنوں گورکھپوری اور نقد غالب، نقد و اثر، دہلی، ۲۰۰۴ء
—عہد غالب: تحریک احیائے دین کے پس منظر میں، غالب نامہ، دہلی، جولائی ۱۹۹۸ء
—عہد غالب: تحریک احیائے دین کے پس منظر میں، مجلّہ بدایوں، کراچی، دسمبر ۱۹۹۹ء
—عہد غالب: تحریک احیائے دین کے پس منظر میں، نقد و اثر، دہلی ۲۰۰۴ء
—غالب کے ایک مکتوب الیہ حکیم ظہیر الدین دہلوی، نیا دور، لکھنؤ، اکتوبر ۲۰۰۳ء
—غالب پر پروفیسر آل احمد سرور کی تحریروں کا اشاریہ، اردو بک ریویو، دہلی، نومبر دسمبر ۲۰۰۳ء

— غالب کے ایک مکتوب الیہ حکیم غلام نجف خاں، آجکل، دہلی، فروری ۲۰۰۴ء

— غالب پر تین فراموش شدہ تحریریں، فکر و تحقیق، دہلی، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۴ء

— نثار احمد فاروقی کی غالب شناسی، کتاب نما، دہلی، دسمبر ۲۰۰۴ء

— غالب اور آل احمد سرور، آجکل، دہلی، فروری ۲۰۰۵ء

— مکاتیب غالب میں افراد بدایوں کے اسما، ہماری زبان، دہلی،
۲۲ تا ۲۸ فروری ۲۰۰۵ء

— مزار غالب، فکر و تحقیق، دہلی جولائی تا ستمبر ۲۰۰۵ء

— تفہیم غالب کے مدارج، جہان غالب، دہلی ج/۱، ش/۱، ۲۰۰۵ء

— کچھ بیاض رشکی کے حوالے سے، ہماری زبان، دہلی ۸، تا ۱۴/اگست ۲۰۰۵ء

— دیوان غالب نسخہ بدایوں، کتاب نما، دہلی، مارچ ۲۰۰۶ء

● صبیح احمد کمالی

— آرٹ غالب کی نظر میں، نگار، لکھنؤ، جون ۱۹۴۹ء

● ضمیر بدایونی، ضمیر الحسن

— غالب کا فن اور سماجی شعور (تنقید)، بدایوں اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۱ء

— غالب کے بدایونی تلامذہ، مجلہ بدایوں، کراچی، اپریل، ۱۹۹۴ء

● ضیاء احمد، پروفیسر

— غالب کے کلام پر ناقدانہ نظر، علی گڑھ میگزین، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۳۲ء

— غالب کے کلام پر ناقدانہ نظر، مباحث و مسائل (مجموعہ مضامین)، دہلی، ۱۹۶۸ء

— مشکلات غالب (نیاز کی کتاب پر تبصرہ)، کتابی دنیا، کراچی، فروری ۱۹۶۳ء

— غالب کا نعتیہ کلام، عیار غالب (مالک رام) علمی مجلس، دہلی، ۱۹۶۹ء

— محاورات غالب، آجکل، دہلی، فروری ۱۹۶۹ء

— فارسی غزل اور غالب، اردوے معلیٰ (غالب نمبر)، دہلی، فروری ۱۹۶۹ء

— امام بخش صہبائی معاصر غالب، اردوئے معلیٰ (غالب نمبر)، دہلی، فروری ۱۹۶۹ء
— دیوان غالب بخط غالب، اردوئے معلیٰ (غالب نمبر)، دہلی، فروری ۱۹۶۹ء
— غالب کی ایک غزل کا تجزیہ، میگزین فضل الرحمٰن اسلامیہ کالج (غالب نمبر)، بریلی، ۷۰۔۱۹۶۹ء

- ضیاءِ عباس بدایونی

— مرزا غالب کی ایک غزل (حسن غمزے کی کشاکش الخ)، العصر، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۰ء

- ظفر انوار حمیدی

— مطالعہ غالب، مجلّہ بدایوں، کراچی، فروری ۱۹۹۶ء

- ظفر احمد صدیقی، پروفیسر

— غالب کی معنویت کے چند پہلو، غالب نامہ، دہلی، جولائی ۱۹۸۷ء

- ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر

— نقش ہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی مثنویات، غزلیات کا انتخاب مع ترجمہ)، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی، ۱۹۷۰
— مومن و غالب، دلی کالج میگزین (دلی کا دبستانِ شاعری نمبر)، دہلی، ۱۹۶۱ء
— غالب اور نفسیاتی کشمکش، نوائے ادب، بمبئی، اپریل ۱۹۶۳ء
— غالب اور نفسیاتی کشمکش، فکری زاویے (مجموعہِ مضامین)، دہلی، ۱۹۷۲ء
— غالب اور فانی، آجکل، دہلی، فروری ۱۹۶۸ء
— غالب کی فارسی شاعری، فروغ اردو (غالب نمبر) لکھنؤ، نومبر، دسمبر ۱۹۶۸ء
— غالب اور فانی کی فکر کا موازنہ، امروز، لاہور، ۱۶؍فروری ۱۹۶۹ء
— غالب کی مابعد الطبیعاتی شاعری (ہندی سے ترجمہ)، اردوے معلیٰ (غالب نمبر) دہلی، فروری ۱۹۶۹ء

— مثنوی سرمۂ بینش، فروغِ اردو (غالب نمبر) لکھنؤ، ۱۹۶۹ء
— غالب کا محبوب فارسی غزل کے آئینے میں، میگزین فضل الرحمٰن اسلامیہ کالج (غالب نمبر)، بریلی ۷۰-۱۹۶۹ء
— مثنوی چراغِ دیر، میگزین فضل الرحمٰن اسلامیہ کالج (غالب نمبر)، بریلی، ۷۰-۱۹۶۹ء
— میر، غالب اور فانی، مشمولہ فانی کی شاعری، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۶۸ء

- عبداللہ ولی بخش قادری

— غالب کا کلام۔نفسیاتی زاویہ، جامعہ، دہلی، فروری مارچ ۱۹۶۹ء

- غلام امیر (نقاد) قاضی، بدایونی

— بہترین غزل گو، الناظر لکھنؤ، اکتوبر نومبر ۱۹۲۶ء
— بہترین غزل گو (کتابی صورت میں)، الناظر پریس لکھنؤ، باردوم، ۱۹۴۱ء

- غلام سجاد بسمل قاضی

— تعبیرات غالب، علی گڑھ میگزین، علی گڑھ، دسمبر ۱۹۳۹ء

- فرخ جلالی

— کچھ غالب کے بارے میں، آجکل (غالب نمبر)، دہلی، فروری ۱۹۵۹ء
— مدہوش بدایونی کے نام غالب کا ایک غیر معروف خط، آجکل، دہلی، فروری ۱۹۶۰ء
— کچھ غالب کے بارے میں، آجکل، دہلی، فروری، ۱۹۶۱ء
— سرسید اور غالب، علی گڑھ میگزین (غالب نمبر)، علی گڑھ، ۱۹۶۹ء
— تقدیم، مشمولہ دیوان غالب، عکسی ایڈیشن، خدابخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۶ء
— غالب کے ایک دوست اساس الدین دہلوی، بدایونی، ہماری زبان، دہلی۔ یکم تا ۷ جولائی ۲۰۰۵ء

- فرید احمد بدایونی

— فانی اور غالب (تنقیدی کتاب)، کراچی، ۱۹۸۰

- مبشر علی صدیقی

— دیوان غالب کے نظامی ایڈیشن، جامعہ، دہلی، جون ۱۹۷۴ء

— دیوان غالب کے نظامی ایڈیشن، اقلیم ادب کے تاجدار، اعلی پریس، دہلی 1981

— غالب اور اردو خطوط نویسی، جامعہ، دہلی، فروری ۱۹۷۵ء

— غالب اور اردو خطوط نویسی، نگارشات نو، لاہور پریس، دہلی، ۱۹۷۶ء

— غالب اور اردو خطوط نویسی، اقلیم ادب کے تاجدار، اعلی پریس، دہلی، ۱۹۸۱

— ڈاکٹر سید محمود کا مقدمہ دیوان غالب، معارف، اعظم گڑھ، مارچ ۱۹۷۵ء

- مجیب ظفر انوار حمیدی بدایونی

— مطالعہ غالب، مجلّہ بدایوں، کراچی، فروری ۱۹۹۶ء

- محمود الحسن بدایونی

— غالب کا گھر اور برسات کا موسم، مومن، بدایوں، جولائی ۱۹۶۹ء

- معجز سہوانی، اعجاز احمد، مولوی

— مومن و غالب (تنقید)، نظامی پریس، فیض آباد، بار اول، ۱۹۳۱ء

— مومن و غالب، سرفراز پریس، لکھنؤ، بار دوم، ۱۹۳۳ء

— مومن و غالب، سرفراز پریس، لکھنؤ، بار سوم، ۱۹۶۹ء

- نامعلوم: (غالباً احیدالدین نظامی بدایونی)

— دو ادیبوں کی علمی چھیڑ چھاڑ اور ان کا مقدمہ (غالب اور امین الدین)،
ہفتہ وار، ذوالقرنین، بدایوں، ۲۱ر اگست ۱۹۴۳ء

— غالب اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر تھے، ہفتہ وار، ذوالقرنین،
بدایوں، ۲۸ر فروری، ۱۹۵۴ء

— غالب کی کہانی خود ان کی زبانی، ہفتہ وار، ذوالقرنین، بدایوں ۱۴ر نومبر ۱۹۶۸ء
— غالب کے کلام میں طنز وظرافت، ہفتہ وار، ذوالقرنین، بدایوں، ۲۱ر مئی ۱۹۶۹ء
— غالب نما، ہفتہ وار، ذوالقرنین، بدایوں، ۲۸ر مئی ۱۹۶۹ء

● نصیر احمد صدیقی، ڈاکٹر

— غالب کا محبوب، میگزین اسلامیہ کالج (غالب نمبر)، بریلی، ۱۹۷۰ء

● نظامی بدایونی، نظام الدین حسین

— دیوان غالب، چھ ایڈیشن، نظامی پریس بدایوں (دیکھیے غالب کی تصانیف)
— نکات غالب، تین اڈیشن، نظامی پریس، بدایوں، ، دیکھیے غالب اور غالبیات
— غالب کا ایک خط، دیکھیے غالب اور غالبیات، ماہنامہ فصیح الملک، مارہرہ، فروری ۱۹۰۸ء
— مرزا غالب کے مزار کی مرمت (نوٹ) ہفتہ وار، ذوالقرنین، بدایوں،
۷ر اگست ۱۹۱۶ء
— ایڈیٹوریل نوٹس (مزار غالب کی مرمت کے بارے میں)، ہفتہ وار،
ذوالقرنین، بدایوں، ۱۴ر ستمبر، ۱۹۱۶
— مرزا غالب سے للٰہی بغض (اودھ کی بیجا تنقید)، ذوالقرنین، بدایوں، ۷ر اکتوبر ۱۹۲۸ء
— غالب کے عیب جو اور مداح، ذوالقرنین، بدایوں ۲۱ر اگست، ۱۹۲۹ء
— مرزا غالب کے مزار کی تعمیر، ذوالقرنین، بدایوں، ۲۸ر اپریل ۱۹۳۲ء
— روحِ کلام غالب (تبصرہ)، زمانہ، کانپور، مئی ۱۹۳۵ء
— مقدمہ، کلیات شیفتہ، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۱۶
— مقدمہ، روح کلام غالب، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۵

● نیر کمالی

— بچوں کے غالب پر ایک نظر، مجلّہ بدایوں، کراچی، دسمبر ۱۹۹۶ء

- وحید احمد مسعود، شیخ

— غالب خستہ حال، العلم (غالب نمبر)، کراچی، جنوری تا جون ۱۹۶۹ء

- ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

— منشی بالمکند بے صبرؔ، (تلمیذ غالب)، ہماری زبان، دہلی، ۸؍دسمبر ۱۹۶۰ء

— دیوان جانی بہاری لال راضیؔ (تلمیذ غالب)، ہماری زبان، دہلی، ۲۲؍ستمبر ۱۹۶۱ء

— دیوان جانی بہاری لال راضی، فیضان غالب (مرتبہ عرش ملسیانی)، غالب اکیڈمی، دہلی، ۱۹۷۷ء

— غالب کے ایک شاگرد سرورؔ مارہروی، رفتارِ زمانہ، حیدر آباد، مارچ ۱۹۶۴ء

— بابو ہرگوبند سہائے نشاط (تلمیذ غالب)، ہماری زبان، دہلی، ۸؍اگست ۱۹۶۶ء

— سید فرزند احمد صفیر بلگرامی (تلمیذ غالب)، ہماری زبان، دہلی ۲۲؍مارچ ۱۹۶۷ء

— مرزا غالب کی ایک اردو تقریظ، ہماری زبان، دہلی، ۲۲؍اپریل ۱۹۶۷ء

— مرزا غالب کی وفات پر تین ہندو اساتذہ سخن کے قطعات تاریخ وفات، ہماری زبان، دہلی، یکم جون، ۱۹۶۷ء

— غالب کے ہندو تلامذہ، شیرازہ، سری نگر، جنوری، ۱۹۶۸ء

— مرزا غالب کی اصلاحیں حبیب الدین سوزاںؔ کے کلام پر، ہماری زبان، دہلی، یکم دسمبر، ۱۹۶۸ء

— غالب کے ایک بدایونی شاگرد۔ عزیز الدین، عزیز و صادق، ہماری زبان، دہلی، ۲۲ جنوری ۱۹۶۹ء

— غالب کے ایک شاگرد: عزیز صادق، مجلّہ بدایوں، کراچی، فروری ۱۹۹۶ء

— غالب کے ایک شاگرد: عزیز و صادق، غالب نامہ، دہلی، جنوری ۱۹۹۸ء

— مولانا عزیز الدین عزیز بدایونی، (مشمولہ) بدایوں کے اساتذہ سخن، ادارہ مجلّہ بدایوں، کراچی، ۱۹۹۹ء

— غالب کے دو سکندر آبادی شاگرد (تفتہ اور بے صبر)، العلم (غالب نمبر)، کراچی، جنوری تا جون ۱۹۶۹ء

— تلامذہ غالب پر چند اشارے، مجلّہ بدایوں، کراچی، دسمبر ۱۹۹۹ء

استدراک

- شمس بدایونی

۱۔ بدایوں میں غالب کے مخالفین و مداحین	ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ	ستمبر ۲۰۰۵ء	
۲۔ غالب: تنقیدی مقالات کے تناظر میں	ماہنامہ شاعر، ممبئی	اپریل ۲۰۰۶ء	
بارِ دگر	جہان غالب دہلی، ج ۱/ش ۱	۲۰۰۶ء	
۳۔ خواجہ حسن نظامی اور غالب	غالب نامہ، دہلی	جولائی ۲۰۰۶ء	
بارِ دگر	منادی، دہلی	ستمبر ۲۰۰۶ء	
۴۔ عہد غالب کا بدایوں	فکر و تحقیق، دہلی	اکتوبر تا ستمبر ۲۰۰۷ء	
۵۔ دیوان غالب کا مشہور رامپوری نسخہ	مشمولہ غالب اور رامپور مرتب: شاہد ماہلی		
	غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی	۲۰۰۶ء	
۶۔ دیوان غالب کے نظامی ایڈیشن	ایوانِ اردو، دہلی	جنوری ۲۰۰۹ء	
۷۔ تحریک نظم جدید اور سلسلۂ غالب	فکر و تحقیق، دہلی	جولائی تا ستمبر ۲۰۱۰ء	

سپاس نامہ

بخدمت فیضیاب عالی جناب

ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی

راجیہ پال۔ اُتر پردیش

منجانب

اراکین صد سالہ جشن غالب کمیٹی

بدایوں

عکس سپاس نامہ

صد سالہ جشنِ غالب بدایوں

۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو غالب کا وصال ہوا تھا۔ فروری ۱۹۶۹ء میں ان کی وفات کو سنّو سال پورے ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء کے شروع ہوتے ہی غالب صدی تقریبات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مختلف علمی و ادبی اداروں، انجمنوں، اکیڈمیوں، یونیورسٹیوں نے سمینار منعقد کیے، رسائل و اخبارات نے نمبر شائع کیے۔ سرکاری و نیم سرکاری اداروں نے بھی غالب صدی تقریبات کا انعقاد کیا۔ علمی اداروں نے غالب کی تصانیف اور غالب پر تحقیقی وتنقیدی کتب شائع کیں۔ محکمہ ڈاک نے حکومت ہند کے ایما پر بیس پیسے کا ایک ڈاک ٹکٹ جاری کیا جس پر مرزا کی تصویر اور ان کی تحریر کا عکس تھا۔ فروری ۱۹۶۹ء ہی میں مرزا کے مزار کے متصل غالب اکیڈمی کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ ہند اور بیرون ہند غالب صدی تقریبات نے لکھنے پڑھنے والوں میں ایک نیا جوش اور امنگ پیدا کر دی تھی۔ اردو کی نسبت سے معروف علاقوں اور شہروں میں غالب صدی تقریبات کی ایک علیحدہ شان تھی۔

بدایوں جسے شمال ہند میں علمی و ادبی روایت کے سبب ایک خاص مقام حاصل ہے،

وہاں بھی غالب صدی تقریب شان و اہتمام کے ساتھ منعقد کی گئی۔ اس سلسلے میں بعض شرکائے محفل سے جو تفصیلات معلوم ہوئیں وہ سطور ذیل میں درج کی جارہی ہیں:

اوائل مارچ ۱۹۶۹ء میں ''صد سالہ جشن غالب کمیٹی'' تشکیل پائی، جس کے اراکین میں حسب ذیل افراد شامل تھے:

۱۔ سید رفیع الدین احمد سالکؔ رحمانی (ف ۱۹۷۹ء)، ضلع جج بدایوں۔ صدر مشاعرہ کمیٹی

۲۔ کنور اشرف علی خاں (ف ۱۹۸۶ء)، ڈپٹی کلکٹر بدایوں

۳۔ سید قمر احمد نقوی ایڈوکیٹ (ف ۱۹۹۲ء)، چیئرمین میونسپل بورڈ بدایوں

۴۔ پریم چند جوہری ایڈوکیٹ (ف ۱۹۹۵ء)، کنوینر مشاعرہ کمیٹی

۵۔ اور بھی چند نام ہوسکتے ہیں جن کا علم نہیں ہوسکا۔

کمیٹی نے ۱۴، ۱۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو دو روزہ پروگرام منعقد کرنا طے کیا۔ ۱۴ر مارچ بوقت سات بجے شب ٹاؤن ہال بدایوں میں اس وقت کے گورنر اتر پردیش ڈاکٹر بی گوپالا ریڈی نے تقریب کے پہلے اجلاس یعنی سیمینار کا افتتاح کیا۔ سالکؔ رحمانی نے ''اراکین صد سالہ جشن غالب کمیٹی'' کی جانب سے ڈیمائی سائز کے چار صفحات پر مشتمل ''سپاس نامہ'' (مطبوعہ دہلی ۱۹۶۹ء) پیش کیا۔ اس کی کاپیاں جلسے کے افتتاح پر تقسیم کی گئیں۔ افتتاح کے بعد مقالے پڑھے گئے، تقریریں ہوئیں۔ اور غالب کو منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا گیا۔ اس سمینار میں جن قلم کاروں نے حصہ لیا ان میں معروف ناقد پروفیسر احتشام حسین (ف ۱۹۷۲ء)، ڈاکٹر سیفی پریمی (ف ۱۹۹۵ء)، تہذیب احمد نقوی (ف ۱۹۹۲ء)، سید قمر احمد نقوی (ف ۱۹۹۲ء)، آفتاب احمد جوہر (ف ۱۹۸۱)، ایم آئی حسن (ف ۱۹۸۰ء)، ویریندر پرشاد سکسینہ وغیرہ کے نام معلوم ہوسکے۔

دوسرے دن یعنی ۱۵ر مارچ شب ساڑھے آٹھ بجے مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مقامی شعرا کے علاوہ بعض بیرونی شعرا مثلاً نشور واحدی، حفیظ میرٹھی، روشِ صدیقی، تسکین قریشی، جگر بریلوی، ابر احسنی، شہباز صدیقی، معین احسن جذبی وغیرہ نے بھی اپنا

کلام پیش کیا۔

راقم الحروف کو مذکورہ صدر سپاس نامہ کی عکسی کاپی فراہم ہوگئی۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سپاس نامہ کے بعض اقتباس نذر قارئین کر دیے جائیں:

"والا مرتبت

بدایوں اب ایک مسکین صورت شہر ہے، لیکن اس میں جلال بھی تھا اور جمال بھی، حسن بھی، اور زندگی بھی۔ ایک شیکسپیئر کو پیدا کر کے انگلستان کا ایک معمولی گاؤں اگر دوامی شہرت حاصل کرسکتا ہے تو بدایوں کو اس سے زیادہ شہرت کا حامل ہونا چاہیے... بدایوں بجا طور پر فخر کرسکتا ہے کہ اس کے ذرہ ذرہ میں علم وعرفان کے سمندر پنہاں ہیں...

عالی مرتبت! آج ہم غالب کا صد سالہ جشن منا رہے ہیں۔ غالب اس گنگا جمنی تہذیب کے پروردہ تھے جس کو اردو تہذیب بھی کہہ سکتے ہیں اور جو اسی پردیش میں پلی بڑھی اور جوان ہوئی...

عالی جناب! غالب جس دور میں پیدا ہوئے وہ انتہائی انتشار اور بدامنی کا دور تھا۔ مغلیہ عظمت ایک قصہ پارینہ تھی، ہر طرف ناآسودگی تھی ایک تہذیب مر رہی تھی دوسری تہذیب جنم لے رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ، نزع کی آخری ہچکی تھی۔ غالب کی بصیرت نے یہ بات پالی کہ مشرقی تہذیب اپنی اوہام پرستی، خود فریبی، عیش پسندی اور ناعاقبت اندیشی سے اتنی بوجھل ہوچکی ہے کہ اب اس میں کھڑے ہونے کی بھی تاب نہیں۔ انہوں نے جدید مغربی تہذیب کا خیر مقدم کیا کہ شمع وگل تا کے د پروانہ وبلبل تا چند، انہوں نے ابھرتے ہوئے سورج کو نشان راہ بنایا اور تیرہ شبی میں مژدہ صبح بھی سنایا

مژدہ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

لیکن پھر بھی وہ مشرقی تہذیب کے پروردہ تھے اور اس کے زوال سے ان کا دل کڑھتا تھا۔ان سے یہ کہے بغیر نہ رہا گیا:

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے“

☆☆☆

کتابیات

[BIBLIOGRAPHY]

۱۔ اٹھارہ ستاون کا تاریخی روزنامچہ، عبداللطیف رخلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۷۱

۲۔ اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد شعرا، امداد صابری، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۵۹ء

۳۔ احسن نانوتوی، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۶ء

۴۔ احوالِ غالب، ڈاکٹر مختار الدین احمد، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۵۳ء

۵۔ اختر شہنشاہی، سید محمد اشرف نقوی، مطبع اختر پریس، لکھنؤ، ۱۸۸۸ء

۶۔ ادبی خطوط غالب، مرزا محمد حسن عسکری، انوار المطابع لکھنؤ، ۱۹۳۸ء

۷۔ اردو ادب میں طنز و مزاح، ڈاکٹر وزیر آغا، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۹ء

۸۔ اردو کے اخبار نویس ج ر ۱، امداد صابری، صابر اکیڈمی، دہلی، ۱۹۷۳ء

۹۔ اردو مخطوطات، حامد اللہ ندوی، بمبئی، ۱۹۵۶ء

۱۰۔ اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء

۱۱۔ اردوے معلیٰ، اسد اللہ خاں غالب، مطبع مجیدی، کانپور، ۱۹۲۲ء

۱۲۔ از خاکِ بدایوں، شمس بدایونی، اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بدایوں، ۱۹۸۵ء

۱۳۔ اشاریہ غالب، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، مجلس یادگار غالب، لاہور، ۱۹۶۹

۱۴۔ اکمل التاریخ ج/۱۔۲، محمد یعقوب ضیاء القادری، مطبع قادری، بدایوں، ۱۹۱۵ء۔۱۹۱۶ء

۱۵۔ انتخاب زریں، سرراس مسعود، نظامی پریس، بدایوں (طبع سوم)، ۱۹۳۷ء

۱۶۔ انتخاب کلام زکی، شاداب زکی بدایونی، بریلی الیکٹرک پریس، بریلی، ۱۹۸۵ء

۱۷۔ انتخاب کلام نازش، محمد طیب بخش بدایونی، بریلی الیکٹرک پریس، بریلی، ۱۹۸۶ء

۱۸۔ انساب شیوخِ فرشوری، محمد رضی الدین بسملؔ، کاکس پریس، شاہ آباد، ۱۸۹۹ء

۱۹۔ آثار بدایوں، حافظ محمد فضل اکرم، وکٹوریہ پریس، بدایوں، ۱۹۱۵ء

۲۰۔ آثار الصنادید (سرسید)، مرتبہ خلیق انجم، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۰ء

۲۱۔ آل احمد سرور شخصیت اور ادبی خدمات، خلیق انجم، ماہنامہ کتاب نما، دہلی، ۱۹۹۲ء

۲۲۔ آئینہ دلدار، ابرار علی صدیقی، انجمن پریس، کراچی، ۱۹۵۶ء

۲۳۔ آئینہ مشاعرہ، سرور قادری، عزیزی پریس، آگرہ

۲۴۔ باغ دودر، غالب/وزیر الحسن عابدی، پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۸ء

۲۵۔ بدایوں ضلع کا ہست و بود، ضیا علی خاں اشرفی، بریلی الیکٹرک پریس، بریلی، ۱۹۸۷ء

۲۶۔ بدایوں قدیم و جدید، نظامی بدایونی، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۰ء

۲۷۔ بدایوں کے اساتذہِ سخن، ویریندر پرشاد سکسینہ، پرنٹنگ محل، کراچی، ۱۹۹۹ء

۲۸۔ بزم غالب، عبدالرؤف عروج، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۱۹۶۹ء

۲۹۔ پنج آہنگ میں مکاتیبِ غالب، کالی داس گپتا رضا، ول پبلی کیشنز، بمبئی، ۱۹۸۹ء

۳۰۔ تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ)، محمد حسن عسکری، نولکشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۰ء

۳۱۔ تاریخ بنی حمید (قلمی)، مفتی شرف علی حمیدی، مملوکہ تسلیم غوری، فارسی سالِ تصنیف، ۱۹۱۰ء

۳۲۔ تاریخ بنی حمید (اردو)، انشاء اللہ، امیر الاقبال پریس، بدایوں، ۱۹۱۶ء

۳۳۔ تاریخ فرشتہ ج/۱۔۲، قاسم/مترجم عبدالحئی، مکتبہ ملت، دیوبند، ۱۹۸۳ء

۳۴۔ تاریخی مقالات، پرفیسر خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۶ء

۳۵۔ تجلیات سخن، نظامی بدایونی، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۰ء

۳۶۔ تحقیقی مضامین، مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۴ء

۳۷۔ تذکرہ بہار بوستان شعرا، حافظ فضل اکرم فرشوری، مطبع صبح صادق، بدایوں، ۱۸۸۲ء

۳۸۔ تذکرۃ الشعرا (جزو اول)، حسرت موہانی، مطبع فیض عام، علی گڑھ، ۱۹۱۴ء

۳۹۔ تذکرہ شعرائے بدایوں ج ر ۱۔ ۲، سید شہید حسین شہید، طلحہ پرنٹرس، کراچی، ۱۹۸۷ء
۴۰۔ تذکرہ شعرائے ہندی، ڈاکٹر اکبر حیدری، نظامی پریس، لکھنؤ
۴۱۔ تذکرہ شمیم سخن، عبدالحیٔ صفاؔ بدایونی، مطبع امداد الہند و عین الاخبار، مراد آباد، ۱۸۸۴ء
۴۲۔ تذکرہ علمائے ہند، رحمان علی رمترجم ڈاکٹر محمد ایوب قادری، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۱ء
۴۳۔ تذکرہ الواصلین، مولوی رضی الدین بسمل، نظامی پریس، بدایوں (دوم)، ۱۹۴۵ء
۴۴۔ تذکرۂ ماہ و سال، مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۹۱ء
۴۵۔ تلاشِ غالب، نثار احمد فاروقی، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء
۴۶۔ تلامذہ غالب، مالک رام، مرکز تصنیف و تالیف، نکودر، ۱۹۵۷ء
۴۷۔ تلامذہ غالب، مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۴ء
۴۸۔ جواہر فریدی (ترجمہ اردو)، محمد علی اصغر فتحپوری، کریمی پریس، لاہور، سنہ ندارد
۴۹۔ جہانِ غالب، قاضی عبدالودود، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء
۵۰۔ چراغ دہلی، مرزا حیرت دہلوی، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۷ء
۵۱۔ حالی بحیثیت شاعر، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۶۰ء
۵۲۔ حقائق و بصائر، شمس بدایونی، بریلی الیکٹرک پریس، بریلی، ۱۹۸۶ء
۵۳۔ حیوٰۃ العلما، سید محمد عبدالباقی سہوانی، مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۲۲ء
۵۴۔ حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۹۰ء
۵۵۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء
۵۶۔ حیات مومن، ضمیر الدین احمد عرش گیاوی، تجلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء
۵۷۔ خزینۃ الانساب، سید نظر احمد افسوسؔ سہوانی، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۵۹ء
۵۸۔ خمخانہ جاوید۔ ۴ حصے، لالہ سری رام، نولکشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۰۸ء
۵۹۔ خمخانہ جاوید۔ لالہ سری رام، گلاب سنگھ پریس، لاہور، ۱۹۱۱ء
۶۰۔ خمخانہ جاوید۔ لالہ سری رام، دہلی پرنٹنگ ورکس، دلی، ۱۹۱۷ء
۶۱۔ خمخانہ جاوید۔ لالہ سری رام، ہمدرد پریس، دہلی، ۱۹۲۶ء
۶۲۔ خوش معرکہ زیبا، ج ر ۲، مرتبہ مشفق خواجہ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء
۶۳۔ داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری، آگرہ، ۱۹۴۱ء

۶۴۔ دلی اور طب یونانی، حکیم سید ظل الرحمٰن، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۵ء

۶۵۔ دلی کی یادگار ہستیاں، امداد صابری، جمال پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۷۲ء

۶۶۔ دید و دریافت، شمس بدایونی، روشن پبلی کیشنز، بدایوں،، ۱۹۸۱ء

۶۷۔ دیوان رسا، رام دیال رسا، مطبع قیصری، بریلی، ۱۸۹۰ء

۶۸۔ دیوان زکی، زکریا خاں زکی، مطبع رضوی، دہلی، ۱۸۹۵ء

۶۹۔ دیوان زلالی (قلمی)، انصار حسین زلالی، مملوکہ شمس بدایونی

۷۰۔ دیوان شرر، علی بخش خاں شرر، اسعد الاخبار، آگرہ، ۱۲۶۹/ ۱۸۵۳ء

۷۱۔ دیوان ظفر حصہ چہارم، بہادر شاہ ظفر، نولکشور پریس، لکھنؤ، سنہ ندارد

۷۲۔ دیوان غالب، چھ ایڈیشن، نظامی بدایونی، نظامی پریس، بدایوں ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۷ء

۷۳۔ دیوان غالب (نسخہ مالک رام)، مالک رام، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۷ء

۷۴۔ دیوان غالب (نسخہ عرشی)، امتیاز علی خاں عرشی، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۵۸ء

۷۵۔ دیوان غالب (نسخہ عرشی)، مولانا عرشی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۸۲ء

۷۶۔ دیوان غالب (نسخہ رضا)، کالیداس گپتا رضا، ساکار پبلشرز (بار سوم)، بمبئی ۱۹۹۵ء

۷۷۔ دیوان فدا، سید وحید اشرف و مالک رام، عثمانی پریس، مدراس، ۱۹۷۹ء

۷۸۔ دیوان کشفی، شاہ سلامت اللہ کشفی، مطبع شعلہ طور، کانپور، ۱۸۶۱ء

۷۹۔ ذکر غالب، مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۵۰ء

۸۰۔ رقعات مدہوش، سخاوت حسین مدہوش، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۶۳ء

۸۱۔ روداد اجلاس ششم ندوۃ العلما، محبوب المطابع، کانپور، ۱۸۹۹ء

۸۲۔ زبان داغ، رفیق مارہروی، نسیم بکڈپو، لکھنؤ، سنہ ندارد

۸۳۔ سحر سامری، دیبی پرشاد سحر، نولکشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۸۱ء

۸۴۔ سخنوران گجرات، سید ظہیر الدین مدنی، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۱ء

۸۵۔ سرسید کی تعلیمی تحریک، اختر الواسع، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۸۵ء

۸۶۔ سرل بھوگول ضلع بدایوں (ہندی)، ہری شنکر کشیپ، پرتبھا پبلی کیشنز، بدایوں، ۱۹۸۷ء

۸۷۔ سیر المنازل، ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۸۲ء

۸۸۔ سیف الجبار (عکسی ایڈیشن)، شاہ فضل رسول قادری، ادارہ مظہر حق، بدایوں، ۱۹۸۵ء

۸۹۔ شعرائے بدایوں دربار رسول میں، ڈاکٹر شمس بدایونی، ڈان پرنٹنگ پریس، کراچی بار دوم ۱۹۹۷ء

۹۰۔ شیخو سے شیخو پور تک، تسلیم غوری بدایونی، بریلی الیکٹرک پریس، بریلی، ۱۹۸۴ء

۹۱۔ طبقات الشعرا، شوق رنثار احمد فاروقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء

۹۲۔ طنزیات و مقالات، محمد محی الدین، مطبع انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۴ء

۹۳۔ عرض جوہر، مرتبہ افتخار بیگم صدیقی، جمال پریس، دہلی، ۱۹۸۷ء

۹۴۔ عود ہندی، مرزا غالب، مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۹۲۵

۹۵۔ غالب، غلام رسول مہر، علمی پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۴۴ء

۹۶۔ غالب احوال و آثار، حنیف نقوی، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۹۰ء

۹۷۔ غالب اور عصر غالب، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، غضنفر اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء

۹۸۔ غالب اور انقلاب ہندوستان، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۴ء

۹۹۔ غالبیات، عبدالقوی دسنوی، سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، ۱۹۶۹ء

۱۰۰۔ غالب ببلیوگرافی، ڈاکٹر محمد انصاراللہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (اول)، ۱۹۷۲ء

۱۰۱۔ غالبیات چند عنوانات، کالی داس گپتا رضا، وِل پبلی کیشنز، بمبئی، ۱۹۸۲ء

۱۰۲۔ غالب شخص اور شاعر، مجنوں گورکھپوری، علی گڑھ بک ڈپو، علی گڑھ، ۱۹۸۳ء

۱۰۳۔ غالب کی بعض تصانیف کے بارے میں، کالیداس گپتا رضا، ساکار پبلی کیشنز، بمبئی، ۱۹۹۰ء

۱۰۴۔ غالب کی نادر تحریریں، ڈاکٹر خلیق انجم، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۶۱ء

۱۰۵۔ غالب کے خطوط، ج ر ۱، ڈاکٹر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۹۳ء

غالب کے خطوط، ج ر ۲، ڈاکٹر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۸۵ء

غالب کے خطوط، ج ر ۳، ڈاکٹر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۸۷ء

غالب کے خطوط، ج ر ۴، ڈاکٹر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۹۳ء

غالب کے خطوط، ج ر ۵، ڈاکٹر خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۲۰۰۰ء

۱۰۶۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں ج ر ۲، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، معارف پریس، اعظم گڈھ، طبع سوم، ۱۹۸۸ء

غالب نامہ، شیخ محمد اکرام، تاج آفس بمبئی، سنہ ندارد

۱۰۷۔ فانی بدایونی، ساحل احمد، اردو رائٹرس گلڈ، الٰہ آباد، ۱۹۸۳ء

۱۰۸۔ فانی کی شاعری، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۹ء

۱۰۹۔ فریاد دہلی، نظامی بدایونی، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۱ء

۱۱۰۔ فغانِ دہلی، مرزا تفضّل حسین کوکب دہلوی، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۳ء

۱۱۱۔ فکرونظر (دیوان ظفر احمد صدیقی)، مرتبہ افتخار بیگم صدیقی، ایم اے آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، ۱۹۹۱ء

۱۱۲۔ فیضان غالب، عرش ملسیانی، غالب اکیڈمی، دہلی، ۱۹۷۷ء

۱۱۳۔ قاضی عبدالودود بحیثیت مرتب متن، گیان چند جین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۰ء

۱۱۴۔ قاموس المشاہیر ج ۱/۲، نظامی بدایونی، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۴ء۔۱۹۲۶ء

۱۱۵۔ کلمات ضابط (دیوان)، اصغر علی ضابط، وکٹوریہ پریس، بدایوں، ۱۸۹۲ء

۱۱۶۔ کلیات سالک، قربان علی بیگ سالکؔ، اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۸۰ء

۱۱۷۔ کلیات ضیاء (پروفیسر ضیاء احمد)، ظہیر احمد صدیقی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء

۱۱۸۔ کلیات مومن، مومن خاں مومن، رام نراین بنی مادھو، الہ آباد، ۱۹۷۱ء

۱۱۹۔ کنز التاریخ، محمد رضی الدین بسمل، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۰۷ء

۱۲۰۔ گلزار داغ، داغ دہلوی، نیر پریس، لکھنؤ، سنہ ندارد

۱۲۱۔ لمعات، مرتبہ پروفیسر ضیا احمد، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۴۷ء

۱۲۲۔ ماثر غالب، قاضی عبدالودود، ادارۂ تحقیقات اردو، پٹنہ، ۱۹۹۵ء

۱۲۳۔ ماثر غالب، مرتبہ حنیف نقوی، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۲۰۰۰ء

۱۲۴۔ مثنویات شوق، رشید حسین خاں، انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۹۸ء

۱۲۵۔ مرأۃ الخیال (دیوان)، عبدالحئی بیخود بدایونی، مطبع مستنصر پریس، دہلی، ۱۹۱۰ء

۱۲۶۔ مردان خدا، ضیا علی خاں اشرفی، بریلی الیکٹرک پریس، بریلی (طبع سوم)، ۱۹۹۰ء

۱۲۷۔ مزارات غالب و ذوق، شاہد ماہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۹۹ء

۱۲۸۔ ملہم التاریخ، اقتدار احمد ساحر سہوانی، مطبع العلوم، مرادآباد، ۱۹۱۲ء

۱۲۹۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی، پروفیسر محمد مسعود احمد، مکتبہ قادریہ، لاہور، ۱۹۷۸ء

۱۳۰۔ مومن خاں مومن شخصیت اور شاعری، اکرام بریلوی، ویلکم بک پورٹ، کراچی، ۲۰۰۳ء

۱۳۱۔ مومن شخصیت اور فن، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

۱۳۲۔ میخانۂ جامی، عرفان زیدی، ناظم برقی پریس، رامپور، ۱۹۷۰ء

۱۳۳۔ نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات، ڈاکٹر شمس بدایونی، نامی آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، ۱۹۹۵ء

۱۳۴۔ نقد بجنوری، ڈاکٹر حدیقہ بیگم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۱۹۸۴ء

۱۳۵۔ نقد واثر، ڈاکٹر شمس بدایونی، اردو بک ریویو، دہلی، ۲۰۰۴ء
۱۳۶۔ نقشِ معنی، ظفر احمد صدیقی، بھارت آفسیٹ، دہلی، ۲۰۰۱ء
۱۳۷۔ نکات غالب، نظامی بدایونی، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۵۷ء
۱۳۸۔ نواب فرید، سلطان حیدر جوش، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۱۷ء
۱۳۹۔ نئے اور پرانے چراغ، آل احمد سرور، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء
۱۴۰۔ واقعات دارالحکومت دہلی ج/۲، بشیر الدین احمد، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۵ء
۱۴۱۔ واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات کوکب قدر سجاد علی مرزا، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۹۵ء
۱۴۲۔ ہندوستانی مسلمان ج/۱، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۶ء
۱۴۳۔ یادگار غالب، خواجہ الطاف حسین حالی، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ۱۹۹۶ء

رسائل واخبارات

اردو ادب (سہ ماہی)، دہلی، شمارہ ۳۔ ۴، ۱۹۹۴ء
العلم (سہ ماہی)، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۵۹ء
العلم (غالب نمبر) (سہ ماہی)، کراچی، جنوری تا جون، ۱۹۶۹ء
العلم (سہ ماہی)، کراچی، اپریل تا جون ۱۹۷۱ء
آجکل (ماہنامہ)، دہلی، مارچ، ۱۹۵۸ء
آجکل (ماہنامہ)، دہلی، نومبر ۱۹۵۸ء
آجکل (ماہنامہ)، دہلی، فروری، ۲۰۰۳ء
پگڈنڈی، امرتسر، جنوری، ۱۹۶۱ء
تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، یکم ستمبر، ۱۹۸۲ء
ذوالقرنین (ہفتہ وار)، بدایوں، ۲۸ مارچ، ۱۹۱۰ء
ذوالقرنین (ہفتہ وار)، بدایوں، ۲۸/جون، ۱۹۱۱ء
ذوالقرنین (ہفتہ وار)، بدایوں، ۷/اگست، ۱۹۱۶ء
ذوالقرنین (ہفتہ وار)، بدایوں، ۱۴ ستمبر، ۱۹۱۶ء
ذوالقرنین (بدایوں نمبر)، بدایوں، اپریل ۱۹۵۶ء
رضا لائبریری جرنل، رامپور، شمارہ ۲، ۱۹۹۵ء

روشن (سہ ماہی)، بدایوں، جنوری تا مارچ، ۱۹۸۴ء
رہنمائے تعلیم (ماہنامہ)، دہلی، فروری ۱۹۸۲ء
زمانہ، کانپور، نومبر، ۱۹۳۷ء
غالب نامہ (ششماہی)، دہلی، جولائی، ۱۹۹۸ء
غالب نامہ (ششماہی)، دہلی، جنوری، ۲۰۰۳
قومی زبان (ماہنامہ)، کراچی، جنوری، ۱۹۸۳ء
گلدستۂ سخن (ماہنامہ)، آگرہ، اپریل، ۱۸۸۳ء
گلدستۂ سخن (ماہنامہ)، آگرہ، مئی، ۱۸۸۳ء
گلدستۂ سخن (ماہنامہ)، آگرہ، جولائی، ۱۸۸۳ء
مجلّہ بدایوں (ماہنامہ)، کراچی، اپریل، ۱۹۹۴ء
نقیب، بدایوں، مارچ، ۱۹۱۹ء
نگار (مومن نمبر)، لکھنؤ، جنوری، ۱۹۲۸ء
نیا دور (ماہنامہ)، لکھنؤ، مئی، ۱۹۷۵ء
ہماری زبان (ہفتہ وار)، دہلی، یکم اگست، ۱۹۷۷ء
ہماری زبان (ہفتہ وار)، دہلی، ۲۲ ستمبر، ۱۹۹۶ء

اشاریہ

ب

پ

ت

ن

و

ہ

ی

کتب و رسائل [اشاریہ]

ث

ج

ص

ط

ع

غ

رسائل

ق

ک

گ

م

ن

ہ

☆☆☆

مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں